شہاب الدین غوری

(عہدِ سلطان شہاب الدین غوری کی ولولہ انگیز کہانی)

رئیس احمد جعفری

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز
40۔الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

جملہ حقوق کتابت محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	شہاب الدین غوری
مصنف	:	رئیس احمد جعفری
ناشر	:	سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور
مطبع	:	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	:	دلدار حسین/عدیل حمید
پروف ریڈنگ	:	زاہد ملک
سن اشاعت	:	جون 2018ء
قیمت	:	-/600 روپے

بہترین کتاب چھپوانے کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔ 03009450911

......ملنے کے پتے......

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی	کتاب گھر * اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی * جناح سپر مارکیٹ F-7 مرکز، اسلام آباد
خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور	ویلکم بک پورٹ اُردو بازار، کراچی
بیکن بکس گلگشت کالونی، ملتان	رشید نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی
کشمیر بک ڈپو تلہ گنگ روڈ، چکوال	فرید پبلشرز اُردو بازار، کراچی

لاہور کتاب میلہ
کالج روڈ، ڈسکہ 03000700313

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اُس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اُس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے پوری طرح متفق ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ (ناشر)

ماضی کے ایک بدنام اور حال کے ایک سعادت مند
کمیونسٹ اخبار کے نام جو ایک مردِ دانشور سے سرفراز
ہونے کے بعد بھی اپنے لیل و نہار میں کوئی تبدیلی نہیں
کر سکا۔ سچ کہہ گیا ہے۔ اقبالؔ:

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جُو کا!

ابتدائیہ

یہ ایک تاریخی ناول ہے...... ان حضرات سے معذرت کے ساتھ جو اسلام اور تاریخ اسلام کے نام سے اس طرح بدکتے ہیں جیسے سگ گزیدہ پانی سے، جو نہ اسلام سے واقف ہیں نہ تاریخ اسلام سے۔

اس ناول میں اپنے دوسرے تاریخی ناولوں کی طرح میں نے اس کا التزام رکھا ہے کہ تاریخی واقعات میں نہ کوئی مبالغہ ہو، نہ کوئی غیر معتبر اور غیر مستند واقعہ بیان ہونے پائے۔ رومان کا جہاں تک تعلق ہے وہ ظاہر ہے ایک جداگانہ چیز ہے۔

اس ناول کو پرتھوی راج اور سنجوگتا کی مشہور کہانی پر میں نے نہیں قائم کیا ہے اس لیے کہ یہ کہانی تمام تر دروغ ہے جے چند اور پرتھوری راج سگے خالہ زاد بھائی تھے۔ سنجوگتا کسی طرح بھی ہندو مذہب کی رُو سے پرتھوی راج کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ نیز کسی ہندو یا مسلم مؤرخ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہی اس کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے صرف بھارت کے رزمیہ گیتوں میں اس واقعہ کا ذکر مزید اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت ہے۔

رئیس احمد جعفری

مجلس سے سختِ شہریاری تک

''.....کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یُوں بھی دیکھا ہے!''

(1)

جہاں سوز

غور کے پہاڑی علاقے پر ایک پٹھان قبیلہ شنسی حکمران تھا، لودھی، سوری، غوری درحقیقت ایک ہی قبیلہ کے مختلف خاندان ہیں۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ شنسب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کے زمانے میں مشرف بہ سلام ہوا تھا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کو اور بعد میں اس کے اخلاف واحفاد کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی عقیدت تھی چنانچہ جب عباسیوں اور علویوں نے مل کر بنوامیہ کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی تو یہ شنسی خاندان ابومسلم خراسانی کا زبردست معاون اور مددگار بن گیا۔ پھر بعد میں جب بنوعباس کے خلاف علویوں نے جوڑتوڑ شروع کیے تو یہ خاندان ان سرگرمیوں میں دل وجان سے شریک ہو گیا۔

اس خاندان کی یہ خوش اعتقادی دیکھ کر مسلمانوں کے ایک گمراہ بلکہ بے دین فرقہ قرامطہ نے جب خراستان اور افغانستان کو اپنی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا۔ تو بہت آسانی سے خاندان شنسی کو پہلے اپنا ہم نوا اور پھر آلۂ کار بنالیا۔ اور غور کا علاقہ قرامطہ کی سرگرمیوں، سازشوں اور تخریبی کاروائیوں کا گویا صدر مقام بن گیا۔

سلطان محمود غزنوی ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ قرامطہ کی اسلام کش ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھا اُس نے اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑنے اور اس تحریک کے زعمیوں اور قائدین کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں شنسی خاندان کے سردار محمد بن سوری سے اس کا زبردست

مقابلہ ہوا۔ لیکن یہ لڑائی صلح پر ختم ہوئی۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ شنسبی خاندان تخت غزنی کی بالادستی اور اطاعت قبول کرتا ہے۔ اور تخت غزنی اس کے عقائد و خیالات سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔

ایک عرصہ دراز تک یہ صلح قائم رہی۔ یہاں تک کہ محمود غزنوی اور محمد بن سوری کی ہڈیاں بھی خاک میں مل گئیں۔ لیکن غزنی میں اب تک محمود کا خاندان حکمران تھا اور غور کا مقابلہ بھی گو کئی ریاستوں میں منقسم تھا۔ لیکن بعد میں سوری ہی کی اولاد یہاں دارِ فرماں روائی دے رہی تھی۔

اتفاق کی بات علاؤالدین کا بھائی قطب الدین کسی بات پر بھائی سے روٹھ کر اور اپنی ریاست سے دست کش ہو کر بہرام شاہ کے پاس غزنی چلا گیا۔ بہرام شاہ نے پہلے تو اس کی خوب آؤ بھگت کی، لیکن بعد میں حاسدوں اور دراندازوں کے بہکاوے میں آ کر اس بے گناہ کو قتل کرا دیا۔ اس کا بھائی سیف الدین لڑا اُسے بھی بہرام شاہ نے قتل کر ڈالا۔ یہ خبر جب علاؤالدین کو معلوم ہوئی تو وہ ایک لشکرِ گراں لے کر مقابلے کو نکلا اور غزنی کے سامنے جا کر پڑاؤ کر دیا۔ علاؤالدین خود بھی نڈر، دلیر اور بہادر شخص تھا۔ اس کی قوم بھی جنگ جوئی میں ماہر اور سپہ گری میں لاجواب تھی، علاؤالدین نے اپنے مقتول بھائیوں کے انتقام پر کچھ اس طرح لوگوں کو ابھارا کہ وہ جان دینے اور لینے کے لیے تیار ہو گئے۔

بہرام شاہ کو اب غلطی کا احساس ہوا پہلے تو اس نے صلح و مفاہمت کی کوشش کی لیکن انتقام کی آگ پر صلح کی چھینٹوں نے تیل کا کام کیا۔ وہ آگ اور بھڑک اٹھی۔ آخر مجبور ہو کر بہرام شاہ نے بھی لڑائی کی تیاریاں کیں۔ غزنی کی فوج میں محمود غزنوی کے وقت سے راجہ، رائے اور رانا یعنی ہندو سردار چلے آ رہے تھے۔ اس نے ان سب کو اکٹھا کیا اور بڑا لشکر لے کر مقابلے پر تیار ہو گیا۔

لڑائی ہوئی اور زور و شور سے ہوئی، لیکن قسمت بہرام شاہ سے منہ موڑ چکی تھی۔ پہلے ہی ہلّے میں بہرام شاہ کا لختِ جگر دولت شاہ کام آیا، دولت شاہ نہ صرف تخت غزنی کا ولی عہد بلکہ سالار لشکر بھی تھا۔ اپنے سپہ سالار کو خاک و خون میں تڑپتے اور دم توڑتے دیکھ کر فوج ہمت ہار گئی۔ اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ بہرام شاہ کے لیے بھی یہ حادثہ حد درجہ دل گداز اور ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کی کمر ٹوٹ گئی، لیکن پھر بھی پیچھے ہٹ کر اس نے پھر ایک مرتبہ بکھرے ہوئے لشکر کو جمع کر دیا اور دشمن کو شکست دینے کی کوشش کی۔ غزنی کی دیواروں تلے گھمسان کا رن پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ہزار ہا آدمی کھیت رہے۔ علاؤالدین کا لشکر فیلِ بے زنجیر کی طرح بڑھ رہا تھا اور بہرام شاہ کی سپاہ بزدلوں اور نامردوں کی طرح راہ فرار اختیار کر رہی تھی۔ آخر بہرام

شاہ نے بھی اپنے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کی تقلید کی۔ اور خود بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ہندوستان کے کسی گوشے میں جا کر چھپ رہا۔

علاؤالدین ایک فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے غزنی میں داخل ہوا۔

یہ غزنی تھا!

وہی غزنی جو کبھی سلطان محمود غزنوی کے جاہ وجلال کا مرکز تھا۔ یہاں سے محمود کی فوجیں سیلِ رواں کی طرح نکلتی تھیں۔ اور نہ صرف آس پاس کے علاقوں کو بلکہ ہندوستان کے دور دراز تک کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔

یہی فوجیں تھیں جنہوں نے کبھی پشاور فتح کیا تھا۔ لاہور پر اپنا پرچم لہرایا تھا۔ ملتان کو زیرنگیں کیا تھا۔ اور خاندان قرامطہ کو تباہ و برباد کیا تھا۔ کالنجر، تھانیسر، نگرکوٹ (کانگڑہ) کو بڑی آسانی سے فتح کرلیا تھا۔ کشمیر پر اس کی فوجیں گئیں اور کامیاب وکامران واپس آئیں۔ دلی تک کو اُنہوں نے سرنگوں کرلیا۔ اور حد یہ ہے کہ دشوار گزار راستوں کو طے کرتی، دریاؤں کو پھلانگتی، پہاڑوں پر چڑھتی، جنگلوں سے گزرتی۔ ایک دشمن ملک، دشمن قوم، دشمن ماحول میں درّانہ گھستی سومنات تک ہر مخالف قوت کو کچلتی، راجگانِ ہند کی متحدہ یلغار کا مقابلہ کرتی، ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کا زور توڑتی پہنچ گئیں۔ اور وہاں جا کر محمود بت شکن نے وہ لازوال کارنامہ انجام دیا جو تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

وہی غزنی تھا!

غزنی کا وہی خاندانِ شاہی!

انہیں دلاوروں اور سورماؤں کی اولاد میں یہ سپاہی تھے، جو آج بہرام شاہ کے پرچم تلے لڑے مگر بھاگ کھڑے ہوئے!

زمانے کے انقلابات ایسے ہی ہوتے ہیں!

قومیں اسی طرح عروج حاصل کرتی اور زوال سے دوچار ہوتی ہیں۔

یہی تماشا غزنی کے اسٹیج پر آج پھر نظر آرہا تھا۔

جس غزنی میں کبھی محمود کا دربار لگتا تھا، جہاں اطراف واکنافِ عالم سے علماء، شعراء، ادباء اور ہنرمند جمع ہوتے تھے، جہاں مالِ غنیمت سے لدے ہوئے اونٹ اور چھکڑے دور دراز مقامات سے اکثر آیا کرتے تھے اور سیم وزر، لعل وگوہر، زروجواہر کے یہ انبار باشندگانِ غزنی میں

تقسیم ہوتے رہتے تھے، جہاں کے غریب بھی امیر تھے، آج......

آج وہی غزنی تھا!

جو سوگوار نظر آرہا تھا، جس کے درودیوار پر حسرت برس رہی تھی، جس کی گلیوں اور کوچوں میں خون بہہ رہا تھا، جس کے گھروں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا!

آج غزنی فاتح نہیں مفتوح تھا!

آج یہاں ایک نیا شخص فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، یہ سراپا قہر وجلال بنا ہوا تھا۔

علاؤالدین نے اپنے دو مظلوم اور مقتول بھائیوں کا انتقام لینے کے لیے غزنی کو فتح کیا تھا!

بہرام شاہ بھاگ گیا!

لیکن غزنی موجود تھا، اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا سکتی تھی، اس کی فلک رفعت عمارتوں کو مٹی کا ڈھیر بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے بلندو بالا، مضبوط و مستحکم قلعوں کو کھنڈر میں تبدیل کیا جا سکتا تھا!

اور غزنی کے وہ باشندے بھی موجود تھے جن پر بہرام شاہ حکومت کرتا تھا، جنہوں نے اپنے بادشاہ کی دراز دستیوں میں، ظلم اور سفاکی میں، حق شناسی اور درندگی میں پورا پورا حصہ لیا تھا......

اور...... گو بہرام کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، لیکن ابھی غزنی میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ ہری بھری کھیتیاں، لہلہاتے ہوئے چمن، عطر بیز ونکہت خیز گلزار، سبستان و کوشک۔ قصور و محلات...... ان سب کو ہدفِ انتقام بنایا جا سکتا تھا، ان سب سے انتقام لیا جا سکتا تھا، ان سب کو بہرام شاہ سمجھ کر مٹایا جا سکتا تھا!

علاؤالدین کو ہوسِ ملک گیری نہ تھی۔ توسیع مملکت کا جذبہ اسے کشاں کشاں یہاں تک نہیں لایا تھا۔ وہ صرف نشۂ انتقام سے مخمور ہو کر یہاں تک آیا تھا، اس نے بہرام شاہ کو شکست دے دی تھی لیکن اس سے انتقام نہ لے سکا تھا، مگر اور بھی بہت سے تھے جن کو وہ نشانۂ انتقام بنا سکتا تھا۔

فصیل شہر پر کھڑے ہو کر علاؤالدین نے اپنی سپاہ اور اہالیان شہر کے سامنے ایک زبردست تقریر کی۔ اس نے کہا:

وہ بھگوڑا جس کا نام بہرام شاہ تھا، بھاگ گیا۔

لیکن میں انتقام لوں گا!

غزنی کے در و دیوار میرے ہولناک انتقام سے نہ بچ سکیں گے!

غزنی کے قبرستانوں اور عالی شان مقبروں تک کو میرے انتقام کا مزا چکھنا پڑے گا!

غزنی کے یہ باشندے، جو سر جھکائے میرے سامنے کھڑے ہیں یا اپنے گھروں میں دبکے ہوئے بیٹھے ہیں، میرے انتقام کا وہ لرزہ خیز منظر دیکھیں گے جس کا تذکرہ انسان کی آنے والی نسلیں بھی سُن سُن کر لرزہ براندام ہو جایا کریں گی۔

میں غور سے جب چلا تھا تو رحم و کرم، شفقت و مرحمت اور عنایت و ہمدردی کے جذبات وہیں تہہ کر کے رکھ آیا تھا!

میرے جلو میں جو چیزیں آئی ہیں ظلم، شقاوت، سنگ دلی، سفاکی، بے دردی، بے رحمی اور آج یہ سب چیزیں اپنا کمال دکھائے بغیر نہ رہیں گی۔

پھر وہ اپنے سپاہیوں اور تیغ زنوں سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا!

ہاں میرے جاں نثارو! شکار تمہارے سامنے موجود ہے، تمہارے ترکش تیروں سے بھرے ہوئے ہیں، تمہاری نیام میں شمشیر آبدار تڑپ رہی ہے۔ تمہارے نیزے سینوں میں گھسنے کے لئے بیتاب ہیں۔ تمہارے خنجر لہو چاٹنے کے لئے بے کل ہو رہے ہیں۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنے نیزوں کو کام میں لاؤ۔ اپنی تلواروں کی مراد پوری کرو۔ اپنے نیزوں کو خون کی لذت سے محروم نہ رکھو، اپنے خنجروں کو اس ظالم اور بھگوڑے بادشاہ کی رعایا کا خون چٹاؤ!

چلو، بڑھو!

ہاں دیکھو خبردار اور غزنی کی کوئی عمارت سلامت نہ رہ جائے۔ خبردار غزنی کا کوئی عمل سلامت نہ دکھائی دے۔ خبردار! یہاں کا کوئی باشندہ ایسا نہ ہو جس پر میری نظر پڑے، اور مقتول یا مجروح نظر نہ آئے۔ خبردار! یہاں کے کھیتوں کو بھی نہ بخشنا، ان میں آگ لگا دو، مکانوں کو نذر آتش کر دو۔ جو سامنے آئے اسے بے محابہ قتل کر دو بلکہ...... بلکہ میں کہتا ہوں یہاں کے قبرستانوں اور مقبروں تک کو کھود ڈالو، ان میں سے جو ہڈیاں برآمد ہوں، جو لاشیں نکلیں انہیں بھی لپکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دو۔

لیکن ٹھہرو!

محمود اور اس کے بیٹوں کی قبروں کو ہاتھ مت لگانا!

یہ حکم دے کر علاؤ الدین اپنے خیمے میں چلا گیا، اور وہاں جا کر عیش و سرور میں کھو گیا۔

کامل سات روز تک وہ خیمے سے باہر نہیں نکلا۔

کامل سات روز تک اس کی فوج وہ سب کچھ کرتی رہی جس کا اس نے حکم دیا تھا۔

آٹھویں روز علاؤ الدین اپنے خیمۂ زرنگار سے باہر نکلا، اس نے تباہ و برباد غزنی پر ایک نظر ڈالی، یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ فوج نے اس کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ہے، پھر اپنے مظلوم و مقتول بھائیوں کی لاشیں نکلوائیں اور غور روانہ ہو گیا۔

علاؤ الدین جب غزنی سے چلا گیا تو یہاں کے باشندوں نے اسے ''علاؤ الدین جہاں سوز'' کا خطاب مرحمت فرمایا۔

جب علاؤ الدین غور پہنچ گیا تو بہرام شاہ پھر اپنے خستہ و درماندہ ساتھیوں کے ساتھ غزنی واپس آیا لیکن اب یہاں خاک کے ڈھیر کے سوا تھا کیا؟

اس غم نے چند روز کے اندر اسے ہلاک کر دیا۔

(2)

المناک حادثہ

جہاں سوز کے دو یتیم بھتیجے تھے۔ شمس الدین اور شہاب الدین، صورت و سیرت، اخلاق و کردار، شجاعت و دلیری، نیکی اور نیک خوئی کے اعتبار سے یکتا اور بے مثل، لیکن جہاں سوز ان سے خفا تھا، اُس نے دونوں کو اسیر زندان کر رکھا تھا۔

جہاں سوز نہایت بہادر لیکن نہایت سادہ شخص تھا۔ اس نے حُبِ اہل بیت کے جوش میں حسن بن صباح کی باطنی تحریک کا نہایت اخلاص کے ساتھ آلۂ کار بننا منظور کر لیا تھا، لیکن شمس الدین اور خاص طور پر شہاب الدین باطنی تحریک کے مفاسد سے واقف تھے، وہ جانتے تھے یہ جماعت تخریب پسندوں کی ہے۔ یہ دراصل ملحد ہیں۔ لیکن مذہب کا لبادہ اوڑھ عوام کے سامنے آتے ہیں۔ اور انہیں ورغلا کر فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کئی مرتبہ ادب و احترام کے ساتھ چچا کو باطنی تحریک کے مفاسد سے آگاہ کیا۔ اور اس خطرۂ عظیم سے خبردار کیا جو فدائیوں کی صورت میں سارے عالم اسلام پر منڈلا رہا تھا۔ لیکن جہاں سوز نے نہ صرف ان کی بات پر کان نہ دھرا بلکہ الٹا انہیں ڈانٹا ڈپٹا۔ اور تاکید کی کہ اپنے ''ملحدانہ'' عقائد سے توبہ کر لیں۔ دونوں بھائیوں نے چچا کا یہ رنگ دیکھا تو خاموش رہے۔

لیکن جہاں سوز کے دربار میں اونچے اونچے مناصب پر کئی باطنی فائز تھے۔ انہیں جو شمس الدین اور شہاب الدین کا یہ رجحان معلوم ہوا تو وہ ان دونوں بھائیوں کے درپے آزار ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ خواص اور عوام پر ان کا کتنا گہرا اثر ہے، اپنی خوش اخلاقی اور خوش اطواری سے تمام غوریوں کا انہوں نے دل موہ لیا ہے۔ اگر یہ آزاد رہے تو نہ صرف باطنی تحریک پھل پھول نہیں سکے گی بلکہ ممکن ہے کوئی وقت ایسا بھی آئے کہ جہاں سوز ہاتھ سے نکل جائے۔ آدمی آخر سادہ لوح ہے، بھتیجوں کی چرب زبانی سے متاثر ہونا کسی طرح بھی ناممکن نہیں۔ اور اگر جہان سوز ہاتھ سے نکل گیا تو یہ محفوظ ترین مقام جو باطنی تحریک کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اور جو اتنا ناقابل تسخیر ہے کہ محمود غزنوی جیسا یکہ تاز، اولوالعزم اور جہاں کشا بھی اسے فتح کرنے میں ناکام رہا۔ اور صلح پر مجبور

ہو گیا تھا۔ باطنیوں سے خالی ہو جائے گا۔ اور اس طرح افغانستان خراسان اور دوسرے مقامات پر بھی اثر پڑے گا۔

چنانچہ یہ سوچ کر انہوں نے جہاں سوز کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ وہ اپنے بھتیجوں سے بدظن ہو گیا، اور انہیں ایک قلعہ میں نظر بند کر کے ان کا روزینہ مقرر کر دیا۔

دربار کے باطنی حاشیہ نشینوں کو اپنی اس کامیابی پر بہت خوشی ہوئی، انہوں نے خیال کیا کہ راستے کا ایک بہت بڑا پتھر اس طرح ہٹ گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حسن بن صباح کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کا جانشین محمد بن کیا بزرگ امید الموت کا فرمارواسے مطلق بنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے کئی داعی جہاں سوز کے پاس بھیجے، جنہیں اس نے غور کے اطراف واکناف میں ''تبلیغ دین حق'' کے لئے منتشر کر دیا [1]

۵۵۱ھ میں جہاں سوز کا انتقال ہو گیا۔

جہاں سوز کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے چچازاد بھائیوں شمس الدین اور شہاب الدین کا پروانہ رہائی صادر کیا۔

سیف الدین کے خیالات وعقائد بھی وہی تھے جو شمس الدین اور شہاب الدین کے تھے۔ کیونکہ تینوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ اور سیف الدین ان دونوں بھائیوں کی ذہانت و فراست سے بہت متاثر تھا۔ اس نے شہاب الدین کے مشورے سے پہلا کام یہ کیا کہ دارالسلطنت فیروز کوہ میں ان تمام داعیوں اور مبلغوں کو طلب کیا۔ جو اطراف غور میں باطنی تحریک کا پرچار کر رہے اور مسلمانوں کو بے دین بنا رہے تھے۔ اور جب سب لوگ فیروزہ کوہ میں اِدھر اُدھر سے آ کر حسب طلب جمع ہو گئے۔ تو سیف الدین نے ان سب کو ایک مقام پر طللب کیا۔ اور سب کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ [2] اور مطمئن ہو گیا کہ اب اس کی سلطنت ہر قسم کے خس و خاشاک سے پاک ہو گئی ہے۔ اب وہ نہایت اطمینان کے ساتھ بے غل وغش دادِ فرماں روائی دینے لگا۔ شمس الدین اور شہاب الدین اس کے دست و باز و تھے۔ اسی اثناء میں ترکان غز نے غور کے علاقے پر تاخت وتاراج کا سلسلہ شروع کیا۔ سیف الدین نے فوراً لشکر جمع کیا۔ شمس الدین کو

---

[1] ''و بہ آخر عمر رسل ملاحدۂ الموت بہ نزدیک صلاء الدین اعزاز کردہ بہ ہر جا از مواضع غور در سر دعوت کردند۔''

[2] وآں رسل ما کہ از ملاحدۂ الموت آمدہ بودند باز طلب فرمودہ جملہ فرمان دار تا زیر تیغ آوردند دوزخ فرستاد۔'' مبناج سراج

اپنا نائب بنا کر فراز کوہ میں چھوڑا۔ شہاب الدین کو سامانِ جنگ کی فراہمی اور تازہ دم سپاہیوں کی بھرتی پر مامور کیا۔ اور خود اپنا لشکر لے کر مقابلے کے لئے چڑھ دوڑا اور بارمرو کے قریب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ترک پیچھے ہٹ رہے تھے اور سلطان سیف الدین آگے بڑھ رہا تھا۔ قریب تھا کہ دشمن شکست کھا کر رو بہ فرار اور غوریوں کا لشکر عروسِ کامیابی سے ہم کنار ہو کہ یکا یک ابو العباس شیث سپہ سالار عسا کر غور گھوڑا دوڑاتا ہوا سلطان کے پاس آیا۔ اور قبل اس کے کہ سلطان یا کوئی دوسرا آدمی اس کے ارادہ کو بھانپ سکے اس نے تلوار کا تُلا ہوا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ سلطان کی گردن کٹ کر زمین پر گری اور لڑھکنے لگی۔

سلطان کا لاشہ بے جان دیکھنا تھا کہ لشکرِ غور میں بھگدڑ مچ گئی، اور جو لشکر فتح کی منزل تک پہنچ چکا تھا بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ اور جو بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا وہ تلواریں کھینچ کر ٹوٹ پڑا۔

غور کا لشکر شکست لا کر بھاگا۔ لیکن سلطان سیف الدین کے چند جاں نثاروں نے اپنی جان پر کھیل کر ابو العباس کو گرفتار کر لیا اور جس طرح بھی ہوا اُسے لے کر فروزکوہ پہنچے کہ محض اس شخص کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی ہر گئی۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ ابو العباس جو سلطان کا اتنا وفادار، جاں نثار اور فدا کار تھا بغیر کسی وجہ اور سبب کے اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پر کیوں آمادہ ہو گیا؟

اور خود ابو العباس کا یہ حال تھا کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے ہوئے تھا۔ ہر سوال کے جواب میں خاموشی، لاکھ لاکھ ان گرفتار کرنے والوں نے سر پٹکا، مگر اس نے جو خاموشی اختیار کی تو فیروزکوہ تک ایک لفظ بھی اپنے مُنہ نہیں نکالا۔

(3)
قاتل کا قتل

سلطان سیف الدین کی وفات کے بعد رعایا نے متفقہ طور پر شمس الدین کو بادشاہ بنالیا۔ اور وہ غیاث الدین کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہو گیا۔ غزنی کا تخت شہاب الدین کا انتظار کر رہا تھا۔ غزنی پر ترکان غز قابض تھے، ایک ہی ہلے میں شہاب الدین نے انہیں نکال باہر کیا۔ اور تخت غزنی پر قابض ہو گیا۔ دونوں بھائی گو الگ الگ حکومتوں کے آزاد اور خود مختار فرماں روا تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت تھی، کوئی کام ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر انجام نہیں دیتے تھے۔

شہاب الدین کی رسم تاجپوشی ادا کرنے کے لئے غیاث الدین بہ نفس نفیس غزنی پہنچا، بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ یہ رسم انجام پائی۔ جہاں سوز نے اس شہر کی اینٹ سے بجادی تھی۔ لیکن بہرام شاہ نے دوبارہ واپس آ کر اس ملبے سے ایک دوسرا شہر تعمیر کیا تھا۔ پھر جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا، اور ترکانِ غز نے غزنی پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس شہر کو ایک خوشنما اور شاندار شہر بنانے میں دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور اس میں شہاب الدین کے آنے کے بعد تو نئی بہار آ گئی تھی۔ اس اُجڑے ہوئے چمن میں شہاب الدین نے تخت غزنی پر بیٹھتے ہی یہ عہد کر لیا تھا کہ میں بھی ایسے ہی کارنامے انجام دوں گا جو محمود غزنوی نے دیے تھے۔

کئی روز تک جشنِ طرب کا سلسلہ جاری رہا، غور اور غزنوی کے باشندے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ ان میں فرق کرنا مشکل تھا۔

تخت نشینی کی رسم انجام دینے کے بعد غیاث الدین واپس جانے لگا، تو اس نے شہاب الدین سے کہا:

''ابوالعباس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟...... کیا سلوک کرنا چاہیے ہمیں اس سے؟''

شہاب الدین نے جواب دیا۔

''یوں تو آپ مالک و مختار ہیں لیکن میری رائے یہ ہے کہ اسے فوراً قتل کرا دینا چاہیے۔

ایک تو اس لئے کہ وہ ہمارے محسن بھائی کا قاتل ہے، دوسرے اس لئے کہ اس کے بارے میں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ وہ درحقیقت الموت سے اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا۔ اور اس کے اشارے پر اس نے سیف الدین کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے!''

غیاث الدین نے بھائی کی باتیں غور اور توجہ سے سنیں، پھر کہا۔

''میری بھی یہی رائے ہے۔''

شہاب الدین نے عرض کیا:

''تو پھر کل سرِ دربار اُس کے قتل کا حکم صادر فرمایئے، پھر فیروزکوہ تشریف لے جایئے۔''

غیاث الدین نے یہ تجویز قبول کر لی، دوسرے دن جب دربار منعقد ہوا، تو شہاب الدین نے بڑے بھائی کو مسندِ شاہی پر بٹھایا، اور خود اس کے پہلو میں بیٹھا۔ پھر ابو العباس کو طلب کیا گیا، غیاث الدین نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم پر کئی جرم ثابت ہو چکے ہیں۔ تم نے اپنے آقا، میرے بڑے بھائی اور تختِ غور کے وارث سیف الدین کو قتل کیا، تم نے عین اس وقت جب غوری لشکر کامیاب ہو رہا تھا اپنی اس حرکت سے اسے شکست دلائی۔ تم سلطنت غور کے نمکخوار تھے، لیکن تم نے اپنے باطنی سردار کے اشارے نمک حرامی کی تم اس تحریک کے سربراہ ہو جو مسلمانوں کو دین سے بیزار کرتی ہے۔ ان میں الحاد پیدا کرتی ہے، تم اپنے آقا کے، اپنے ملک کے، اپنی قوم کے، اپنے مذہب کے اور انسانیت کے غدار ہو، لہٰذا تمہیں سزائے موت دی جاتی ہے۔

ابو العباس اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ یکایک شہاب الدین کا اشارہ پا کر تیغہ تولتا ہوا جلاد نکلا اور اس نے ایک ہی وار میں ابو العباس کا سر قلم کر دیا۔

اس واقعے نے باطنی تحریک کو غور اور غزنی کے علاقے میں بڑی حد تک ختم کر دیا۔

زخمِ دل

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

(1)

ماں بیٹی

سورج اپنی چمک دمک دکھا کر گوشۂ مغرب میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔ روشنی پر تاریکی غالب آ چکی تھی۔ دولت مندوں اور امیروں کے گھروں میں مومی شمعیں جل رہی تھیں۔ جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے۔ ان کے گھر بقیۂ نور بنے ہوئے تھے۔ جو مفلس اور تنگ دست تھے، ان کے ہاں یا اندھیرا تھا یا چراغ ٹمٹمار ہے تھے۔

غزنی کی عام آبادی سے دور ایک کھنڈر میں، جو اب تک جہاں سوز کے قہر و جلال کی یادگار بنا ہوا تھا، دو عورتیں رہتی تھیں، ایک بوڑھی دوسری جوان، بوڑھی عورت کے چہرے بشرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی اچھے دن دیکھ چکی ہے، لیکن اس کی قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، جوان عورت پری پیکر اور قمر طلعت تھی، حسن پھٹا پڑتا تھا۔ لیکن پھٹے پرانے اور میلے کپڑوں میں ملبوس، لیکن اس پھٹے پرانے اور میلے کپڑوں میں بھی اس کا حسن اسی طرح جھلک رہا تھا جیسے بادل کی اوٹ سے چاند جھانکتا ہے۔

بوڑھی عورت نے جوان عورت سے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔

''آج وہ آخری زیور بھی بیچ آئی جو تیرے باپ کی یادگار میرے پاس رہ گیا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اُسے دو ہزار میں خریدا تھا، لیکن بڑی مشکل سے پانچسو میں بک سکا۔ سوچتی ہوں جب یہ روپے بھی ختم ہو جائیں گے تب کیا ہوگا! نہ میرے بدن پر لتا ہے، نہ تیرے جسم

پر کپڑے ہیں، گھر میں کھانے پینے کا سامان بھی ختم ہو چکا ہے۔ ان سب چیزوں کا انتظام کرنے کے بعد میں نے حساب لگایا ہے جو یہ روپے بچیں گے وہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے تک کام دیں گے، پھر اس کے بعد کیا ہوگا! یہ سوچ کر دل لرزنے لگتا ہے۔

جوان عورت نے دل دہی کے لہجے میں کہا۔

''اماں جان آپ پریشان نہ ہوں، خدا پر بھروسہ رکھیں۔ بے شک یہ آخری زیور تھا جو آپ نے فروخت کیا۔ لیکن میرے پاس بھی تو کچھ زیورات پڑے ہیں وہ کس کام کے اگر زندگی بچانے میں مدد نہ دے سکے۔''

بوڑھی عورت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گویا ہوئی۔

''میری بچی، میری بیٹی، میری جان! ایسا نہ کہو، خدا تجھے برتنا نصیب کرے وہ تیرے جہیز کے زیور ہیں، مر جاؤں مگر ان میں ہاتھ نہ لگاؤں گی؟''

نو جوان عورت کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اس نے کہا۔

''دیکھ رہی ہو، زمانہ ہمارا مخالف ہے، قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا، جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے، جن پر ہمارے احسانات تھے وہ ہمیں دیکھ کر آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ پھر بھی امید کا ساتھ نہیں چھوڑتی، اب بھی آس ہے کہ ہماری زندگی میں انقلاب آئے گا۔ ہمارے حالات بہتر ہوں گے، اور ہم ایک مرتبہ پھر سکھ، چین، عافیت اور عیش کی زندگی بسر کریں گے!''

نہیں اماں، میری اماں، ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔

کیا نہ سوچا کروں بیٹی!

وہ بولی۔

''خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دو، آس اور امید سے لو نہ لگاؤ، قسمت پر شاکر ہو جاؤ۔ ہم جس تباہی سے دوچار ہوئے ہیں وہ اب زندگی بھر ہماری رفیق رہے گی، قسمت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، اس پر ہمیں قانع ہو جانا چاہیے۔ مان لینا چاہئے اسے، دُنیا ہم سے نفرت کرتی ہے، یہاں کے لوگ ہماری صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس دنیا میں، اس شہر میں، ہم پھر سے زندگی سنوار سکیں، نہیں اماں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

بوڑھی عورت کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، وہ رونے لگی، اُس نے پھرُرکی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا کے لئے ماہ ایسی باتیں نہ کرو ورنہ میں بے موت مرجاؤں گی، میرے لیے اب زندگی میں کوئی کشش نہیں ہے۔ میرا بہترین علاج موت ہی ہے، لیکن میں ابھی نہیں مرنا چاہتی۔ تیرے لئے، فقط تیرے لئے، جب تک تیرا گھر آباد نہ کرلوں، جب تک تیرے ہاتھ پیلے نہ کرلوں اس وقت تک میں نہیں مرسکتی نہ ہی مرنا چاہتی ہوں۔ اگر موت آ ہی گئی تو قبر میں بھی میری پیٹھ نہیں لگ سکے گی۔ تو نے اپنی زندگی کی صرف ۱۸ بہاریں دیکھی ہیں۔ تیری زندگی کا گویا اب آغاز ہوا ہے۔ تجھے زندہ رہنا ہے خوش رہنا ہے۔ راج رجنا ہے، میرا کیا ہے میں تو اپنی زندگی پوری کرچکی ہوں۔''

ماہ نے جواب دیا۔

''تمہاری خاطر چُپ ہوئی جاتی ہوں۔ اگر تم ان امیدوں میں خوش ہو تو میں تمہاری خوشی کیوں چھینوں!......لیکن......''

ماں نے بیقرار ہوکر پوچھا۔

''لیکن کیا میری بچی! تو کیا کہنا چاہتی ہے؟''

ماہ نے جواب میں کہا۔

''کچھ نہیں......کچھ نہیں!''

اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی، اس بات نے ماہ کو اور زیادہ بیکل کردیا۔ اس نے التجا کے لہجے میں کہا۔

''خدا کے لئے ماں میری جان کی گاہک نہ بن۔''

ماہ نے پھرُرکی ہوئی آواز میں کہا!

''اماں جان میں تو اب کچھ نہیں کہتی، خاموش ہوں۔''

ماں نے اور زیادہ بے قرار ہوکر کہا!

''نہیں ابھی تو کچھ کہہ رہی تھی، بتا کیا کہہ رہی تھی۔''

وہ ایک آہِ سرد کے ساتھ گویا ہوئی!

''شاید تمہیں دُکھ ہو!''

ماں نے شفقت اور پیار کے لہجے میں کہا!

''نہیں ماہ، مجھے ذرا بھی دُکھ نہیں ہوگا، بھلا تیری باتیں مجھے دُکھ پہنچا سکتی ہیں۔''

ماہ نے کچھ تامل کے بعد کہا۔

''سوچتی ہوں کہ ہم زندگی کے جس دور سے گزر رہے ہیں، اس کے مستحق بھی تھے، بلکہ شاید اس سے زیادہ کے سزاوار تھے، لیکن خدا رحیم ہے، اس نے صرف اتنی ہی سزا دی۔''

ماں نے سراپا اضطراب بن کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ہاں بیٹی تو سچ کہتی ہے۔ واقعی ہم اس کے مستحق تھے، اس سے بھی زیادہ کے سزاوار تھے..... لیکن سوال یہ ہے کہ گناہگار کی سزا بے گناہ کو کیوں ملے؟..... کیا تو نے بھی کوئی جرم کیا تھا! کیا مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی تھی؟ پھر یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟''

ماہ نے ماں کی باتیں غور سے سنیں، پھر گویا ہوئی۔

''اماں! یہ سچ ہے کہ تم نے کوئی خطا نہیں کی، مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا، لیکن گنہگار کا ساتھ دینے والا بھی سزا پاتا ہے، خطا کار کی رفاقت کرنے والا بھی عقوبت سے نہیں بچتا، یہی ہمارے ساتھ ہوا ہے!''

ماں لاجواب نظر آنے لگی، پھر اس نے کہا۔

''بیٹی! جو کچھ تو نے کہا سچ ہی ہے، لیکن میرا خدا صرف منتقم ہی نہیں ہے، وہ رحمان و رحیم بھی ہے، وہ اگر سزا دیتا ہے تو انعام بھی دیتا ہے۔ وہ اگر مارتا ہے تو جلاتا بھی ہے۔ وہ بیماری دیتا ہے تو صحت بھی عطا کرتا ہے۔ وہ موت دیتا ہے تو زندگی بھی بخشتا ہے۔ وہ گنہگاروں کے عیب چھپاتا ہے، وہ خطا کاروں کو معاف کرتا ہے، وہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں، اس کے پاس رحم و کرم کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ اس خزانہ سے مجھے میرا اور تجھے تیرا صلہ ضرور ملے گا۔

''آمین!'' ماہ نے کہا اور چراغ کی بتی ٹمٹماتے بجھنے کے قریب ہو گئی تھی ذرا اونچی کر کے پھر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی!

(2)

زخمی

تھوڑی دیر تک ماں بیٹی پاس پاس، لیکن بالکل خاموش بیٹھی رہیں، پھر ماں نے کہا۔

''اب رات ہوتی جا رہی ہے، جو کچھ روکھا پھیکا موجود ہے وہ کھا کر خدا کا شکر کرو، اور نماز پڑھ کر سو رہو۔''

ماہ نے بے پرواہی کے ساتھ کہا۔

''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے!''

لیکن ماں نے اس انکار کی پرواہ نہ کی، وہ جلدی سے اٹھی اور کھانا نکال لائی، پھر ماں بیٹی دونوں نکال کر کھانے لگیں۔

کھانا ختم ہی ہوا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا ہے۔ ماہ سہم گئی اور ماں سے بالکل مل کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔

''اماں! یہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز کیسی آ رہی ہے؟

ماں نے بیٹی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا:

''خواہ مخواہ ڈری جاتی ہو، کوئی سپاہی یا سرکاری ہرکارہ ہوگا، اور کون ہوسکتا ہے!''

لیکن ماہ کی اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی، اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''اگر ڈاکو ہوئے تو؟''

ماں ہنسنے لگی۔

''پگلی کہیں کی...... ! ڈاکو اس کھنڈر میں آ کر دو دکھیاری عورتوں سے کیا لیں گے؟''

ماہ نے اعتراض کیا۔

''آج ہی تو اپنا زیور بیچ کر آئی ہو، میرے زیور بھی ہیں، کیا یہ مال غنیمت وہ چھوڑ دیں گے؟''

ماں نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا!

''تو فکر نہ کر، روپیہ اور زیور ایسی جگہ رکھا ہے جہاں پرندہ پَر بھی نہیں مار سکتا!''

اتنے میں گھوڑے کے ٹاپوؤں کی آواز قریب سے قریب تر ہوگئی، ماہ نے ماں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''وہ سوار اسی طرف آرہا ہے اماں!''

ماں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''فکر نہ کر، اگر ایک ہے تو میں اس سے نپٹ لوں گی، دو ہیں تو ہم دونوں کافی ہیں، تو بھی تلوار چلانا جانتی ہے اور میں بھی۔ اور اگر دو سے بھی زیادہ ہوئے تو بھی وہ ہماری لاشوں ہی پر قبضہ کرسکیں گے۔''

ماہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور بولی۔

''تم تو بڑی بہادر ہو، میں تو اپنی طرح سمجھتی تھی تمہیں بھی!''

ماں نے اُسے کلیجے سے لگالیا اور بولی:

''تو بھی بہادر ہے، وقت آنے پر ہی بہادری کا جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ ایک بہادر باپ اور بہادر ماں کی بیٹی بزدل کیسے ہوسکتی ہے!''

ان باتوں سے ماہ کا دل تھما، اور اس نے کچھ سکون سا محسوس کیا، یکا یک کھنڈر کے بالکل سامنے دھما کا سا ہوا، اور کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی، لیکن گھوڑا اسی طرح سرپٹ بھاگتا ہوا نکل گیا۔ وہ کافی دور نکل گیا تھا۔ اور اب ٹاپوؤں کی آواز مدھم ہوتی چلی جارہی تھی۔ ماہ نے ماں سے پوچھا۔

''یہ کیا چیز گرا گیا ہے وہ سوار؟''

ماں نے بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ کہا!

''ہوگا کچھ، ہمیں کیا؟''

سوار کے چلے جانے کے بعد فضا پھر سنسان ہوگئی تھی، اور ماہ کی وحشت بھی رخصت ہوگئی تھی۔ لہٰذا اس کا جذبہ جستجو بھڑکنے لگا۔ اس نے کہا۔

''ضرور کوئی خاص بات ہے؟''

ماں بولی:

''ہوگی، تو فکر کیوں کر رہی ہے جاسورہ!''

ماہ نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، ذرا دیکھیں تو سہی کیا ہے؟''

ماں نے بیٹی کی بات ماننے سے انکار کردیا۔

''میرا تو دماغ خراب نہیں ہے تمہاری طرح؟''

ماہ نے بچوں کی طرح اٹھلاتے ہوئے کہا:

''ہماری اماں نہیں۔''

یہ بات اس نے کچھ ایسے انداز سے کہی کہ ماں انکار نہ کرسکی، اس نے چادر سر پر ڈالی، ایک موم بتی ہاتھ میں لی اور اُٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو......آؤ......''

لیکن ماہ پر ڈر پھر غالب آنے لگا تھا، اس نے کہا:

''میں یہیں بیٹھی ہوں تم دیکھ آؤ جاکر۔''

ماں شمع ہاتھ میں لئے ہوئے ہنستی مسکراتی چلی گئی، اور ماہ دبک کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں ماں کی گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی آواز آئی۔

''اری ماہ جلدی آ۔''

ماہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے چاہا کہ ماں کی پکار پر لبیک کہے اور باہر چلی جائے، لیکن ایک ایک پاؤں سَو سَو من کا ہوگیا، اپنی جگہ سے جنبش ہی نہ کرسکی۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔

''کیا بہری ہوگئی ہے۔ ذرا بھی نہیں سنتی۔''

لیکن ماہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور زیادہ دبک کر کونے میں بیٹھ گئی۔

آخر شمع کی روشنی باہر سے اندر کی طرف آتی دکھائی دی، اور ماہ سوچنے لگی کہ دیکھئے کیا خبر آتی ہے۔ اتنے میں ماں اندر آگئی، اس نے کہا۔

''کم بخت اتنی دیر سے پکار رہی ہوں اور تو جنبش نہیں کرتی اپنی جگہ سے۔''

ماہ نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھ جواب دیا:

''تو میں کیا کرلوں گی باہر جاکر، اب تو آ ہی گئی ہو، بتادو کیا بات ہے؟''

ماں نے برہمی اور غصے کے لہجے میں کھڑے کھڑے کہا:

''معلوم ہوتا ہے گھوڑا بدک گیا، اور سوار کو گرا کر بھاگ گیا، نہ جانے کون ہے بے چارہ!''

اب تو ماہ جذبہ ہمدردی سے چور ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''واقعی...... لیکن وہ زندہ ہے یا مر گیا؟''

ماں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یوں ہی بیٹھے بیٹھے سوالات کرتی رہو گی اور اپنی جگہ سے ہلو گی نہیں تو مر بھی جائے گا......! میں کہتی ہوں باہر چل، ہم دونوں اس غریب کو اندر لے آئیں تو شاید بچ جائے۔ نہ جانے کون ہے بیچارہ؟''

ماہ کی ہمت بندھ گئی، اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا:

''تو آؤ پھر۔''

ماہ اپنی ماں کے ساتھ کھنڈر سے باہر نکلی، اور فاصلے پر دیکھتی کیا ہے کہ ایک آدمی بے سدھ پڑا ہے خون میں لت پت!

ماہ نے ماں کی مدد سے بڑی دقت کے ساتھ اسے اٹھایا، اور اندر لے کر پہنچی!

''یہ کوئی سوار تھا۔''

تلوار، نیزہ، خنجر، ہر چیز سے مسلح!

ماہ نے کہا:

''یہ تو کوئی سوار معلوم ہوتا ہے؟''

ماں نے جل کر کہا۔

لیکن آدمی پہلے ہے، ہمیں اس کی جان بچانے کی کوشش کرنی چاہیے، بری طرح زخمی ہوا ہے، لیکن سانس آ جا رہی ہے، خدا کرے بچ جائے!

(3)

مَرہم سُلیمَانی

اور یہ بوڑھی عورت کوئی بڑی ہی فن کار عورت تھی!

سوار کو کھنڈر کے اندر تک لا دکر لانا تو اس کے لئے واقعی کار دشوار تھا، لیکن جب وہ لا کر بستر پر لٹا دیا گیا تو اس کے ہاتھوں نے بجلی کی سی تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا!

جلدی جلدی اُس نے سوار کا لباس اتارا، اس کے زخم دھوئے، خون پونچھا، زخموں کو صاف کیا اور بڑی پھرتی سے اپنا بکس کھول کر سفوف نکالے، کچھ دوائیاں نکالیں اور چند منٹ کے اندر مرہم تیار کرلیا۔ یہ مرہم اس نے مجروح سوار کے تمام زخموں پر لیپ دیا، پھر اس نے اپنے بکس سے کچھ اور دوائیں نکالیں، اور انہیں کوٹ چھان کر اور پیس کر ایک عرق سا تیار کیا۔

ماہ اب تک حیرت اور خاموشی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی، خاموش نہ رہ سکی، پوچھ بیٹھی!

''اس عرق کا کیا ہوگا؟''

بڑی بی نے کہا:

''یہ پلایا جائے گا!''

ماہ نے سوال کیا:

''کیا بیہوش آدمی بھی عرق پی سکتے ہیں!''

پھر مسکراتی ہوئی بولی۔

''یا اس عرق کی یہ تاثیر ہے کہ یہ خود بخود، گلاس سامنے کرنے سے بیہوش آدمی کے حلق میں پہنچ جاتا ہے؟''

بڑی بی نے بیٹی کے اس طنز لطیف کی پروا نہ کی۔ بدستور اپنی مصروفیت قائم رکھتے ہوئے کہا:

''اگر تم ہاتھ نہیں بٹا سکتیں تو بک بک بھی نہ کرو......لاؤ چمچہ......کہاں ہے؟''

ماہ نے اب بحث کرنا لا حاصل سمجھا، جلدی سے چمچہ اُٹھا لائی۔

بڑی بی نے کہا:

''اس کے سرہانے بیٹھ جاؤ، سر اُٹھا کر گود میں رکھ لو۔''

ماہ شرما گئی......

واہ!

بڑی بی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا:

''سن رہی ہے، میں کیا کہہ رہی ہوں؟''

ماہ نے بدستور الگ کھڑے جواب دیا:

''سن تو رہی ہوں، لیکن نہ میں سرہانے بیٹھوں گی، نہ سر گود میں رکھوں گی، اماں تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی باتیں مجھ سے کرنے کو کہہ رہی ہو؟''

بڑی بی نے اور زیادہ جھلائے ہوئے انداز میں کہا:

میں تمہیں حکم دیتی ہوں تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا، ایک انسان کی، ایک مہمان کی جان بچانا فرض ہے، میں تمہاری ماں ہوں اور جانتی ہوں تمہیں کیا کرنا چاہئے، اور کیا نہ کرنا چاہئے، بس اب بحث ختم، جو کہتی ہوں وہ کرو چپ چاپ؟''

آخر ماہ کو ماں کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا، وہ سوار کے سرہانے بیٹھ گئی، اس کا سر گود میں رکھ لیا اور سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

ماں نے کہا:

''ہاں ٹھیک ہے، اب ذرا اس کا سر اُونچا کرو۔''

بیٹی نے ماں کا یہ حکم بھی مان لیا۔

بڑی بی نے وہ عرق چمچے میں ڈالا، اور بے ہوش سوار کا منہ ایک دوسرے چمچے سے زور دے کر کھولا۔ اور پھر یہ عرق اس میں انڈیل دیا۔ اسی طرح کئی مرتبہ کیا۔ اور سارا عرق اس کے پیٹ میں پہنچا دیا، پھر کہا۔

''بس اب آہستہ سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دو اور ہٹ آؤ وہاں سے۔''

ماہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کی، پھر بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا:

''اور اب کیا ہو گا، اماں؟''

ماں نے اپنی بھولی بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی:

''اگر موت نہیں آ گئی تو یہ ضرور بچ جائے گا!''

ماہ نے پھر سوال کیا:

''اور اس کے زخم!...... کیا وہ بھی بھر جائیں گے؟''

ماں نے جواب دیا:

''ہاں بیٹی، وہ بھی اچھے ہو جائیں گے، میں نے مرہم سلیمانی لگا دیا ہے، کیسا ہی زخم ہو...... انشاءاللہ چند دن میں اچھا ہو جائے گا۔''

ماہ نے مزید پوچھا۔

''لیکن اماں انہیں ہوش کب تک آئے گا؟''

بڑی بی نے کوئی جواب نہیں دیا، مریض کے سرہانے کھڑی ہو کر اس کی نبض ٹٹولی، کچھ دیر تک چپ چاپ ایک حکیم کی طرح نبض دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ رکھ کر کہا:

''خدا نے چاہا تو کل تک ہوش آ جائے گا۔''

پھر بولی:

''لیکن بخار بہت شدید ہے، مجھے اندیشہ ہے ہوش میں آنے کے بعد، یہ ہذیان بکنے لگے گا۔اس پر بحرانی کیفیت طاری ہو جائے گی۔''

ماہ نے مایوسی کے عالم میں کہا:

''پھر کیا فائدہ ہوش میں آنے سے؟''

ماں نے کہا:

''اس کی دوا بھی میرے پاس ہے، انشاء اللہ چند خوراکوں میں یہ کیفیت بھی دُور ہو جائے گی۔''

ماہ نے پوچھا۔

''تو یہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے؟''

بڑی بی نے بتایا:

''کم از کم پندرہ بیس دن لگیں گے، ممکن ہے مہینہ لگ جائے، لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے!''

ماہ نے ترس کھاتے ہوئے کہا:

''خدا کرے اچھا ہو جائے بیچارہ۔''

ماں نے تائید کی:

''آمین...... نہ جانے کس کا لال ہے، ماں باپ سمجھ رہے ہوں گے کام پر گیا ہے انہیں کیا خبر یہاں اس حال میں پڑا ہے۔''

ماہ کہنے لگی:

''ہمیں ان کے گھر کا نام نشان معلوم ہوتا تو ابھی گھر والوں کو اطلاع دے دیتے یا انہیں وہاں پہنچا دیتے۔''

بڑی بی نے مسکراتے ہوئے کہا:

''کیا کہنا ہے تمہاری بہادری اور ہمت کا...... ابھی کھنڈر سے نکلنے میں دم نکلا جا رہا تھا، اب اس پر تیار ہیں کہ گھر والوں کو جا کر بلا لائیں۔''

ماہ ہنسنے لگی، پھر اُس نے کہا:

''اماں مجھے حیرت ہے...... تم تو بہت بڑی حکیم اور جراح بھی ہو!''

وہ بولی:

''ہاں ایک سپاہی کی بیوی کو حکیم اور جراح ہونا ہی چاہیے۔''

''تو کیا یہ باتیں تم نے ابا سے سیکھی تھیں؟...... کیا وہ حکیم تھے، جراح تھے؟''

اب تو چُپ بھی رہے گی یا نہیں؟...... اتنی رات آ گئی، جا سو رہ...... لیکن ہاں عشاء کی نماز نہ تو نے پڑھی نہ میں نے، پہلے اس فرض سے فارغ ہو لینا چاہیے، وضو ہے؟''

ماہ نے کسل مندی کے انداز میں جواب دیا۔

''نہیں...... وضو کرنا پڑے گا، لیکن اماں مجھے تو بڑی سخت نیند آ رہی ہے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔

بڑی بی کو جلال آ گیا۔

''خبردار! نماز پڑھے بغیر نہیں سو سکتیں۔ ایک زخمی کی خدمت کر کے جو ثواب ہونا ہے ایک فرض ناغہ کر کے اسے رائیگاں نہ کرو!''

آخر اس حکم کے سامنے بھی ماہ کو سر جھکانا پڑا، وضو کرنے کے لئے اس نے لوٹا ہاتھ میں

لیا تھا کہ ماں نے کہا:

’’نہیں بیٹی پانی بہت ٹھنڈا ہے، میں ابھی دم کے دم میں گرم کیئے دیتی ہوں، گرم پانی سے وضو کرنا!‘‘

ماہ ماں کی محبت کا یہ منظر دیکھ کر شرمندہ ہوگئی، اس نے کہا:

’’واہ تم کیوں گرم کروگئی، کیا میں اتنا کام بھی نہیں کرسکتی؟‘‘

پھر اس نے تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا:

’’ماں کی خدمت کرنا بھی تو ثواب ہے۔‘‘

(4)

دُشمن

ماہ نے جلدی جلدی آگ سلگائی، پانی گرم کیا، ایک لوٹا بھر کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔ ایک سے خود وضو کرنے لگی، دونوں ماں بیٹی نے ساتھ ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ماہ تو بستر پر آ کر لیٹ گئی، اور بڑی بی نماز کے بعد بھی بڑی دیر تک دُعا مانگتی رہیں۔

ماہ نے بستر پر آ کر لیٹ کر سونے کے لئے اُس نے آنکھیں بند کر لیں، لیکن نیند نہ آئی۔

رہ رہ کر اس زخمی کا اُسے خیال آتا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی!

نہ معلوم یہ بدقسمت شخص کون ہے۔

نہ جانے بیچارہ زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں؟

خدا جانے کس خاندان کا فرد ہے؟

یک بیک اس کے دل میں خیال آیا:

یہ کوئی شخص بھی ہو، کسی خاندان کا فرد بھی ہو، اس کا لباس بتا رہا ہے کہ یہ سپاہی ہے۔ ممکن ہے افسر ہو، بہر حال حکومت کا آدمی ہے، ہم لاکھ اس کی خدمت کریں اس کی تیمارداری کریں، اپنی خدمت اور تیمارداری سے اُسے نئی زندگی عطا کر دیں، یہ ہم سے نفرت، حقارت، ذلت اور توہین ہی کا برتاؤ کرے گا۔

اگر یہ واقعی سپاہی ہے،

اگر یہ اپنے بادشاہ کا وفادار اور جاں نثار ہے

اگر یہ کھرا مسلمان ہے۔

تو ہمارا ممنوع کرم ہونے کے بعد بھی ہم سے نفرت کرنے، ہمیں ذلیل سمجھنے ہم سے ذلیل برتاؤ کرنے اور ہمیں ٹھوکر لگانے پر مجبور ہے!

پھر ہم اس کی خدمت کیوں کر رہے ہیں؟

پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ذلت، نفرت، حقارت اور توہین کا برتاؤ برداشت کرنے کے لئے اس کی خدمت کریں، اس کی تیمارداری کریں؟ اسے موت کے پنجے سے چھڑائیں؟

اماں نے اسے وہیں باہر زمین پر ہی کیوں نہ پڑا رہنے دیا؟

اسے مر کیوں نہ جانے دیا؟

کیوں اس کے لئے مرہم بنایا، کیوں اس کے لیے عرق تیار کیا، کیوں اتنی احتیاط کے ساتھ اس کی خبر گیری کی؟

اگر لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں تو ہم کیوں ان سے انسانیت کا برتاؤ کریں؟ اگر ہمیں لوگ ذلیل نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہم کیوں اُن سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں؟ اگر ہمارے بارے میں لوگوں کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم ذلیل ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم بھی موقع پا کر دوسروں کو ذلیل نہ کریں؟

صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کروں گی کہ اس شخص کو وہیں پھینک آؤں گی جہاں سے اسے اُٹھایا تھا۔

بلا سے مر جائے!

نہ جانے کتنے لوگ ہر روز مرتے رہتے ہیں۔ ایک یہ بھی سہی، اس کے مرنے سے ہمیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک طرح کا سکون ملے گا!...... ایک دشمن اور کم ہوا۔ ہر روز جتنے آدمی اس شہر میں مرتے ہیں خیال کرتی ہوں کہ اتنے دشمنوں کا صفایا خدا نے کر دیا۔ بھلا کوئی دشمن کی زندگی بھی چاہ سکتا ہے! دشمن کے ساتھ بھی رحم کا برتاؤ کر سکتا ہے؟ دشمن کے لئے بھی مرہم تیار کر سکتا ہے؟

ہرگز نہیں۔

یہ انسانیت نہیں حماقت ہے۔

اور صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے اس حماقت کی تلافی کروں گی خواہ ماں سے جنگ عظیم کیوں نہ کرنا پڑے! ان کی ہر بات مانتی ہوں اور مانوں گی مگر اس بات کو نہیں تسلیم کر سکتی۔

اتنے میں ماہ نے کچھ آہٹ سی محسوس کی، گو شمع گل ہو چکی تھی، لیکن آنکھیں اندھیرے

کی عادی ہو چکی تھیں۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو آہستہ آہستہ قدم رکھتی بڑی بی آ رہی تھیں۔ اُنھوں نے سب سے پہلے مریض کے بستر کے پاس جا کر اس کا ماتھا دیکھا۔ اس کی نبض کا معائنہ کیا، پھر جو کچھ پڑھ رہی تھیں اس پر دم کیا، پھر دو قدم آگے بڑھیں اور یہی عمل خود ماہ کے ساتھ بھی کیا۔ اسے بھی پھونکا اور کچھ پڑھ کر دم کیا، اور پھر چپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ رہیں۔

ماں کا یہ عمل دیکھ کر ماہ بیکل ہوگئی۔ لیکن کچھ نہ بولی، اسی طرح پڑی رہی، گویا سو رہی ہے!

(5)

بیمار اور تیماردار

رات کو ماہ بڑی دیر میں سوئی تھی، صبح وقت پر آنکھ نہ کھلی، آخر ماں نے جھنجھوڑا......!

سورج سر پر آ گیا، شام تک سوتی رہو گی؟

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، منہ ہاتھ دھو کر جب واپس آئی تو ماں نے سوال کیا:

''قضا سہی، نماز تو پڑھ لی ہوتی۔''

اس نے بھلنساہٹ سے جواب دیا۔

''پڑھ آئی ہوں، اماں جان!''

پھر وہ ماں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی جو زخمی کی پٹیاں بدل رہی تھی، ماہ سے یہ جگر خراش منظر دیکھا نہ گیا۔ کھسک گئی، لیکن ماں نے پھر آواز دی۔''

وہ پھر آ کر ماں کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''کہو کیا ہے......! مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا جاتا، ایک آدھ معمولی سا زخم ہو تو آدمی دیکھ لے، یہ تو کئی جگہ سے گھائل ہیں۔ بعض زخموں سے تو خون اب تک رس رہا ہے۔''

ماں نے ان باتوں کا جواب غیر ضروری سمجھا، اور اپنے کام میں لگی رہی، ماہ چپ چاپ کھڑی رہی اور ماں کی جراحی کے کمالات دیکھتی رہی۔ آخر عاجز آ کر اس نے کہا:

''خواہ مخواہ کھڑا کر لیا بلا کے مجھے......نہ کوئی کام ہے نہ کاج!''

اتنے میں زخمی کی مرہم پٹی سے بڑی بی فارغ ہو چکی تھیں، انہوں نے بیٹی سے کہا:

''جاؤ طاقچے میں وہ عرق رکھا ہے، تھوڑا سا گلاس میں انڈیل لاؤ، اور دو چمچے لیتی آؤ۔

ماہ سمجھ گئی، رات کا عمل پھر دہرایا جائے گا، لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات، تعمیل کے سوا چارہ بھی کیا تھا، گئی طاقچے سے بوتل اتاری، تھوڑا سا عرق گلاس میں انڈیلا۔ دو چمچے لیے، اور یہ سارا سامان لے کر پھر حاضر ہو گئی، ماں کے حضور میں، بڑی بی مریض کے سرہانے سے اُٹھتی ہوئی بولیں۔

''یہاں بیٹھ جاؤ، میری جگہ اور اس کا سر گود میں لے لو۔''

ماہ نے ٹھٹک کر کہا۔

''پھر وہی، کچھ فائدہ تو ہوا نہیں اس عرق سے، بیچارہ ویسا کا ویسا بیہوش ہی چلا آرہا ہے۔''

بڑی بی نے پھر کہا:

''بک بک نہ کرو۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کرو!''

ماہ خاموشی کے ساتھ مریض کے سرہانے آکر بیٹھ گئی، پھر اس کا سر گود میں لیا اور ماں سے کہا:

''اب پلاتی کیوں نہیں؟''

''بڑی بی نے خوفناک اور برہم نظروں سے گھور کر بیٹی کو دیکھا، اور بولیں۔

''سر تو اُٹھاؤ ذرا اوپر۔''

ماہ نے اس فرمائش کی تعمیل بھی کردی، بڑی بی نے چمچہ لے کر پورا زور لگایا۔ اور بڑی مشکل سے اس کے دانت جو بیٹھے ہوئے تھے ذرا کھلے۔ پھر دوسرے چمچے میں عرق ڈال کر اس کے حلق میں ٹپکایا، پھر تعرض کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''بہت تھک گئی ہوگی، اب اتر آؤ۔''

ماہ نے مریض کا سر آہستہ سے تکیے پر رکھا، اور پھر اُٹھ آئی۔

اب تک اس نے نظر بھر کر مریض کو نہیں دیکھا تھا رات کو چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اسے دیکھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت ماں سے کچھ ایسے رٹا کے رہے کہ توجہ کا موقع نہ ملا۔ اب اس کا سر تکیہ پر رکھ کر جو ہٹنے لگی تو صحیح طور پر اُسے دیکھنے کا موقع ملا۔

یہ ایک نوجوان شخص تھا، عمر میں ماہ سے شاید چار پانچ سال بڑا ہوگا، چہرے پر شرافت اور نجابت کے آثار نمایاں تھے۔ اور ایک عجیب طرح کی معصومیت برس رہی تھی، سر، ماتھا، گال، ہاتھ، کمر، پاؤں کئی جگہ زخم تھے۔ اور ان زخموں پر پٹیاں بندھی تھیں یا پھائے لگے تھے۔ بڑی بڑی نیم باز آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، کھلتا ہوا رنگ، ان سب کے مجموعے نے ایک باوقار اور طرحدار نوجوان کی صورت اختیار کر لی تھی، زخموں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ کافی خون نکل گیا تھا۔ چہرے پر زردی غالب آگئی تھی۔ لیکن بانکپن بتا رہا تھا کہ کوئی جیالا شہسوار ہے۔ پہلی نظر پڑتے

ہی ماہ کے دل میں رحم، ترس اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ رات کو نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی وہ پہلا کام یہ کرے گی کہ اس جسم نیم جاں کو وہیں پھینک آئے گی جہاں سے یہ اٹھایا گیا تھا، اس نے سوچا تھا جب ہم پر کوئی رحم نہیں کرتا تو ہم کیوں کریں؟ جب ہم پر کوئی ترس نہیں کھاتا تو ہم کیوں کھائیں؟ جب ہم سے کسی کو ہمدردی نہیں ہے تو ہم کیوں دوسروں کی ہمدردی میں اپنی جان ہلکان کرتے پھریں؟...... لیکن اب اس بیہوش، بے بس بے سہارا شخص کو ایک نظر جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد اس کی رائے بدل گئی تھی اب وہ سوچ رہی تھی۔ اگر یہ دشمن ہوتو بھی ہمیں اپنا فرض انسانی ادا کرنا چاہیے۔ اب وہ اس منزل پر تھی کہ اگر بڑی بی حکم دیتیں کہ اسے باہر پھینک آؤ تو وہ انکار کر دیتی اور جن دلائل سے اُنہوں نے اسے قائل کیا تھا انہی دلائل سے یہ انہیں ہم نوا بنانے کی کوشش کرتی، اس نے زخمی کو ایک نظر دیکھا۔ اور وہیں کھڑی رہ گئی۔ جیسے زمیں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں، جیسے اس کی قوتِ رفتار سلب ہوگئی ہوں۔ دل ہی دل میں وہ خدا سے دعا کر رہی تھی۔ اے اللہ اسے اچھا کر دے، یہ اس کے مرنے کے دن نہیں ہیں۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ یہ زندگی کا مستحق ہے۔ ہم اگر معتوب بارگاہ اور راندۂ درگاہ ہیں تو ہوا کریں۔ دوسروں کو خوش وخرم اور مسرور وشادماں دیکھ لیں، یہی بہت ہے!

ماہ کھڑی یہی تدابیر سوچ رہی تھی کہ بڑی بی نے عارفانہ انداز میں بیٹی کو مخاطب کر کے کہا:

''میں کبھی نہ مانوں گی، بڑی بی کہ چوٹیں صرف گھوڑے سے گرنے کے باعث آئی ہیں!''

ماہ نے سہم کر پیشان لہجے میں پوچھا:

''تو کیا تمہارا خیال ہے یہ زخمی کیا گیا ہے، کسی نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟''

بڑی بی نے یقین اور اعتماد کے لہجے میں جواب دیا۔

ہاں بیٹی یقیناً یہی بات ہے!...... نہ زمین پر نیزے اور خنجر گرے ہوئے تھے کہ یہ ان پر گرا اور زخمی ہوگیا۔ نہ گھوڑے کی پیٹھ پر چھریاں لگی تھیں کہ مجروح ہوکر گر پڑا۔ اسے تو کچھ لوگوں نے زخمی کیا ہے۔ اور کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوکر ادھر سے گزر رہا ہے اور زخموں کی تاب نہ لا کر ہمارے گھر کے سامنے گر پڑا۔''

ماہ نے ایک مرتبہ پھر زخمی کے زخموں پر نظر ڈالی، اور ماں کی بات کو سچا محسوس کر کے کہنے لگی:

''لیکن اماں جان وہ کتنے ظالم اور درندہ صفت لوگ معلوکم ہوتے ہیں جنہوں نے اس نہتے شخص پر حملہ کیا۔''

بڑی بی نے جواب دیا:

''میں کیا بتا سکتی ہوں بیٹی! خدا کرے ہوش میں آ جائے، تب ہی راز افشا ہوگا!''

ماہ نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

''لیکن ماں اتنی دیر ہوگئی، اب تک تو ہوش آیا نہیں بیچارے کو، کیا تمہیں امید ہے کہ یہ ہوش میں آ جائے گا؟''

بڑی بی نے پہلے سے زیادہ اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا:۔

''ہاں بیٹی...... خدا نے چاہا تو ضرور ہوش میں آ جائے گا۔ بخار ویسے تو اب بھی شدید ہے، لیکن پہلے سے کچھ کم ہے۔ اور نبض کی رفتار بھی پہلے کے مقابلے میں بہتر ہے۔''

''ماہ نے ایک سوال کر ڈالا اور پوچھا؟''

''تو کیا خیال ہے کب تک ہوش آ جائے گا؟''

بڑی بی بولیں:

''میرا خیال ہے دو تین گھنٹے میں آنکھیں کھول دے گا۔''

ماہ خوش ہوگئی۔

''خدا کرے...... مجھے تو بڑا ترس آ رہا ہے بیچارے پر!''

بڑی بی نے گویا یہ بات نہیں سنی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئیں:

''اصل خطرہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد شروع ہوگا۔''

ماہ نے سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا اور بولی۔''

کیوں اماں، ہوش میں آنے کے بعد تو اسے اچھا ہو جانا چاہیے۔''

بڑی بی نے اپنی نادان بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو نہیں جانتی...... ہوش میں آنے کے بعد اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگی۔ اگر اس سے بچ گیا تو زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ورنہ پھر اللہ بیلی ہے۔''

ان الفاظ سے ماہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے ایک نئی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا......!

''اماں پھر ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ شہر سے کسی حکیم یا جراح کو بلا لاؤ۔ وہ شاید زیادہ بہتر طور پر علاج کر سکے۔''

''نہیں۔'' بڑی بی نے یہ تجویز رد کردی۔

''نہیں بیٹی، یہ مناسب نہیں ہے۔''

مگر ماہ تو ہر بات جاننے پر تلی ہوئی تھی کہنے لگی۔

''کیوں اس میں کیا حرج ہے؟''

بڑی بی نے بتایا:

''اس طرح پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی کہ نہ جانے یہ کون دشمن ہے۔ اس طرح زخمی ہو کر اس کا ہمارے ہاں پایا جانا ہمارے بارے میں پھر سے لوگوں کو مشکوک و مشتبہ بنا دے گا۔ ممکن ہے یہ بچ جائے، لیکن ہم ناکردہ گناہ ہوتے ہوئے بھی نئی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔ رہا علاج! تو کسی حکیم یا جراح کے پاس بھی نہ وہ عرق نکل سکتا ہے جو میں اسے پلا رہی ہوں، نہ وہ مرہم دستیاب ہو سکتا ہے جو میں نے لگایا ہے، اگر زندگی ہے تو ضرور بچ جائے گا، اگر وقت آ گیا ہے تو جس طرح میں نہیں بچا سکتی کوئی حکیم یا جراح نہیں بچا سکتا!''

ان باتوں سے ماہ کا اطمینان ہو گیا۔ لیکن ایک نیا شبہہ پیدا ہوا اس کے دل میں۔

''اور اماں اگر خدانخواستہ اس شخص کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا پھر؟...... پھر تو شاید ہمارا جرم اور سنگین ہو جائے؟''

''وہ کس طرح بیٹی؟''

''وہ یوں کہ ہم نے ہی اسے لوٹ کر ہلاک کر دیا ہے۔ ہمارے پاس جو روپیہ ہے اس کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ لوٹ کا ہے۔''

''نہیں! یہ اندیشہ نہ کرو۔ اس کھنڈر میں دو سو آدمی بھی اگر داب دیے جائیں تو قیامت تک ان کی لاشوں کا پتہ نہیں چل سکتا!''

یہ سُن کر ماہ کے بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی!

(6)

ہذیان

اور بڑی بی کا کہنا واقعی درست ثابت ہوا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد زخمی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور حیرت واستعجاب کی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ماہ یہ دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ اس نے بڑی بی کو آواز دی۔

''اماں، اماں، ذرا ادھر آنا۔''

بڑی بی کھانے پکانے میں مشغول تھیں۔ وہیں سے جواب دیا:

''میں نہیں آتی، جو کچھ کہنا ہو کہہ دو، سن رہی ہوں۔''

ماہ نے خوشی کی لہراتی ہوئی آواز میں کہا:

''اماں زخمی کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور برابر دیکھ رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی بڑی بی ہانڈی وہیں چولھے پر چھوڑ دوڑی آئیں اور کہنے لگیں!

''اے سچ!...... ہاں ہوش میں تو آ گیا، یا اللہ تیرا شکر!''

ماہ نے ماں کے پہلو میں کھڑے ہو کر کہا:

یہ ہوش میں آ گیا، لیکن بات نہیں کرتا۔ کیوں اماں کیا بات بھی کرے گا یہ!''

بڑی بی نے اطمینان دلایا۔

''ہاں ضرور کرے گا۔''

ماں بیٹی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں زخمی تکیہ سر پر رکھے دونوں کو نگاہِ غور سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ مسکرا دیا اور اس نے کہا۔

''بڑی بی صورت سے تو بڑی نیک اور پارسا معلوم ہوتی ہو، مگر یہ لچھن، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو، مگر دُنیا کی ہوس نہیں جاتی!''

ماہ حیرت سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر زخمی نے ایک تیز نگاہ ماہ پر ڈالی اور کہنے لگا۔

''صورت ایسی اور سیرت یہ، روپ دیکھو تو جنت کی حور، حرکتوں پر نظر کرو تو شیطان کی

خالہ، چہرے پر وہ معصومیت کہ فرشتے بھی درود پڑھنے لگیں۔ دل میں وہ کپٹ اور خباثت کہ ابلیس بھی پناہ مانگے...... کیوں جی کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ روپ ایسے ہی قائم رہے گا! کبھی یہ تمہاری اماں جان بھی تمہاری طرح حسین وجمیل ہوں گی، لیکن دیکھ، پاس ہی تو کھڑی ہیں اب کیا حال ہے! ایک دن تم بھی اس منزل پر پہنچو گی اور پھر اسی منزل پر پہنچ جاؤ گی جو ہر انسان کی منزلِ مقصود ہے۔ یعنی آغوشِ قبر! کچھ سوچا ہے خدا کو کیا جواب دو گی؟...... تم اس بوڑھی عورت کی یا بیٹی ہو یا بہو ہو۔ لیکن جو کچھ بھی ہو، یاد رکھو خدا کے ہاں صرف عمل کام دے گا، نہ یہ بڑی بی کام آسکیں گی نہ اور کوئی کام آسکے گا۔ جیسی صورت ہے ویسی ہی سیرت بھی پیدا کرو......''

وہ پھر چُپ ہو گیا،

ماہ کا چہرہ اتر گیا، ساری خوشی کافور ہو گئی۔ یہ باتیں سُن کر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر کوڑے مارے ہوں، حسرت اور بے بسی کے ساتھ دیکھا اور پھر گویا ہوئی،

''اماں سُن رہی ہو؟''

بڑی بی نے جواب دیا:

''ہاں بیٹی سُن رہی ہوں...... میں نے کہا نہ تھا ہوش میں آنے کے بعد اس پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو گی۔ خدا خیر کرے، رحم کرے، بچ جائے یہ۔''

ماہ نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

''کیا ہذیان اسی طرح بکا جاتا ہے؟''

بڑی بی نے بتایا:

ہاں بیٹی! ہذیانی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ آدمی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کیا کہہ رہا ہے! لیکن ہذیان زیادہ شدید قسم کا نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے امید ہے جلد ہی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔''

زخمی چپ چاپ پڑا تھا، پھر اس نے کہا:

''کیوں بڑی بی! تمہارے اور ساتھی کہاں گئے جنہوں نے مجھے زخمی کیا تھا؟ سات آدمی ایک اکیلے آدمی پر اچانک ٹوٹ پڑیں تو وہ کیا کر سکتا ہے! لیکن میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ میری تلوار نے رفاقت اور دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اتنا تو اچھی طرح یاد ہے تمہارے دو بیٹوں کو میں نے کو وہیں ڈھیر کر دیا تھا۔ تیسرے کا بھی بازو جھول گیا تھا میرے نیزے کے وار سے، امید ہے وہ

بھی مر گیا ہوگا۔ کیونکہ سر کے بل گھوڑے سے گرتے میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ پھر باقی چاروں آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے میں نے بھی خوب خوب ہاتھ چلائے۔ زخمی ہوا۔ خون میں نہا گیا۔ لیکن ان کے ہاتھ نہ آیا۔ میرا گھوڑا مجھے لے کر سرپٹ بھاگا۔ شاید وہ مجھے بچا لے جاتا لیکن راستے میں تم ماں بیٹی جال بچھائے بیٹھی تھیں اور اس جال میں واقعی میں گرفتار ہوگیا۔ میرا گھوڑا کہاں ہے؟ اور وہ تمہارے لٹیرے اور رہزن بیٹے کہاں ہیں؟ بلاؤ انہیں، میں مقابلہ کروں گا۔ اب بھی مجھ میں اتنی سکت ہے کہ اُن سے بھگت سکتا ہوں، وہ بزدل ہیں جو سات آدمی مل کر دھوکے میں ایک آدمی پر حملہ کریں۔ ان کے بزدل ہونے میں کوئی شک کر سکتا ہے؟ ہاں تم ماما کے جوش میں نہ مانو تو دوسری بات ہے۔ جو ایک آدمی تن تنہا سات آدمیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے وہ یقیناً بہادر ہے اور میں ہوں وہ بہادر جس نے ان سات بزدلوں کا مقابلہ کیا تھا...... بلاؤ انہیں...... انہیں بلاؤ!''

یہ کہہ کر زخمی نے اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔ بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔

ماہ نے اضطراب کے ساتھ بڑی بی سے کہا۔

''اماں یہ تو پھر بیہوش ہوگیا۔ اب شاید اسے ہوش نہیں آئے گا۔''

بڑی بی نے بہت زیادہ مطمئن لہجے میں کہا:

''نہیں بیٹی، اب خطرہ بالکل ٹل گیا۔ اب انشاء اللہ کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے۔ ہذیانی دور ختم ہوگیا۔ کچھ دیر بعد پھر ہوش میں آجائے گا۔ اور پھر یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی۔''

ماہ چپ چاپ یہ باتیں سنتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''دیکھنا چاہیے۔''

بڑی بی نے کہا:

''لیکن کمزور بہت ہوگیا ہے۔ ایک تو خون کافی نکل گیا، دوسرے زخموں کی تکلیف تیسرے کئی وقت کا فاقہ......''

ماہ نے ماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کمزوری ایک دم سے تو نہیں جا سکتی؟''

بڑی بی نے ایک تجویز پیش کر دی۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں بھی تو کچھ تدبیر کرنی چاہیے۔ ایسا کرو تم اس کے پاس بیٹھی

دیکھ بھال کرتی رہ، ذرا بازار تک جا کر ایک چوزہ لے آؤں، اس کی یخنی تیار ہونی چاہیے۔ جیسے ہی ہوش آئے تو اس کو پلا دیں گے۔ اس سے کچھ طاقت آ جائے گی، کم از کم طاقت اور زیادہ نہیں گھٹے گی یہی بہت ہے!''

اس تجویز پر صادر کرنے کے سوا کیا چارہ تھا! ماہ مریض کے پاس بیٹھ گئی، اور بڑی بی سر پر چادر ڈال کر بازار چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ماہ مریض کی ہذیانی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اماں غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ اس بیچارے کی ڈاکوؤں سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ اور اسی میں یہ زخمی ہوا اور نہ صرف گھوڑے سے گر کر اس طرح زخمی ہونے کے کوئی معنی نہیں تھے۔''

وہ افسوس، ہمدردی اور ترحم کے جذبے سے مریض ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

کبھی اسے چادر اُوڑھا دیتی، کبھی تکیہ ٹھیک کرنے لگتی، کبھی دیکھتی پٹیاں ٹھیک سے بندھی ہیں یا نہیں! جنبش کے باعث پھاہا اِدھر اُدھر ہو جاتا تو اسے پھر سے درست کر دیتی۔

تھوڑی ہی دیر میں بڑی بی چوزہ لے کر آ گئیں۔

(7)

پُرسِش

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد مریض کی آنکھ پھر کھلی اور وہ اِدھر اُدھر ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ ماہ پاس بیٹھی تھی۔ اس نے پھر ماہ کو آواز دی۔

''اماں! اِدھر آنا ذرا!''

بڑی بی پھر لپکی لپکی آئیں۔ اور مریض کو دیکھ کر خوش ہو گئیں، کہنے لگیں!

''اللہ نے اپنا فضل کیا، اب یہ ہوش میں ہے۔ تو بیٹھ میں یخنی لے کر آتی ہوں۔''

مریض نے منہ پھیر کر ماہ کی طرف دیکھا۔ پھر چھت، دیوار، دروازے پر ایک نظر ڈالی، اس کے بعد کچھ سوچتا ہوا بولا۔

''کون سی جگہ ہے؟''

ماہ نے کہا:

''یہ ہمارا غریب خانہ ہے۔''

مریض نے سوال کیا:

''میں کہاں ہوں؟''

''دوستوں کے پاس...... آپ پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا؟''

''ہاں مجھے یاد ہے میں نے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کے کئی ساتھیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ چاروں طرف سے مجھ پر تیروں اور تلواروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، لیکن میرا گھوڑا مجھے لے کر بھاگ نکلا تھا۔ میں زخموں سے چور اور نڈھال ہو رہا تھا حواس جواب دے رہے تھے رات کے اندھیرے میں راستہ پہچاننا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی تھی اور وہ سرپٹ دوڑتا ہوا سے باتیں کرتا رواں دواں تھا۔ یکایک...... یکایک......

آپ ہمارے اس خرابہ کے پاس سے گزرے۔ معلوم نہیں گھوڑا بدکا یا ٹھوکر کھائی آپ گر پڑے۔ اور وہ گھوڑا بگٹٹ بھاگتا چلا گیا۔

''مجھے یاد ہے...... میں گرا تھا۔''

''میں نے دھماکے کی آواز سنی تو خیال ہوا شاید گھوڑے نے سوار کو گرا دیا ہے، پھر میں اپنی اماں جان کے ساتھ باہر نکلی...... گھر میں کوئی مرد تو نہ تھا، ہمیں دونوں گرتے پڑتے آپ کو اٹھا کر لائے۔''

''کیا ضرورت تھی اتنی زحمت کرنے کی، پڑا رہنے دیا ہوتا وہیں۔''

''واہ یہ کیسے ہو سکتا تھا، آخر آدمیت اور شرافت بھی تو کوئی چیز ہے، اگر آپ وہیں پڑے رہتے؟''

''تو مر جاتا اور کیا ہوتا!''

''اللہ نے انسان کی جان اتنی بے قیمت تو نہیں بنائی ہے۔''

''اچھا آپ اور آپ کی والدہ لے آئیں مجھے یہاں، پھر کیا ہوا؟''

آپ بیہوش تھے، اماں نے آپ کا ہاتھ دیکھا، بخار ہے۔ نبض ٹٹولی۔ کہا حالت نازک ہے۔ زخم دیکھے تو خون بہت نکل گیا ہے خدا خیر کرے، پھر انہوں نے جلدی جلدی آپ کے کپڑے اُتارے، پانی گرم کیا، سارے زخم دھوئے، جلدی جلدی مرہم سلیمانی تیار کیا۔ پھائے رکھے، پٹیاں کیں، اس کے بعد نہ جانے کس طرح کا عرق تیار کیا، وہ پلایا۔''

''لیکن میں بیہوش تھا، دانت بھی ضرور بیٹھ گئے ہوں گے۔''

''جی ہاں بیٹھ گئے تھے، اماں نے بڑی مشکل سے چمچے سے گھولے، پھر وہ عرق ٹپکایا، رات بھر ہم دونوں آپ کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اماں نے صبح پھر آپ کی نبض دیکھی۔ اور چہرے پر ایک نظر ڈال کر کہنے لگیں۔ ہوش ہو آ جائے گا لیکن یہ ہذیان ضرور بکے گا۔''

''لیکن میں تو ہوش میں ہوں اور اچھی خاصی باتیں کر رہا ہوں، ہذیان تو میں نے نہیں بکا۔''

''آپ کو کچھ خبر تو ہے نہیں۔''

''تو کیا کوئی اور بات بھی ہے؟''

''جی ہاں...... پہلی دفعہ جب آپ ہوش میں آئے تو اماں کا کہا سچ ثابت ہوا۔ ہذیان بکنے لگے۔''

''میں ہذیان بکنے لگا۔''

''جی ہاں بہت زیادہ۔''

''مثلاً کیا کیا...... کچھ یاد ہے آپ کو؟''

''(ہنستے ہوئے) یاد کیوں نہ ہوگا۔ میرے سامنے ہی کا تو واقعہ ہے۔ پہلے آپ نے میری اماں کو گھورا، پھر کہا۔''صورت سے تو بڑی بی تم بڑی نیک اور پارسا معلوم ہوتی ہو، لیکن ہو بڑی پہنچی ہوئی۔ تمہارے بیٹوں نے مجھے گھیرا اور حملہ کر دیا مجھ پر۔ لیکن میں نے بھی ہار نہیں مانی، دو کو تو وہیں ڈھیر کر دیا، تیسرے کو بھی قریب قریب ہلاک کر دیا خدا سے ڈرو، عاقبت کی فکر کرو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو اور یہ لچھن!......''

''استغفر اللہ!''

''پھر آپ نے خوفناک نظروں سے مجھے گھورا، اور کہنے لگے!''تو بھی شیطان کی خالہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن تو بھی ان بڑی بی کی طرح بوڑھی ہو جائے گی، پھر مر جائے گی، ذرا سوچ تو سہی، جب خدا کے سامنے جائے گی تو اپنے نامۂ اعمال کا کیا جواب دے گی۔ یہ ڈاکو وہاں تیرے کام نہ آئیں گے۔''

''توبہ! اس سے بدتر ہذیان اور کیا ہوگا؟''

''میں تو آپ کی باتیں سن کر سہم گئی تھی۔ لیکن اماں خوش ہو گئیں کہنے لگیں خدا نے رحم کیا۔ اب یہ اچھا ہو جائے گا۔ خطرہ ٹل گیا۔ بیچارے کی ماں کی کوکھ اجڑنے سے بچ گئی۔ غریب باپ کا عصائے پیری سے محروم نہیں ہوا...... اور واقعی اماں کی دعا قبول ہو گئی۔''

''دُعا!...... دُعا کیسی؟''

''آپ کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے نماز پڑھی، میں تو جلدی جلدی نماز پڑھ کر بستر پر آ کر لیٹ گئی، لیکن اماں کو رہ رہ کر آپ کی بے کسی اور بیماری کا خیال آتا تھا۔ نیند اُچٹ گئی، اماں مصلّے پر بیٹھی حسب معمول دیر تک نماز پڑھتی رہیں۔ یہ ان کا معمول ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد مجھ پر دعائیں دم کرتی ہیں۔ پھر کہیں سوتی ہیں۔ اُس روز پہلے آپ پر دم کیا اور پھر مجھ پر اور دیر تک آپ کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔ سچے دل سے جو دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ ہو گئی۔''

''اُنہوں نے میرے لئے یہ کچھ کیا، آپ نے مجھ سے یہ سلوک کیا؟ اور میں نے ایسی ایسی غیر شائستہ اور غیر شریفانہ باتیں کیں۔''

''تو کوئی جان بوجھ کر تھوڑے کہیں، آپ تو اس وقت بھی در حقیقت بیہوش تھے آدمی جب ہذیان بکتا ہے تو ہوش میں کب ہوتا ہے۔''

''لیکن آپ کی والدہ کہاں چلی گئیں، میں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کر لیجئے گا اطمینان سے شکریہ بھی ادا! ذرا ٹھیک تو ہو جایئے، وہ آپ کے لیے یخنی بنانے گئی ہیں۔''

''یخنی.....؟''

''جی ہاں صبح صبح خود چادر اوڑھ کر بازار گئیں، اور ایک چوزہ لے آئیں کہ یخنی سے ذرا طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ بڑا خوبصورت چوزہ تھا۔ مجھے تو اتنا اچھا لگا کہ جی چاہا پال لوں، بالکل کبوتر کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اماں نے بیچارے کے گلے پر چھری پھیر دی۔''

''مجھے بہت ہمدردی ہے آپ کے ساتھ، اگر میں ہوش میں ہوتا اُس وقت تو ہرگز ذبح نہ ہونے دیتا۔ بہرحال اب صبر کرنے کے سوا کیا چارہ ہے؟''

''لیکن اس دنیا کی ریت یہی ہے کہ موت دوسرے کی زندگی بن جاتی ہے۔ ایک کا زوال دوسرے کا عروج بن جاتا ہے۔ ایک کی تخریب سے دوسرے کی تعمیر ہوتی ہے ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ لہٰذا اس چوزے کے قتل کرنے کا ہم پر افسوس نہ کیجئے۔''

اتنے میں بڑی بی ایک پیالے میں یخنی لے کر آ گئیں۔ پیالے سے بھاپ اُٹھ رہی تھی آتے ہی انہوں نے پہلے تو بیٹی کو ڈانٹا۔

''کیا بک بک لگا رکھی ہے تو نے؟''

پھر بڑے شفقت اور پیار کے لہجے میں کہا: ''بیٹے پی لو تھوڑی سی یخنی۔''

مریض نے بڑی بی کو اس نظر سے دیکھا جس نظر سے کوئی سعادت مند اور محبت کرنے والا بیٹا اپنی ماں کو دیکھتا ہے۔ پھر اُس نے کوئی جواب دیے بغیر اُٹھنے کی کوشش کی، فوراً ہی بڑی بی ''ہاں ہاں'' کرتی اس طرح چیخیں کہ بیچارہ گھبرا گیا۔ کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ اور اُٹھنے کا ارادہ ترک کر کے پھر اُسی طرح دراز ہو گیا۔

بڑی بی نے کہا:

''بیٹے ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ ابھی کئی دن تک تمہیں جنبش تک نہ کرنی چاہیے، ورنہ زخم کھل جائیں گے اور کی کرائی محنت برباد ہو جائے گی۔''

مریض نے بے بسی کے ساتھ بڑی بی کی طرف دیکھا اور کہا:

''پھر پیوں گا کس طرح!''

بڑی بی نے بڑی محبت کے انداز میں کہا:

''میں پلاؤں گی، تم لیٹے رہو اسی طرح!''

پھر ماہ سے بولیں:

''میرا منہ کیا تک رہی ہو، چمچہ تو لا دو!''

ماہ چلی گئی اور ذرا دیر میں چمچہ لے کر آ گئی یخنی کا پیالا بڑی بی نے ماہ کے ہاتھ میں تھمایا اور خود مریض کے پاس بیٹھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے اُسے پلانے لگیں۔

چند چمچے پی کر اس نے منہ بند کر لیا اور اشارہ سے کہا۔''بس!'' لیکن وہ تو سارا پیالہ پلانے پر تلی ہوئی تھیں کہنے لگیں۔

''نہیں بیٹے! یہ سب تمہیں پینی پڑے گی، غذا ابھی دی نہیں جا سکتی، تمہیں اسی پر گزارہ کرنا پڑے گا دو چار دن!''

یہ کہہ کر پھر چمچے میں یخنی لے کر اس کے منہ میں انڈیل دی۔ اس نے بھی کوئی مزاحمت نہ کی اور پی گیا۔

ساری یخنی پلا چکنے کے بعد بڑی بی پیالہ لے کر واپس چلی گئیں۔ ماہ نے سوال کیا:

''کیسے مزے کی تھی؟''

مریض نے کہا:''بہت مزے کی۔''

ماہ نے کہا:

''آپ تو تکلف کرتے ہیں۔ یہ بتایئے بدمزہ تو نہیں تھی؟''

مریض نے مسکراتے ہوئے کہا:

''بالکل نہیں...... بھلا کوئی مزے دار چیز بھی بدمزہ ہو سکتی ہے؟''

(8)

بات میں بات

اتنی باتیں کرنے کے بعد مریض خاموش ہوگیا، ماہ نے جو پاس بیٹھی تھی خاموشی اختیار کر لی، تھوڑی دیر کے بعد بڑی بی آئیں، انہوں نے پوچھا۔

''بیٹے طبیعت کیسی ہے؟''

مریض نے کمزور آواز میں جواب دیا:

''اچھا ہوں، لیکن کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں، تھوڑی دیر سے؟''

بڑی بی نے قریب آ کر پھر ماتھا چھوا، پھر نبض دیکھی، اور فکر مند لہجے میں اپنے آپ سے کہا۔

''بدپرہیزی یا بداحتیاطی کا تو کوئی سوال ہی نہیں، پھر حرارت کیسے ہوگئی؟''

مریض نے تائید کی۔

''جی ہاں میں بھی حرارت محسوس کر رہا ہوں!''

بڑی بی نے گھور کر بیٹی کی طرف دیکھا اور دانت پیستے ہوئے کہا!

''میں سمجھ گئی، تو بھی برابر اس عرصے میں بک بک کرتی رہی ہوگی، اور (مریض کی طرف اشارہ کر کے) یہ بھی بولتا اور باتیں کرتا رہا ہوگا۔ یہ اسی کی تکان ہے۔''

مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا اقرار جرم کرلیا۔ بڑی بی نے اسے اچھی طرح سے چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا:

کوئی بات نہیں انشاءاللہ جلدی یہ حرارت جاتی رہے گی۔ لیکن بیٹے چندروز بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بات چیت میں بھی احتیاط چاہیے بہت کم بولو۔''

پھر وہ ماہ سے مخاطب ہوئیں:

''چلو تم تو اُٹھو یہاں سے!''

اس کے بعد پھر مریض سے کہا:

''بیٹے آنکھ بند کر کے لیٹ جاؤ، اور نیند آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ ایسے ہی پڑے رہو۔''

مریض نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ رہا، ماہ اپنی ماں کے ساتھ چپ چاپ گردن جھکائے چلی گئی۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر بڑی بی نے ایک مرتبہ پھر ماہ کو ڈانٹا، کہنے لگیں:

''کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ زیادہ بک بک نہ کیا کر، لیکن تو جب بولنے پر آئے گی تو نہ جانے کیا کیا بکتی رہے گی؟''

ماہ نے صفائی دیتے ہوئے کہا! ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

بڑی بی نے بیٹی کے الفاظ طنز کے ساتھ دہرائے:

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا...... جیسے میں بہری ہوں...... سُن ہی رہی تھی...... آخر ساری تفصیلات بتانے کی کیا ضرورت تھی اسے؟''

ماہ ندامت کے لہجے میں بولی۔

''تو کیا ہرج ہو گیا اماں! آخر بیچارے کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ سو جو کچھ پوچھتے گئے میں بتاتی گئی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تو نے ہذیان کا قصہ کیوں چھیڑ دیا؟''

''تو کیا غلط کہا میں نے کچھ؟''

''بالکل سچ کہا۔ لیکن ضرورت کیا تھی اس کی؟''

''میں تو ذرا سا ذکر کر کے خاموش ہو گئی تھی، خود انہوں نے کرید کرید پوچھا تو بتانا پڑا۔''

''کتنا شرمندہ ہوا ہو گا بیچارہ اپنے دل میں۔''

''ہاں شرمندہ تو تھے لیکن میں نے مطمئن کر دیا۔''

''تم نے مطمئن کر دیا، وہ کس طرح؟''

''میں نے کہا، ہذیان بکتے وقت آدمی کچھ ہوش میں تو ہوتا نہیں، اس کی باتوں کا کیا اعتبار؟''

''لیکن تم تو ہوش میں بھی ہذیان بکا کرتی ہو! اچھا اب میں تمہارے کپڑے سیتی ہوں بیٹھ کر، تم کھانا پکا لو، یا تم سیو بیٹھ کر میں پکا لوں جا کر۔ نہیں یہی ٹھیک ہے تم سیو، میں پکاتی ہوں، یخنی بھی تیار کرنی ہے۔ نہ جانے کیا کمال دکھا دو اپنا پکانے میں تو وہ بے چارہ مریض بھی دُعائیں دیتا رہ جائے تمہاری جان کو!''

ماہ کپڑے لے کر سینے بیٹھ گئی، اور بڑی بی باورچی خانے چلی گئیں۔

ماں بیٹی میں اگرچہ بہت آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن مریض نے ساری باتیں سُن لیں۔ صرف ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کا فاصلہ ہی تو تھا۔

کام کرتے کرتے جب ماہ کی طبیعت اکتائی تو اسے پیاس لگی۔ گھڑا اسی کمرے میں تھا جہاں مریض لیٹا تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی، آہستہ سے پانی انڈیلا، اور پھر ہولے ہولے قدم رکھتی واپس چلی، جب مریض کے بستر کے پاس پہنچی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پیاس لگی ہے...... کیا آپ زحمت کر سکیں گی؟''

ماہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کٹورے میں پانی بھر کر لے آئی۔

مریض نے ایک مرتبہ پھر اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن ماہ نے روکا۔

ایسا نہ کرو، اماں خفا ہوں گی...... لیٹے رہیے، میں پلائے دیتی ہوں۔''

پھر چمچے سے اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پلانا شروع کیا۔ اور سارا پیالہ پلا دیا...... کہنے لگی:

''بہت پیاسے تھے، آپ سارا کٹورا پی گئے۔''

مریض نے مدھم آواز میں جواب دیا:

''اور پیاس کا یہ حال ہے کہ اب تک تشنگی باقی ہے۔''

ماہ نے سوال کیا:

''تو کیا اور پئیں گے آپ؟''

وہ بولا:

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو، اگر آپ پلا سکیں!''

کٹورا لے کر ماہ پھر گھڑے کی طرف چلی، لیکن دو قدم چل کر رُک گئی۔ اور کچھ سوچنے لگی، مریض نے سوال کیا۔

''آپ جاتے جاتے رک کیوں گئیں، کیا سوچنے لگیں۔''

ماہ وہیں اور ویسے ہی کھڑے کھڑے بولی:

''اماں سے پوچھ آؤں پھر پلاؤں گی۔''

مریض نے متبسم ہو کر دریافت کیا:

''پانی پلانے میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ فکرمند لہجے میں گویا ہوئی،

''آپ اُن کا مزاج نہیں جانتے، وہ ذرا جلدی خفا ہو جاتی ہیں، نہ جانے زیادہ پانی پلانا وہ آپ کو مناسب سمجھیں یا نہ سمجھیں! میں پلا دوں اور وہ خفا ہو جائیں، اور خدانخواستہ آپ کو کسی طرح کا نقصان پہنچ جائے، تو ساری آئی گئی میرے ہی اوپر ہوگی...... نا بابا! بغیر پوچھے اب تو میں ایک گھونٹ بھی نہ پلاؤں گی۔''

مریض نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''اچھا، رہنے دیجئے، نہ پلایئے...... ہاں یہ تو بتایئے......''

ماہ نے مزید گفتگو کرنے سے اُسے روک دیا۔ اور خائف ہو کر باورچی خانہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''زیادہ باتیں نہ کرو، ورنہ حرارت پھر ہو جائے گی۔''

مریض نے خاموشی اختیار کر لی، مگر ذرا دیر بعد بولا۔

''نیند آتی نہیں، باتیں کرنے کی اجازت نہیں، پھر آخر کروں کیا، اس طرح تو وقت کٹنا بہت مشکل ہے۔''

ماہ نے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

''اچھا ایسا کیجئے آپ چپ چاپ لیٹے رہیے۔ صرف میں باتیں کروں گی آپ بس سنتے رہیے!''

اتنے میں بڑی بی اچانک آ گئیں!

''جی بخشیے...... آپ کو بھی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں...... جاؤ، اپنا کام کرو۔''

ماہ گردن جھکائے چلی گئی۔

بڑی بی نے کہا:

''بیٹے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں بہت بڑے خطرے سے بچا لیا، اگر ذرا بھی بد احتیاطی کرو گے تو خدانخواستہ پھر بیمار پڑ جاؤ گے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ توانا و تندرست ہو کر جلد از جلد اپنے گھر جاؤ۔''

یہ اپیل کارگر ہوئی اور مریض نے آنکھیں بند کر لیں۔

(9)

زخمِ دل

اجنبی کو کھنڈر میں رہتے ہوئے ایک مہینے سے زائد مدت گزر چکی تھی۔ اب وہ بالکل تندرست ہو چکا تھا۔ ماہ نے اور اس کی ماں نے جس خلوص اور محبت سے اس کی خدمت کی تھی اس کا گہرا نقش اس کے دل پر قائم ہو گیا تھا۔ اس مختصر سی مدت میں اس نے اچھی طرح ان لوگوں کی شرافت اور انسانیت کا تجربہ کر لیا تھا۔

آج اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب یہاں سے رخصت ہونا چاہیے۔ آخر یہ مہمانی کب تک چلے گی۔ وہ یہاں سے جانا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی چاہتا تھا۔ غیرت اور خودداری اکساتی تھی کہ چلو، لیکن دل کی خلش اور کسک روکتی تھی کہ مدتِ قیام کو جتنا زیادہ سے زیادہ طول دیا جا سکتا ہے دیا جائے۔ کئی دن اسی کشمکش میں گزر گئے، درحقیقت وہ ماہ سے محبت کرنے لگا تھا، وہ کون سی خوبی تھی جو ماہ میں نہیں تھی۔ لیکن دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں تو اتنا بتا دیا تھا کہ اس کا نام بختیار ہے۔ خلجی خاندان کا ایک فرد ہے۔ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں غزنی آ رہا تھا کہ رہزنوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اور زخمی ہو کر اس مہمان سرا کر میں آ کر پڑ رہا۔ پھر جو کچھ گزری وہ معلوم ہی ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی ماہ سے مختلف مواقع پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے معلوم کر لیا تھا کہ بڑی کا نام عاصمہ خاتون ہے۔ یہ سلطان غور سیف الدین کے سپہ سالار ابو العباس کی بیوہ ہیں۔ جس نے اپنے آقا کو اختلاف کی بنا پر قتل کر دیا تھا اور پھر اس پاداش میں وہ بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ساری املاک و جائداد ضبط کر لی گئی، اور اب اس کھنڈر میں یہ ماں بیٹی کچھ بچے کھچے زیورات کو بیچ بیچ کر زندگی کے دن پورے کر رہی تھیں۔

ایک دوسرے کے اتنے حالات معلوم ہونے کے باوجود مزید تحقیق و تجسس کی کسی میں بھی جرأت نہیں ہوئی۔ عاصمہ خاتون نے اب تک یہ سوال نہیں کیا تھا کہ آئندہ کے لئے اس کا کیا ارادہ ہے؟ وہ سوچتی تھیں اور ٹھیک سوچتی تھیں کہ اس طرح کا بالکل ذاتی سوال کرنے کا مجھے حق نہیں ہے، اور ہو بھی تو اسے استعمال کرنا مناسب نہیں ہے میرا شوہر ایک سنگین جرم میں موت کے گھاٹ

اتارا جا چکا ہے۔ اگر بادشاہ یا اہلِ دربار کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا کچھ تعلق ہم بدنصیبوں سے بھی ہے، یہ ہمارے ہاں رہتا ہے، تو ممکن ہے یہ بھی معتوب قرار دیا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ملازمت پائے جیل بھیج دیا جائے اور بختیار یہ سوچتا تھا کہ ایک اجنبی شخص کو جس بارے میں اس کھنڈر کے مکین بالکل نہیں جانتے کہ کون ہے؟ اور کس طرح کا آدمی ہے، یہ حق نہیں کہ ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر وہیں ڈیرے ڈال دے اور ان کی شریف، خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی سے محبت کا اظہار شروع کر دے......!

کئی دن تک یہ ذہنی کشمکش قائم رہی۔

لیکن آج بختیار نے فیصلہ کر لیا کہ اب صورتِ حال ختم ہونی چاہیے۔ اب یہاں سے بستر اٹھانا چاہیے!

کسی کام سے ماہ اس طرف آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بختیار سر وسامانِ سفر ٹھیک کر رہا ہے۔ کچھ دیر تک تو وہ مبہوت کھڑی رہی، پھر اس نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا:

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''سامان سفر ٹھیک کر رہا ہوں۔''

ماہ نے سوال کیا:

''کیا آپ ہمارے ہاں سے جا رہے ہیں؟

بختیار نے کہا:

''ہاں ماہ جا رہا ہوں، کب تک یہاں ڈیرا ڈالے پڑا رہوں، کب تمہارا ناخواندہ مہمان بنا رہوں۔''

ماہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''شاید ہم آپ کو آرام نہیں دے سکے، کاش ہم اس قابل ہوتے۔''

ماہ کے آنسو دیکھ کر اور اس کے یہ الفاظ سن کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایسا نہ کہو ماہ...... یہاں مجھے وہ آرام ملا ہے جو گھر میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو گھر کا آرام یہاں آکر زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے جانا ہے کہ کیا ہوتا ہے!......میری ماں کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ماں کو

ایک ظالم فرماں روا کی حیثیت میں دیکھا جسے مجھ پر کبھی ترس نہیں آتا تھا، جو مجھ سے ہر وقت کام لیتی رہتی تھی۔ جس نے مجھے ہر وہ تکلیف پہنچائی جو اس کے بس میں تھی۔ باپ نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ مجھ سے شفقت کا اظہار نہیں کیا۔ میرے ساتھ محبت کا برتاؤ نہیں کیا۔ میرے سوتیلے بھائیوں اور بہنوں پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اوپر ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ سپہ گری کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ ایک دن دل میں ترنگ اُٹھی کہ غزنی چل کر قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ شاید کچھ بن جاؤں۔ پھر تمہارے ہاں جس طرح آیا وہ جانتی ہی ہو۔ یہاں آ کر میں نے جانا کہ گھر کیا ہوتا ہے۔ یہاں آ کر مجھے محسوس ہوا کہ ماں کیا چیز ہوتی ہے؟ یہاں آ کر میں نے جانا کہ محبت اور شفقت کسے کہتے ہیں؟

یہ کہتے کہتے بختیار کا گلا رندھ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کچھ اور کہنا چاہا تھا کہ ماہ نے پھر سوال کیا؟

''پھر بھی آپ جا رہے ہیں؟''

اس نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اور......اور یہیں، میں نے......اور یہیں میں نے......!!''

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا، ماہ نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''کہیے نا کیا کہنا چاہ رہے تھے ابھی آپ؟''

اور پھر ایک عجیب خود فراموشی کے عالم میں بختیار نے کہا:

''یہیں میں نے تمہیں پایا......تمہیں؟''

یہ کہہ کر وہ ذرا سا رکا، پھر گویا ہوا۔

''میں یہاں زخمی ہو کر آیا تھا اور زخمی ہی ہو کر جا رہا ہوں، وہ زخم جو میرے سر پر، ماتھے پر دست و پا پر لگے تھے مرہم سلیمانی کے اعجاز سے اچھے ہو گئے۔ لیکن وہ زخم......وہ زخم جو میرے دل پر لگا تھا نہ وہ اچھا ہوا ہے نہ اچھا ہو گا، بدن کے زخم میں ہر ایک کو دکھا سکتا تھا، لیکن دل کا زخم کسے دکھاؤں؟

پھر کچھ سوچ کر اس نے حسرت اور بے کسی کے ساتھ کہا:

''ماہ معاف کرنا، نہ جانے میں کیا کہہ گیا۔ شاید ایسی باتیں مجھے نہ کرنی چاہیے تھیں۔ لیکن میں مجبور تھا۔ ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے! کیوں ماہ کیا مجھے معاف کر دو گی؟ میں

یہاں سے اس طرح نہیں جانا چاہتا کہ تم خفا ہو۔''

ماہ نے نظریں نیچی کر کے کہا۔

''میں تو آپ سے ذرا بھی خفا نہیں ہوں، میرا بس چلتا تو آپ کو روک لیتی، نہ جانے دیتی۔''

یہ کہتے کہتے ماہ کا گریہ گلو گیر ہو گیا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ بختیار نے بے قابو ہو کر کہا:

خدا کے لیے ایسا نہ کرو ماہ۔ اگر جاتے وقت میں نے تمہیں مسکراتے نہ دیکھا تو یہاں باہر نکلتے ہی کسی پتھر سے سر پھوڑ لوں گا۔ اور خودکشی کر لوں گا، میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں خوش اور ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔

ماہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

بختیار پھر اپنے سامان کی طرف متوجہ ہونے لگا۔

''اگر اجازت دو تو یہاں سے جانے کے بعد کبھی کبھی آجایا کروں، صرف ایک نظر تمہیں دیکھ لینا بھی میری روح اور قلب کے لئے سرمایۂ صد ہزار نشاط و مسرت ہے۔''

ماہ نے جواب دیا:

''یہاں سے جانے کے بعد پھر شاید آپ کبھی یہاں نہیں آسکیں گے۔''

بختیار نے حیرت سے ماہ کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''کیوں، کیا کبھی کبھی بھی میرا آنا تم کو پسند نہیں کرتیں؟''

جواب میں کچھ سوچتے ہوئے ماہ نے کہا۔

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے، ابھی کہہ چکی ہوں کہ اگر میرا بس چلتا تو آپ کو جانے ہی نہ دیتی یہاں سے...... لیکن یہاں سے جا کر آپ سرکاری ملازمت کریں گے۔ اور بھلا سرکاری ملازم بھی ہم بدنصیبوں اور معتوبوں کے گھر میں قدم رکھ سکتا ہے۔''

بختیار نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماہ ایسی بات نہیں ہے، اگر مجرم تھے تو تمہارے والد تھے، تمہاری یا تمہاری والدہ کی کیا خطا ہے...... ایسا اندھیر سلطان شہاب الدین سے دور میں تو نہیں ہو سکتا......''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عاصمہ خاتون آگئیں، انہیں دیکھتے ہی ماہ نے کہا:

''اماں یہ جا رہے ہیں ہمارے گھر سے!''

(10)
حاکم کا فیصلہ

عاصمہ خاتون نے ایک نظر بختیار کے سامان پر ڈالی اور ایک نظر اس کے چہرے پر۔
پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''اکتا گئے بیٹے ہم لوگوں سے؟...... اچھا سدھارو، خدا تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

بختیار عاصمہ خاتون کی ان باتوں سے بہت متاثر ہوا۔

اس نے کہا۔

ایسا نہ کہیے، اتنا بڑا ظلم نہ کیجئے مجھ پر۔ میں آپ سے اکتا سکتا ہوں، کیا آپ نے اتنا بڑا احسان فراموش سمجھ لیا ہے مجھے؟ کیا دنیا سے انسانیت اتنی اٹھ گئی ہے کہ آپ کی محبت، شفقت غرضیکہ ہر چیز کو نظر انداز کردوں گا...... یقین رکھیے زندگی کی آخری سانس تک میں آپ کا بندۂ احسان رہوں گا، آپ نے مجھے نئی زندگی دی آپ ہی کے پاس آ کر میں نے جانا کہ مہر مادری کیا چیز ہوتی ہے۔ اس گھر میں، اس کھنڈر میں پہلی مرتبہ میں، یقین کیجئے، زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ گھر کیا ہوتا ہے؟ گھر کا چاؤ پیار کیا ہوتا ہے؟ گھر کی زندگی کیسی ہوتی ہے! گھر کا سکھ کیا ہوتا ہے؟ جس جگہ مجھے اتنی نعمتیں ملی ہوں، جہاں میں نے اتنی دولت پائی؟ جس دامن میں مجھے سب کچھ مل گیا، اس سے کس طرح اکتا سکتا ہوں؟''

بختیار کی اس طویل تقریر سے عاصمہ خاتون کافی متاثر ہوئیں، انہوں نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا:

''پھر یوں یکا یک جانے کے کیا معنی؟...... اگر کسی وجہ سے جانا ضروری ہی تھا، تو ذکر تو کیا ہوتا یا بات تو ڈال دی ہوتی میرے کان میں؟...... کل تک تمہارے دم سے اس گھر میں رونق تھی، زندگی تھی...... آج یوں یک بیک چلے جاؤ گے تو تمہارے ساتھ یہ رونق بھی چلی جائے گی اور زندگی بھی چلی جائے گی، وہ خوشی بھی چلی جائے گی، پہلے سے معلوم ہوتا تو اس حادثے کو برداشت

کرنے کے لیے، ہم اپنے آپ کو آمادہ تو کر لیتے؟''

ماہ اب تک خاموش ماں کی اور بختیار کی باتیں سُن رہی تھی، وہ بھی بول پڑی:

''اور کیا...... یہ بھی کوئی بات ہوئی؟...... بڑے وہ ہیں آپ بھی؟''

بختیار مسکرانے لگا، وہ پھر بیٹھ گیا، اس نے کہا:

''بہت بہتر نہیں جاتا۔''

ماہ خوش ہوگئی، لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے بختیار کو دیکھا، اور بے ساختہ کہہ اُٹھی:

''ہوں...... جیسے سچ مچ!''

بختیار نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

عاصمہ خاتون بھی اس فیصلے سے خوش ہوگئیں۔

''بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ ایک مدت سے میرا دل بھول چکا ہے کہ خوشی کسے کہتے ہیں۔ لیکن آج وہ پھر خوش ہے۔''

ماہ نے اور زیادہ خوش ہو کر بختیار کی طرف دیکھا اور بولی:

''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ نے ہماری اماں کو خوش کر دیا۔ بہت دنوں کے بعد میں نے انہیں مسرور دیکھا ہے۔''

بختیار نے ماہ کو دلاسہ دیتے ہوئے جواب میں کہا:

''انشاءاللہ وہ ہمیشہ خوش رہیں گی، غم کبھی ان کے پاس نہیں پھٹکے گا۔''

عاصمہ خاتون نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بہر حال ایک نہ ایک دن تمہیں اس گھر سے رخصت ہونا ہے۔ نہ تم ہمیشہ یہاں رہ سکتے ہو، نہ ہم اس کی تمنا کر سکتے ہیں۔''

ماہ پھر بیچ میں بول پڑی،

''اماں جی یہ تمنا ہم کیوں نہیں کر سکتے، آخر کیوں؟''

عاصمہ خاتون نے بیٹی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بختیار سے کہا:

''تم یہاں قسمت آزمائی کے لئے آئے ہو، اور تمہیں اپنے فرض سے ہرگز غافل نہیں

ہونا چاہیے۔لیکن ان چند دنوں میں تم سے مجھے محبت سی ہوگئی ہے۔ جیسے میں نے ایک بیٹا پالیا ہو، میری خواہش تو یہ ہے کہ فی الحال یہیں رہو۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ گو تم تندرست ہو گئے ہو اور ماشاءاللہ خون آ گیا ہے چہرے پر لیکن ابھی تک کمزور ہو۔ کھانے پینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔کمزوری دور ہو جائے، پھر اگر پانی بھی پیو گے تو اس کا خون بنے گا۔ ماشاءاللہ نوجوان ہو!''

بختیار نے محبت بھری نظروں سے عاصمہ خاتون کی طرف دیکھا، اور گویا ہوا!

''آپ ٹھیک کہتی ہیں...... کاش آپ میری ماں ہوتیں، کاش میں آپ کا بیٹا ہوتا۔ کاش میں بھی آپ کے قدموں سے جدا نہ ہوسکتا۔ کاش!''

عاصمہ خاتون نے ایک خاص تاثر کے عالم میں کہا:

''تو میرے بچے...... میں تو تجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتی ہوں، اور جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے تو بھی میرے ساتھ وہی برتاؤ رکھتا ہے جو ایک بیٹے کا ایک ماں کے ساتھ ہوسکتا ہے...... ہوتا ہے۔''

سرپنچ کی حیثیت سے ماہ نے فیصلہ کر دیا۔

''تو پھر جھگڑا کاہے کا؟ چلئے آپ ماں، یہ بیٹے۔لیکن جانے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہیں رہیں اور ملازمت تلاش کرتے رہیں۔ جب ملازمت مل جائے گی پھر دیکھا جائے گا کہ اب کہاں رہیں؟ میرے خیال میں اس کے بعد بھی یہاں قیام کرنے میں کچھ حرج نہیں۔''

یہ باتیں ماہ نے کچھ ایسے لب و لہجے میں کہیں کہ بے تحاشہ عاصمہ خاتون اور بختیار دونوں کو ہنسی آ گئی، بختیار نے کہا:

''بہت اچھا جناب، آپ کا فیصلہ منظور ہے۔''

عاصمہ خاتون بولیں:

''تو نے اس طرح فیصلہ کر دیا جیسے کوئی عدالت دو ملزموں کا فیصلہ کرتی ہے۔''

بختیار ہنسنے لگا...... اُس نے کہا:

''دیکھ لیجئے آپ ہی۔''

بختیار کو منہ مانگی مراد مل گئی تھی!...... اس نے وہ پالیا تھا جو اس کی آرزو تھی۔ اپنے آبائی گھر میں حقارت، نفرت، اور تشدد کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے والا یہ نوجوان جب سے اس گھر میں آیا تھا، ایک نئی فضا اور نئے ماحول نے اس کا خیر مقدم کیا۔ عاصمہ

خاتون کی شفقتیں دیکھ دیکھ کر وہ سوچنے لگا تھا، ایک ماں اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہے جو بوڑھی نیک دل، اور سراپا ایثار عورت کر رہی تھی، ماہ کا برتاؤ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے، جہاں صرف خوشی ہے، مسرت ہے، نشاط ہے، لازوال سرور کا خزانہ ہے۔ ایسی پر بہار دُنیا، جہاں صرف پھُول ہیں، کانٹا ایک بھی نہیں، جہاں محبت ہے، نفرت نہیں، جہاں چاہت ہے! بیگانگی نہیں!

وہ سوچا کرتا تھا، جو چیز اسے سگا باپ نہ دے سکا، وہ اس گھر میں مل گیا، اور کتنی آسانی سے، جیسے اس کا انتظار ہو رہا تھا کہ وہ آئے اور خلوص و محبت کے موتی اس پر نچھاور کر دیے جائیں، وہ اپنی خوبی قسمت اور بخت رسا پر ناز کرنے لگتا تھا!

اب تک جتنی کلفتیں اور تکلیفیں اس نے اپنے گھر میں، اپنے باپ کے گھر میں، اپنے خاندان میں اُٹھائی تھیں، وہ سب فراموش ہوگئی تھیں، عاصمہ خاتون اور ماہ کے وجود نے اسے ہر غم سے آزاد کر دیا تھا۔

ملتے ہی ان کے بھُول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

اس نئی دنیا نے، اس نئے گھر نے اسے اتنا مسحور کر لیا تھا کہ اگر تلاشِ معاش کی فکر نہ ہوتی، وہ ایک گوشہ نشین عابد کی طرح ساری زندگی اس خانقاہ میں بسر کر دیتا۔

لیکن اسے کام کرنا تھا، محنت کرنی تھی، رزق کمانا تھا، صرف اپنے لئے نہیں..... عاصمہ خاتون کے لیے بھی، ماہ کے لیے بھی، ان کی یہ دُکھ کی زندگی صرف اس کی قوت بازو ہی سے رفع ہو سکتی تھی، اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ، ہر قیمت پر، جان جوکھوں میں ڈال کر، وہ اتنا کمائے گا کہ اس گھر کو سیم و زر سے پاٹ دے گا......!

سپاہی کی تلوار

یہ ہستی دُشمن کے لئے سیل فنا ہے
یہ برقِ جہاں سوز یہ قہر خُدا ہے

(1)

امتحان

بختیار عاصمہ کے گھر رہنے لگا، تلاشِ معاش کی فکر تھی، صبح کو جاتا شام کو آتا، کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دربارِ شاہ تک رسائی ہو جائے۔لیکن ایک معمولی نوجوان کا وہاں تک بغیر کسی استحقاق یا ذریعے کے پہنچنا آسان نہ تھا جو کچھ گھر سے لے چلا تھا وہ راستے میں قزاقوں کی نذر ہو گیا تھا۔ جیب بالکل خالی تھی، جب سے یہاں آیا تھا بے بضاعتی، غربت اور پریشانی کے باوجود سارے مصارف عاصمہ خاتون خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کر رہی تھیں، لیکن آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ بیشک عاصمہ خاتون سارے مصارف خندہ جبینی سے برداشت کر رہی تھیں لیکن وہ نکھٹو بن کر کب تک ان کی دریا دلی سے فائدہ اٹھاتا رہتا۔ یہی خیال تھا جو اُسے صبح سے لے کر شام تک پریشان رکھتا، بادشاہ کے دربار میں رسائی سے مایوس ہو کر اُس نے غزنی کے بعض دوسرے امراء و رؤساء کی خدمت میں حاضر ہو کر کوئی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ٹکا سا جواب ملا۔ کوئی بھی ایک انجان شخص کو جو پردیسی بھی تھا، یعنی کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا ملازم رکھنے پر تیار نہیں تھا۔

ایک روز تھکا ہارا پریشان حال اور آشفتہ خاطر، دل گرفتہ اور ملول و مغموم واپس آیا۔ ماہ نے اس کی پیشوائی کی، جب وہ منہ ہاتھ دھو چکا تو اس نے پوچھا:

''کیا کھانا لاؤں؟''

بختیار نے افسردہ اور غمگین لہجے میں جواب دیا:

''نہیں ماہ...... میں کھانا نہیں کھاؤں گا، ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔''

ماہ نے ذرا پریشان ہوتے ہوئے سوال کیا:

''کیوں بھوک نہیں ہے؟''

بختیار نے ذرا جھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

''نہیں ہے۔''

ماہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بہت مغموم اور دل گرفتہ نظر آیا۔ اس نے پوچھا:

''آخر بات کیا ہے؟ کیا کسی سے لڑ کر آئے ہیں؟ یا خدانخواستہ کچھ طبیعت خراب ہے؟''

بختیار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''نہیں ماہ...... نہ کسی سے لڑ کر آیا ہوں نہ طبیعت خراب ہے۔''

اس منطق پر اُسے یقین نہ آیا، بولی:

''نہ آپ کسی سے لڑ کر آئے ہیں نہ طبیعت خراب ہے، پھر بھی بھوک نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ آپ کو کھانا پڑے گا!''

یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔ اور ذرا دیر میں، کھانے کا خوان لے کر آموجود ہوئی، بختیار نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

''بہت مجبور کر دیتی ہو۔''

''اچھا اچھا، کھائیے۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا: ''تم مجبور کرتی ہو، کھالوں گا، لیکن۔''

کچھ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا، وہ کسی حد تک اشتیاق کے ساتھ گویا ہوئی:

اس نے لقمہ توڑ کر مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا:

''کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... اتنے دن یہاں آئے ہوئے ہو گئے مگر دربارِ سلطانی میں نہ پہنچ سکا، سوچا، وہاں نہیں تو کہیں اور قسمت آزمائی کروں کسی امیر و رئیس کے ہاں ملازمت کرلوں۔ لیکن جہاں گیا صاف انکار، ایک اجنبی اور پردیسی کو رکھنے پر کوئی بھی تیار نہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے نہ میرا کوئی ضامن ہے نہ واقف کار کس بھروسے پر کوئی نوکر رکھ لے!''

''تو میں سمجھ گئی کہ ابھی تک ملازمت نہیں ملی، لیکن آپ اس قدر ہراساں و پریشان کیوں ہیں یہ بتایئے؟''

''کیا اس کے بعد بھی کچھ بتانے کی ضرورت ہے؟''

''آپ نے بتایا ہی کیا ہے؟''

''سوچتا ہوں یوں کب تک کام چلے گا...... تم لوگوں کی مالی حالت کیا ہے؟ یہ بات اب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرا فرض تھا کہ کماتا اور لاکر سامنے رکھ دیتا۔ نہ کہ صورت حال یہ ہے کہ کماتا ایک پیسہ نہیں اور کھاتا ڈٹ کے ہوں۔''

''تو پھر کیا فاقہ کرنا چاہیے۔ اوہو میں سمجھ گئی، اس لیے بھوک نہیں لگ رہی تھی آپ کو؟''

''ہاں تم ٹھیک سمجھی تھیں۔ اس پریشانی نے میری بھوک، میری نیند اُڑا دی ہے ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے، کھانے بیٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے زہر کھا رہا ہوں۔''

''ہر پھر کر بات وہیں آتی ہے کہ آپ ہمیں غیر سمجھتے ہیں، تکلف کرتے ہیں۔''

''نہیں ماہ، خدا گواہ ہے، یہ بات نہیں ہے۔ اس گھر کو میں اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ تمہاری والدہ سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی ایک بیٹے کو ہونی چاہیے۔ اور تم تو میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہو، لیکن اس کے باوجود اپنی بے بسی اور بے زری پر دل کڑھتا ہے۔ طبیعت اسے گوارا نہیں کرتی کہ نکھٹو بن کر روٹیاں توڑتا ہوں۔ تم اپنی ماں کی لڑکی نہ ہوتیں لڑکا ہوتیں اور محنت مشقت کر کے کماتی ہوتیں تو برس بھر بھی اگر بیکار رہتا تو پرواہ نہ کرتا، خوب ڈٹ کر کھاتا، لیکن ایک پریشان حال بیوہ کی شرافت اور محبت سے اتنا ناجائز فائدہ اٹھانے پر میرا دل نہیں راضی ہوتا میرا ضمیر مجھے ٹوکتا ہے۔ صرف ٹوکتا ہی نہیں ملامت بھی کرتا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تھوڑی سی جو پونجی باقی رہ گئی ہے اگر یہ ختم ہوگئی تو کیا ہوگا؟''

''پھر ہمارے ساتھ آپ بھی فاقے کیجئے، پھر بے شک میں اصرار نہیں کروں گا کہ کچھ تناول فرمایئے، لیکن جب تک دال دلیا موجود ہے، جب تک ہم کھا رہے ہیں آپ کو بھی کھانا پڑے گا۔ آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی، اماں بھی نہیں کھائیں گی، آخر اس تماشے سے کیا فائدہ ہے! آدمی کا کام یہ ہے کہ کوشش کرے، میں جانتی ہوں اور دیکھتی ہوں آپ شبانہ روز کوشش کر رہے ہیں۔ میں اس سے روکتی نہیں کرتے رہیے، جب خدا روزگار کی کوئی صورت پیدا کردے تو بیشک آپ کھلایئے۔ ہم کھائیں گے، لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا۔

''روٹیاں توڑ تا رہوں؟''

''اور کیا......توڑیئے پھر آپ سوچنے لگے کچھ؟''

بختیار نے کوئی جواب نہیں دیا، اور چپ چاپ گردن جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ماہ بیٹھی مکھیاں جھلتی رہی۔ جب وہ فارغ ہوا تو برتن اٹھا کر چلی گئی۔

ماہ کے اصرار سے بختیار نے کھانا کھا تو لیا۔لیکن اس پر پریشانی اور فکر کا جو بوجھ تھا وہ بدستور قائم رہا۔طبیعت بجھی بجھی سی تھی۔ ذرا دیر میں ماہ پھر واپس آ گئی۔ اس نے چھیڑتے ہوئے کہا:

''پھر سوچنے لگے آپ؟''

''وہ چونک پڑا''

''نہیں سوچ تو نہیں رہا ہوں کچھ بھی۔''

وہ اصرار کرتی ہوئی بولی:

''چھپایئے نہیں، کچھ نہ کچھ ضرور سوچ رہے تھے۔''

وہ مسکراتا ہوا بولا:

''یہ سوچ رہا تھا اگر قسمت نے مجھے اس گھر میں نہ پہنچا دیا ہوتا تو میرا کیا حشر ہوتا! اگر تم میری ان داتا نہ بن گئی ہوتیں تو میں کیا کرتا؟''

''ایسی غیر ضروری باتیں سوچنے کا وقت نہ جانے آپ کہاں سے نکال لیتے ہیں۔ آج آپ کہاں کہاں گئے تھے؟''

ایک جگہ ہو تو بتاؤں، کئی جگہ گیا، لیکن جہاں گیا صاف جواب پایا، لہٰذا جیسا گیا تھا ویسا ہی آ گیا۔''

''کل کہاں جائیں گے؟''

''ہر شان دار حویلی کے پھاٹک پر دستک دوں گا، لیکن ہو گا وہی جواب تک ہوتا آیا ہے یعنی کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔ میں عرض مدعا کرونگا، اور نہایت خشک لہجے میں جواب دیا جائے گا۔

''کوئی دوسرا گھر دیکھئے۔''

''(دل دہی کے لہجے میں) نہیں، ہر روز ایسا نہیں ہو گا۔ خدا اپنے نیک اور اچھے بندوں

کا امتحان لیتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو انعامات سے نوازتا ہے۔''

''ہاں سنا تو میں نے بھی ہے...... لیکن میرا معاملہ کچھ عجیب سا ہے۔ جب سے ہوش کی آنکھیں کھولی ہیں امتحان کے دور سے گزر رہا ہوں ختم ہی نہیں ہو چکتا کسی طرح۔ وہ کونسی تکلیف اور اذیت تھی جو اپنے گھر میں، اپنے باپ کے گھر میں، اپنے باپ کی موجودگی میں نہیں اُٹھائی، وہاں سے بھاگا تو راستے میں قزاقوں نے امتحان لینا شروع کر دیا۔ اس امتحان میں جان پر بن آئی، گھوڑا اگر نہ بھاگ کھڑا ہوتا تو جان کے جانے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ پھر تمہارے گھر کے دروازے پر گرا۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی!''

''میں نے نہیں، اماں نے۔''

''ہاں انہوں نے بھی...... انہوں نے جسم کے زخم پر پھایا رکھا۔ تم نے دل کے زخم پر مرہم رکھا۔ میں دونوں کا ممنون ہوں۔ دونوں ہی نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ زخمی ہو کر آپ کے دروازے کے سامنے گرنا، موت و زیست کی کش مکش میں گرفتار ہونا، کیا یہ بقول تمہارے خدا کی طرف سے امتحان نہیں تھا؟''

''کیوں نہیں تھا؟...... تھا۔''

''جوں توں کر کے اس امتحان میں کامیاب ہوا اور اب بیکاری اور بیروزگاری کے امتحان سے دوچار ہو رہا ہوں۔ دیکھئے اس کا سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے۔''

ماہ ہنسنے لگی، اس نے کہا:

''بہت باتیں بنانا آ گئی ہیں آپ کو۔''

(2)

حادثہ

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عاصمہ خاتون تشریف لائیں۔ انہوں نے ماہ سے کہا:

''لڑکی کیوں مجھے پریشان کرتی ہے۔ گھر میں پانی کا ایک قطرہ نہیں ہے اور تو یہاں بیٹھی گپ شپ کر رہی ہے...... شاباش جاؤ پانی لے آؤ، پھر اطمینان سے جتنی دیر چاہنا بک بک کرتی رہنا۔''

بختیار کھڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا، اس نے کہا:

''یہ کیوں جائیں گی پانی لینے۔ میں کس مرض کی دوا ہوں...... ابھی لایا۔''

ماہ نے جاتے جاتے کہا۔

''کہیں ایسا غضب نہ کیجئے گا، پھر میری عادت بگڑ جائے گی۔''

اور قبل اس کے کہ بختیار مزید اصرار کر سکے، وہ ایک ادائے دلفریب کے ساتھ مڑی، اور گھڑا اُٹھایا اور روانہ ہو گئی۔

ماہ کے جانے کے بعد عاصمہ خاتون اپنے کام کاج میں لگ گئیں۔ اور بختیار چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ کر اپنے حال اور مستقبل پر غور کرنے لگا۔ لیٹے لیٹے طبیعت گھبرائی تو سوچا، یہاں پڑے رہنے سے کیا حاصل، جاؤں اور ادھر ادھر ٹہل آؤں جا کر، ممکن ہے طبیعت بہل جائے اور فکر کا بوجھ کم ہو۔ چنانچہ وہ اٹھا اور عاصمہ کو بتائے بغیر باہر چلا گیا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ اس تالاب پر پہنچا جہاں سے ماہ پانی بھرا کرتی تھی۔ یہاں اس نے دیکھا گھڑا تو رکھا ہوا ہے لیکن وہ خود غائب ہے۔ پہلے تو خیال ہوا ممکن ہے کسی کے ساتھ کہیں آس پاس ٹہلنے چلی گئی ہو، لیکن کوئی دوسرا گھڑا نہیں تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ کوئی سہیلی بھی نہیں تھی۔

پھر وہ کہاں گئی؟

خیال آیا اسے پھولوں کا بہت شوق ہے۔ ممکن ہے پھول توڑنے چلی گئی ایک روز کہہ بھی رہی تھی۔ اس جنگل کو پار کرنے کے بعد ایک باغ آتا ہے، وہاں بڑے اچھے اچھے پھول ہیں۔

لیکن سورج غروب ہو رہا ہے۔ اتنے ناواقف اس بھیانک جنگل سے گزر کر باغ تک جانے کے کیا معنی! نہیں وہ وہاں گئی ہے۔

پھر کہاں ہے؟

گھڑا چھوڑ کر کہاں چلی گئی؟

کہیں کوئی افتاد تو نہیں پیش آ گئی؟

کسی حادثہ سے تو نہیں دوچار ہوگئی؟

کہیں اس تالاب میں غرق تو نہیں ہوگئی! ممکن ہے پاؤں پھسل گیا ہو! اور ڈوب گئی ہو.....نہیں یہ بھی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ وہ تیرنا اچھی طرح جانتی ہے خود اُس نے بتایا تھا کہ ہماری حویلی میں ایک تالاب تھا اور ہم اس میں تیرا کرتے تھے اماں جی تو کہا کرتی تھیں ماہ تو مچھلی کی طرح تیرتی ہے۔

''پھر وہ کہاں گئی؟''

''پھر یہاں گھڑا رکھ کر کدھر نکل گئی وہ؟''

ضرور کوئی خاص بات ہے۔

ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔

اتنے میں ایک چیخ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

یہ چیخ قطعاً ماہ کی تھی۔

وہ دیوانہ وار جنگل کی طرف لپکا اور چند ہی قدم جانے کے بعد اندازہ ہوگیا کہ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ واقعی حادثہ پیش آیا تھا۔

جنگل کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ پُرانے زمانے کی ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری میں دو آدمی ماہ کو جکڑے کھڑے ہیں، سامنے ایک آدمی جو اپنے لباس سے ایک سرکاری ملازم معلوم ہوتا تھا۔ نہایت شان سے کھڑا ہے، اس کے پاس ایک شاندار اور خوبصورت گھوڑا ہے جس کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے، اور وہ اس سے کہہ رہا ہے۔

''تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا؟''

ماہ نے جواب دیا۔

''نہیں جاؤں گی، تو نمک حرام ہے، بے ایمان ہے۔ کمینہ ہے، تجھے اس طرح کی

باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مجھے چھوڑ دو اور خدا کے غضب سے ڈرو۔''

اس آدمی نے ایک قہقہہ لگایا۔

''خدا کا غضب تو تمہارے خاندان پر نازل ہوا ہے، مجھے کیوں ڈراتی ہو اس سے۔''

بے بسی کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ماہ نے کہا:

''کیا تو میرے ابا کی زندگی میں اس طرح کی گستاخی کر سکتا تھا! کیا ان کی زندگی میں وہ تو ہی نہ تھا جو ہر وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑ......!''

اس آدمی نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوا۔

ہاتھ باندھنے کا جہاں تک تعلق ہے۔ اب بھی اس کے لیے تیار ہوں۔ بلکہ وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر تمہارے سامنے ہاتھ باندھے ہی حاضر ہوا کروں گا۔ رہا تمہارے ابا جان کے زمانے کا ذکر تو اسے چھوڑو بے شک میں ان کا ملازم تھا، لیکن اب تو میں سلطانِ وقت کا خادم خاص ہوں، پہلے میری حیثیت ایک معمولی آدمی کی تھی، اب میرے نام سے بڑے بڑے ڈرتے اور لرزتے ہیں۔ پہلے میں غریب تھا اب دولت مند ہوں، پہلے میں تمہارے قابل نہیں تھا، اب ہوں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں آج سارے غزنی میں منصور کا ڈنکا بجتا ہے، بڑے بڑے امراء اور روساء اسے فخر سمجھتے ہیں کہ اسے اپنا داماد بنالیں، لیکن منصور کے دل میں مدت سے ایک تصویر بسی چلی آ رہی ہے، وہ اسی کا پجاری ہے۔ وہ اسی کو حاصل کر کے رہے گا۔''

ماہ اس سے زیادہ نہ سن سکی، اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا:

''او نمک حرام چپ ہو جا، تیری یہ گستاخی میں نہیں برداشت کر سکتی۔''

منصور نے پھر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا:

''گستاخی!...... ماہ کیا تم خواب دیکھ رہی ہو، اسے نہ بھولو کہ اب تم ایک بھکارن ہو۔ جس کے پاس نہ دولت ہے نہ سرمایہ، نہ گھر نہ در، نہ زیور۔ نہ پارچات، وہ زمانہ لد گیا جب تم پھولوں میں تلتی تھیں۔ جب ہیرے جواہرات کے زیور زیب بدن کرتی تھیں، جب مشروع اور کم خواب کا لباس استعمال کرتی تھیں، اب تم فاقہ مست ہو، دیکھ لو یہ گورے گورے نازک ہاتھ چوڑیوں تک سے محروم ہیں۔ اپنے لباس پر نظر ڈالو، کیا بھکارنوں کا لباس ایسا ہی نہیں ہوتا؟ لیکن کوئی پرواہ نہیں میرے ساتھ چلو، میرے ساتھ رہو۔ میرے ساتھ رہ کر تم پھولوں میں تلو گی، میں تمہیں پھر سے جواہرات سے پاٹ دوں گا۔ میں تمہیں ایسے ایسے قیمتی کپڑے پہناؤں گا کہ وقت

(3)

....وَ لے بخیر گزشت

بختیار جو ایک بڑے درخت کے تنے سے لگا یہ باتیں سن رہا تھا اب ضبط نہ کر سکا۔ دفعتہً وہ سامنے آیا، اسے دیکھ کر ماہ کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے بختیار سے مخاطب ہو کر بڑی بے بسی سے کہا۔

''یہ ظالم مجھے پکڑے لئے جاتے ہیں۔''

بختیار نے اُسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''یہ ہرگز تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے، پھر اس نے ان دونوں آدمیوں سے جو اَب تک ماہ کو پکڑے کھڑے تھے، تند اور درشت لہجے میں کہا

''ہٹ جاؤ سامنے سے، چھوڑ دو اس لڑکی کو اگر اپنی خیریت چاہتے ہو۔''

وہ دونوں ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''اسے کیوں چھوڑ دیں، تمہی کو کیوں نہ گرفتار کر لیں۔''

اس حاضر جوابی پر منصور نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ پھر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تو کون ہے......کون ہے تو؟''

بختیار دو قدم آگے بڑھ کر بالکل منصور کے سامنے آ گیا۔ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ملک الموت......عزرائیل، فرشتۂ موت......پیکِ قضا......''

یہ الفاظ بختیار نے کچھ ایسے انداز میں کہے کہ منصور سٹ پٹا گیا۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ اس کمزوری پر ساتھی کیا خیال کرتے ہوں گے کچھ جھینپ سا گیا۔ اس نے برہمی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا۔

''اے شخص یا تو دیوانہ ہے یا احمق......ہم تین مسلح آدمی ہیں اور ایک درجن سے زائد

کی شاہزادیوں کے پاس بھی ایسے زرکار اور زرنگار ملبوسات نہیں نکلیں گے۔ چند لمحوں کے اندر تمہاری تقدیر بدل سکتی ہے۔تمہارے حالات بدل سکتے ہیں،تم بھکارن سے شاہزادی بن سکتی ہو، کفران نعمت نہ کرو، چپ چاپ میری بات مان لو۔''

ماہ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا:

''کمبخت کیوں بکے جا تا ہے، وہ ہرگز نہیں ہوسکتا، جو تیری مرضی ہے،تو مجھے اپنے ساتھ سے نہیں لے جاسکتا۔ ہرگز نہیں لے جاسکتا۔''

منصور نے کڑک کر برہمی کے انداز میں کہا:

''ضرور لے جاؤں گا، تجھے میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''تو صرف میری لاش لے جاسکتا ہے، میں زہر کھالوں گی، میں سر پھوڑلوں گی،خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لوں گی۔''

منصور پھر ہنسنے لگا۔

''نہیں......تم یہ کچھ نہیں کروگی،تم میرے ساتھ چلوگی، میرے ساتھ رہوگی۔عیش و عشرت کی زندگی بسر کروگی۔سونے چاندی سے کھیلوگی،تمہارے باپ کی ضبط شدہ جائیداد اور جاگیر مجھی کو ملی ہے۔تم پھراس کی مالک بن جاؤ گی۔''

ماہ نے نفرت بھری نظروں سے منصور کی طرف دیکھا اور بولی:

''نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے مجھے چھوڑ دے۔میں تیرے ساتھ نہیں جاونگی۔''

منصور نے برہم نظروں سے ماہ کی طرف دیکھا، پھر دونوں آدمیوں سے جو اسے پکڑے ہوئے کھڑے تھے کہا:

''یہ شرافت سے نہیں مانے گی، میں گھوڑے پر بیٹھتا ہوں اسے میرے پیچھے بٹھادو پھر یہ پیکِ صبارفتار منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لے گا۔''

ساتھیوں کی طرح تمہیں بھی کیفر کردار کو پہنچنا پڑے گا!''

یہ کہتے کہتے دشمن کو جھکائی دے کر بختیار نے ایسا، جچا تلا ہاتھ تلوار کا مارا کہ منصور کا شانہ جھول گیا۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ بختیار نے ایک کاری وار کیا، اس مرتبہ منصور کی پیشانی پر گہرا زخم آیا۔ اور خون کا پرنالہ جاری ہو گیا۔

ماہ اب تک ڈری سہمی، ہولناک منظر دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا، وہ لپک کر بختیار کے قریب آئی، اور اس کا دامن پکڑ کر عاجزی اور التجا کے لہجے میں گویا ہوئی۔

''بس بہت ہو چکا، اب چلیے۔''

اتنے میں منصور کو موقع مل گیا۔ اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر دستک دی، دستک کی آواز سنتے ہی ایک درجن مسلح آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں نے جو اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں اور سردار کی نازک حالت دیکھی تو غصے سے دیوانے ہو گئے، سب نے تلواریں سونت لیں اور بختیار پر ٹوٹ پڑے، یہ منظر دیکھ کر ماہ نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ منصور کی طاقت بھی جواب دے چکی تھی۔ وہ بھی لڑکھڑایا، اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ قبل اس کے یہ ایک درجن تلواریں بیک وقت بختیار کے جسم پر پڑیں اور اس کا قیمہ قیمہ کر دیں، یک بیک ایک شخص لبادہ اوڑھے ہوئے ایک جھاڑی سے نکلا اور للکارا!

''خبردار......!''

اس آواز میں نہ جانے کیا جادو تھا، چلتی ہوئی تلواریں رک گئیں، اور جو شخص جہاں تھا وہیں ایک سنگی مجسمہ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

وہ شخص آگے بڑھا، تاریکی میں اس کا چہرہ بھی پہچانا نہیں جا رہا تھا، لیکن صاف ظاہر تھا کوئی بہت بڑی شخصیت ہے۔ اُس نے ان لوگوں سے کہا۔

''تلوار میان میں رکھو اور زمین پر ڈال دو۔''

فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔

پھر وہ لبادہ پوش شخص آگے بڑھا، اس نے ان دونوں لاشوں کا معائنہ کیا جو بختیار کی برشِ شمشیر کا نتیجہ تھیں۔ ایک نظر منصور کے بیہوش جسم ناتواں پر ڈالی، جس کے جسم سے خون اب تک رس رہا تھا، پھر اس نے ان آدمیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''لاشوں کو ابھی لے جا کر دفن کر دو اور منصور کی مرہم پٹی کرو۔''

مسلح آدمی دستک کی آواز سنتے ہی فوراً وارد ہو سکتے ہیں۔ تو نہتا ہے پھر بھی یہ حوصلہ......! اگر تو ملک الموت اور پیکِ قضا ہے تو خود اپنے لیے، کیا تیرا مرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا تو زندگی سے عاجز آ گیا ہے؟ کیا زندگی میں تیرے لیے کوئی دلچسپی، کوئی لذت، کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے؟ مجھے تجھ پر ترس آتا ہے، میرے ساتھی تیرا راستہ نہیں روکیں گے۔ تجھ پر وار نہیں کریں گے، جا چلا جا......"

بختیار نے اور زیادہ تند لہجے میں کہا:

"لیکن میں تم پر ترس نہیں کھا سکتا، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم میں سے کسی کو بھی نہیں، جو لوگ شریف اور عصمت مآب دوشیزاؤں کو اغوا کرتے ہوں وہ کسی رحم، کسی ہمدردی اور کسی سلوک کے مستحق نہیں ہیں، میں تمہیں کیفر کردار کو پہنچا رہوں گا۔"

منصور کا سیل تبسم پھر اُمڈا۔ اس نے چڑاتے ہوئے کہا:

"اچھا تو تم ہمیں سزا دو گے، ہمیں کیفر کردار کو پہنچاؤ گے۔ پھر سزا دیتے کیوں نہیں! کیفر کردار کو پہنچاتے کیوں نہیں، انتظار کاہے کا ہے؟ ہم گنہگار تمہارے سامنے موجود ہیں، ہاں یاد آیا۔ تلوار شاید گھر بھول آئے ہو......وہ ابھی مہیا ہو سکتی ہے۔ میرے ان ساتھیوں میں سے جس کی تلوار چاہو منتخب کر لو۔

منصور کے دونوں ساتھیوں نے بھی طنز سے بھرا ہوا قہقہہ لگایا، لیکن یہ قہقہہ بہت جلد دہشت میں بدل گیا۔ بختیار نے بجلی کی سی تیزی سے منصور کے ساتھیوں میں سے ایک کی تلوار چھین لی۔ اور ایک وار میں اس کی گردن اُڑا دی۔ قبل اس کے کہ دوسرا آدمی سنبھل کر وار کر سکے بختیار نے اس پر بھی حملہ کر دیا۔ اور آن کی آن میں وہ بھی ایڑیاں رگڑتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر منصور تاب نہ لا سکا، اس کی آنکھوں میں خون آیا اُس نے میان سے تلوار نکالی اور کڑک کہا۔

"خبردار ہو جا، اب تیری خیر نہیں، اب تو میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ موت تیرے سر پر کھیل رہی ہے، ہوشیار!"

لیکن بختیار نے تلوار تلوار پر روکی اور دونوں میں چوٹ چلنے لگی...... بڑی دیر تک دونوں میں چوٹیں چلتی رہیں۔ آخر منصور کمزور پڑنے لگا۔ وہ دم خم جو شروع میں تھا اب اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا جنگ سے عاجز آ چکا ہے اور بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے، مقابلہ کرتے کرتے بختیار نے کہا۔

"میرے دوست تم کو بھاگنے کا موقع نہیں مل سکتا، اب تم بچ کر نہیں جا سکتے اپنے

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد وہ شخص اس درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں ابھی منصور بے ہوش پڑا تھا، اس نے بختیار سے کہا۔

''کیوں نوجوان تمہارا نام؟''

بختیار نے جواب دیا:

''مجھے بختیار کہتے ہیں۔''

''خاندان؟''

''خلجی خاندان کا ایک فرد ہوں۔''

''غزنی کب آئے؟''

''دو مہینے سے زیادہ مدت گزر گئی یہاں آئے ہوئے۔''

''کرتے کیا ہو؟''

بیکار ہوں، دن بھر تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔ شام کو مایوس و نامراد واپس آجاتا ہوں۔ یہاں آیا اس لیے تھا کہ شاید دستِ و باز کی مدد سے روزی کما سکوں۔ لیکن جس در پر جاتا ہوں دھتکار دیا جاتا ہوں۔''

''بادشاہ سے کیوں نہیں ملے؟''

''وہاں تک ہم جیسے گدایانِ بوریہ نشین کی رسائی کہاں! دربارِ شاہی میں جانے کا میرے پاس نہ کوئی وسیلہ ہے نہ ذریعہ، نہ سفارش۔''

''کیا بغیر ان سہاروں کے تم بادشاہ سے نہیں مل سکتے؟''

''جی نہیں!''

''کوشش کی ہوتی؟''

''کی تھی، لیکن ناکام ہوا۔''

''ابھی تم نے کہا تھا بیکار ہو۔''

''جی ہاں میں نے یہ عرض کیا تھا۔''

''کیا اپنے ساتھ کچھ سرمایہ نہیں لائے تھے؟''

''جی ہاں لایا تھا لیکن وہ قزاقوں کی نذر ہو گیا۔''

''قزاقوں کی نذر ہو گیا! تمہارا جیسا سورما قزاقوں سے ہار مان گیا۔''

''جی نہیں، میں نے آخر وقت تک ہار نہیں مانی، میں نے آخر وقت تک اُن کا مقابلہ کیا۔ میں نے ان کے کئی آدمیوں کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ اور خود بھی زخموں سے چور ہو گیا۔ پھر میرا گھوڑا مجھے لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھنڈر ہے۔ وہاں نہ جانے کیسے اس نے سکندری کھائی میں گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔''

''اوہو، بڑی دردانگیز کہانی ہے تمہاری، پھر کیا ہوا ہوش میں کس طرح آئے؟''

''کچھ دیر تک اسی طرح پڑا رہا، اس کھنڈر میں صرف دو نفوس رہتے ہیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک ان کی لڑکی۔ ان دونوں نے مجھے اٹھایا اور لے جا کر بستر پر ڈال دیا، عمر رسیدہ خاتون نے میری مرہم پٹی کی۔ لڑکی نے تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ آخر زخم بھر گئے۔ توانائی آ گئی اور میں اچھا ہو گیا۔ تندرست ہونے کے بعد میں نے چاہا کہ اس گھر کو چھوڑ دوں۔ ان پریشان حالوں پر اپنا بوجھ نہ ڈالوں، لیکن عمر رسیدہ خاتون نے میری بات نہ مانی، وہ مجھ سے ماں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا جب تک تمہیں روزگار نہیں ملتا یہیں رہو۔ جب روزگار مل جائے بے شک چلے جانا، مجبوراً ان ہی کے پاس بڑا ہوا بے غیرتی کی روٹیاں توڑ رہا ہوں۔''

''یہ لڑکی......! شاید اسی عمر رسیدہ خاتون کی ہے۔''

''جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔''

''لیکن یہ یہاں کس طرح پہنچی! میرا مطلب ہے ان لوگوں کے ہاتھ کیونکر پڑی؟''

کھنڈر اور اس جنگل کے بیچ میں ایک تالاب ہے، یہ وہاں سے پانی بھرنے آئی تھی۔''

''بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

بستر پر لیٹے لیٹے میرا جی اکتایا، میں ٹہلنے نکل کھڑا ہوا اور ٹہلتا ٹہلتا تالاب تک پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا گھڑا رکھا ہے مگر ماہ نہیں ہے۔''

''کیا اس لڑکی کا نام ماہ ہے؟''

''جی ہاں یہی نام ہے۔''

''اچھا نام ہے، واقعی یہ لڑکی چاند کی طرح روشن اور نمایاں نظر آتی ہے، ہاں پھر؟''

''میں نے دیکھا گھڑا رکھا ہے مگر ماہ نہیں ہے، یہ ایک اَن ہونی سی بات تھی، مجھے تشویش پیدا ہوئی، میں اسے تلاش کرتا کرتا جنگل میں داخل ہوا۔''

''لیکن جنگل میں یہیں کیوں داخل ہوئے کسی اور طرف کیوں نہیں نکل گئے؟''

''جی بات یہ ہے کہ ماہ کو پھولوں کا بہت شوق ہے اور جنگل کو پار کرنے کے بعد ایک خوبصورت باغ نظر آتا ہے وہاں طرح طرح کے پھول لگے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر، دن میں جب کبھی موقع ملتا ہے، یہ پھول چننے یہاں آجاتی ہے۔''

''کیا تم بھی اس کے ساتھ ہوتے ہو؟''

''کبھی کبھی۔''

''تم نے خیال کیا شاید پھول توڑنے یہ باغ کی طرف نکل گئی؟''

''جی ہاں یہی سوچ کر میں اِدھر آیا، اور یہاں آکر میں نے دیکھا کہ دو آدمی ماہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں، اور تیسرا شخص جس کا نام آپ نے منصور لیا تھا اپنے مشکی گھوڑے کے پاس کھڑا حکم دے رہا ہے کہ اسے ساتھ لے چلو۔ وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی، فریاد کر رہی تھی، جی ہاں یاد آیا، میں اس کی چیخ سن کر ہی اس طرف آیا تھا۔ مگر یہ ظالم اور شقی اس کا، اس کی غربت کا، اس کی مجبوری اور بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔''

''لہٰذا تم مدد کے لیے پہنچ گئے، اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر مدد کے لئے پہنچ گئے، شریف آدمی معلوم ہوتے ہو، لیکن یہ تو بتاؤ آدمی جب ٹہلنے کے لئے نکلتا ہے تو تلوار ساتھ لے کر نہیں نکلتا، تلوار لے کر گھر سے کیوں نہیں نکلے تھے؟''

''جی...... تلوار ساتھ لے کر تو نہیں گھر سے بالکل نہتا نکلا تھا، چھڑی تک میرے ہاتھ میں نہ تھی۔''

''لیکن میں تمہارے ہاتھ میں تلوار دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ میری نہیں ہے۔''

''پھر کس کی ہے؟''

''یہ دو لاشیں جو ابھی آپ نے دیکھی تھیں ان ہی میں سے ایک کی ہے۔''

''کچھ بھی ہو تمہارے دشمن عالی ظرف اور فراخ حوصلہ تھے، انہوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک نہتے آدمی پر حملہ کریں تلوار دے دی۔''

''جی نہیں بدمعاش لوگ نہ بہادر ہوتے ہیں نہ عالی ظرف، نہ مجھے نہتا دیکھ کر انہیں رحم [illegible]ا۔ نہ انہوں [illegible] کرم مجھے تلوار دی تھی۔''

[illegible] ہے ہو! کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ تلوار جو تمہارے ہاتھ میں نظر آرہی

ہے تم نے چھین لی تھی؟''

''جی ہاں میرا مطلب یہی ہے! اور واقعہ بھی یہی ہے۔''

''خوب...... تم صرف شریف ہی نہیں بہادر بھی ہو۔ اب تم غالبًا یہ بھی کہو گے کہ تم اکیلے نے ان دونوں آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اور منصور کو زخمی کر دیا۔''

''میں نہ کہوں تو بھی سمجھ لینا چاہیے، کیا میرا کوئی مددگار آپ کو یہاں نظر آیا تھا، کیا میرے سوا کوئی اور آدمی یہاں ہے؟''

''نہیں...... تمہارا دعویٰ گو بڑا ہے لیکن قابلِ قبول ہے، کیا یہ ساری باتیں ایسے ہی جیسے تم نے مجھ سے بیان کی ہیں، بادشاہ کے سامنے بھی بیان کر سکو گے، جھجکو گے تو نہیں۔''

''جھجکنے کا کیا سوال! کیوں جھجکوں گا...... بادشاہ کیا خدا کے سامنے بھی کہہ دونگاں، سچ بات کہنے میں جھجک کیسی؟''

''ہاں ہونا تو یہی چاہیے...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش کروں گا جو رعایا کی جان، مال اور آبرو کا محافظ ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جو لوگ قانون کو توڑیں، رعایا کو ستائیں اور عافیت پسند لوگوں کے سکون میں خلل ڈالیں اُنھیں سزا دے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ خود مجرم ہے۔ خود قابلِ سزا ہے......''

''مجھے آپ کی رائے سے بالکل اتفاق ہے!''

''میاں صاحبزادے یہاں اتفاق کر رہے ہو، ایسا نہ ہو کہ وہاں گھگھیانے لگو۔ آدابِ شاہی تمہاری زبان گنگ کر دے۔''

''اطمینان رکھیے، ایسا نہیں ہوگا...... جب میں بادشاہ کے لیے اپنا خون بہانے کو تیار ہوں تو بادشاہ کو بھی مجھے انصاف سے محروم نہ رکھنا چاہیے۔''

''جزاک اللہ! میں نے اندازہ کرلیا ہے، منصور کے گو زخم کافی آئے ہیں۔ لیکن کاری نہیں ہیں۔ علاج معالجہ سے تندرست ہو جائے گا، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش کر دوں گا، کیا اس روز تم آسکو گے! بیان دو گے؟''

''ضرور...... بڑے شوق سے، لیکن کیا میں دربار تک پہنچ سکوں گا؟''

''کیوں نہیں پہنچ سکو گے، تمہاری حیثیت گواہ کی ہے، گواہ کے بغیر مقدمہ کیسے سنا جائے گا، اور اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟''

''لیکن دربار میں مجھے گھسنے کون دے گا؟''

''اس کا انتظام ہو جائے گا۔ (ایک انگشتری دیتے ہوئے) یہ انگوٹھی دربانوں کو دکھلا دینا، پھر تمہیں کوئی نہیں روکے گا، تم بہ آسانی دربار میں داخل ہوسکو گے۔''

''شکریہ...... لیکن مقدمہ کب پیش ہوگا۔''

''جب منصور اچھا ہو جائے گا۔''

''مجھے کس طرح پتہ چلے گا کہ وہ اچھا ہو گیا ہے۔ اور اب مقدمہ پیش ہو رہا ہے؟''

''جس روز مقدمہ پیش ہوگا اعلان کر دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، پھر میں ضرور حاضر ہوں گا۔''

''اچھا اب ہمیں رخصت ہونا چاہیے...... لیکن لڑکی اب تک بیہوش ہے۔ اسے گھر تک کس طرح لے جاؤ گے؟''

''جی ہاں یہ بڑا نازک سوال ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟...... سوچتا ہوں ماہ کی والدہ کو بلا لاؤں، پھر ہم دونوں مل کر جس طرح بھی ہو سکے لے جائیں، ویسے تو میں اسے کندھے پر ڈال کر لے جا سکتا ہوں لیکن میرا دل اس پر راضی نہیں ہے۔''

''واقعی تم بہت شریف آدمی ہو، لیکن لڑکی ابھی ہوش میں آجائے گی۔ میں اس کے باپ کی طرح ہوں، غالباً اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ میں اسے پیٹھ پر لاد کر تالاب تک لے چلوں۔ وہاں ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے اسے فوراً ہوش میں لے آئیں گے۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ماہ نے جنبش کی...... پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے گھبرائی آواز میں کہا:

''میں کہاں ہوں؟''

بختیار نے تسلی اور دل دہی میں جواب دیا۔

''ماہ تم ہوش میں آگئیں! خطرہ ٹل گیا، اٹھو، میرا ہاتھ پکڑ لو، اب گھر چلیں۔''

ماہ اُٹھ کھڑی ہوئی، پھر اس نے لبادہ پوش شخص کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''یہ کون شخص ہے، وہ لوگ کیا ہوئے؟''

وہ شخص ہنستا ہوا گویا ہوا:

''وہ لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے، اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اطمینان سے جاؤ۔''

بختیار نے ایک مرتبہ پھر لبادہ پوش کا شکریہ ادا کیا اور ماہ کا ہاتھ پکڑ کر جنگل سے نکل گیا۔

(4)

گھر پر

اب کافی رات آچکی تھی، بختیار جب ماہ کو لے کر گھر پہنچا تو بیچاری عاصمہ خاتون کی جان لبوں پر آچکی تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کام سے باہر گئی ہو اور اتنی دیر لگا دی ہو، اور وہ بھی اتنے ناوقت، طرح طرح کے وہم آرہے تھے، مگر کلیجہ سنبھالے بیٹھی تھی۔ بختیار کو دیکھا تو وہ بھی نہیں تھا۔ اب اور زیادہ پریشان ہوئیں اور جب کچھ نہیں سمجھ آیا تو مصلّے بچھا کر بیٹھ گئیں۔ اور گڑگڑا کر خدائے پاک سے دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگیں۔ اس اثنا میں دونوں پہنچ گئے۔ ماہ کا رنگ رخ اترا ہوا۔ چہرے پر زردی، بدن میں لرزش، خود بختیار بھی گو بظاہر سکون کی حالت میں تھا لیکن کافی پریشان نظر آرہا تھا، ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر عاصمہ خاتون کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پریشان اور مضطرب لہجے میں سوال کیا:

''میری بچی کیا ہو گیا تجھے؟''

ماہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاصمہ کو دیکھا، کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بستر پر جا کر گر گئی۔ عاصمہ نے بختیار سے پوچھا:

''بیٹا تم ہی بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے میری ماہ کو؟''

بختیار نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

''خدا کا شکر ہے آپ پریشان نہ ہوں اطمینان سے بیٹھیں، ساری کیفیت ابھی سناتا ہوں؟''

پھر بختیار نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ عاصمہ خاتون ساری داستان سنتی رہیں، پھر انہوں نے کہا:

''یا اللہ تیرا شکر ہے، تو نے میری بچی کو بچالیا، نہ جانے وہ لوگ اسے لے جا کر بیچ ڈالتے، یا کیا کرتے؟''

پھر محبت بھری نظروں سے بختیار کو دیکھا اور بولیں:

''خدا تمہیں اجر دے گا اس نیکی کا جو اس یتیم لڑکی کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر دشمن کے پنجے سے چھڑا کر تم نے انجام دی ہے...... لیکن بیٹے وہ کون لوگ تھے؟''

ماہ کی طبیعت اب ذرا بحال ہو چکی تھی، اس نے کہا:

''منصور تھا، اماں جان!''

عاصمہ خاتون نے سر پیٹ لیا:

''منصور!...... خدا غارت کرے نمک حرام کو۔ یا اللہ ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا، جو ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا آج وہ میری بچی کو پکڑے لیے جا رہا تھا، اس لیے کہ ہم مٹ چکے ہیں، برباد ہو چکے ہیں، اور وہ اپنی سازشوں اور دراندازیوں سے بادشاہ کا مصاحب بن چکا ہے۔''

بختیار نے پوچھا:

''کیا وہ بادشاہ کا مصاحب ہے؟''

عاصمہ نے بتایا:

''ہاں بیٹا..... پہلے ہمارا غلام تھا، اب بادشاہ کا مصاحب ہے۔ قسمت کے کھیل ہیں۔ وہ جو دن دکھائے گی دیکھیں گے۔ لیکن خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

بختیار نے عاصمہ کو بتایا:

''میں درخت کی اوٹ میں کھڑا دشمن کی لاف زنی سن رہا تھا۔ میرا یہ خیال تو تھا کہ یہ کوئی شاہی ملازم ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ کا مصاحب ہے۔ جس بادشاہ کے مصاحب ایسے ہوں وہ خود کیسا ہوگا! بادشاہ کی ذات سے مجھے جو اعتقاد تھا اب وہ متزلزل ہونے لگا۔ پھر تو میں اس کی نوکری نہیں کروں گا۔ اب میں غزنی میں نہیں رہوں گا۔ کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرونگا۔''

ماہ نے بستر پر لیٹے لیٹے عاصمہ سے کہا:

''اماں جی سن رہی ہیں آپ ان کی باتیں۔''

بختیار بیچ میں بول پڑا۔

''تو کیا کچھ غلط کہتا ہوں؟''

ماہ نے خود بھی تائید کی:

''ہاں اور کیا سچ تو ہے...... جس بادشاہ کے مصاحب کے یہ لچھن ہوں وہ خود بھی نیک نہ ہوگا۔''

عاصمہ دونوں کی باتیں سن کر گویا ہوئی:

''نہیں اتنی جلدی فیصلہ نہ کرنا چاہیے۔ بیشک بادشاہ کے ہاتھوں ہمیں دُکھ پہنچے ہیں، لیکن وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اُن کے عہد میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے، ان سے اسلام اور قوم کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اگر ان تک شکایت پہنچے تو وہ ضرور انصاف کریں گے، اور منصور کو قرار واقعی سزا دیں گے۔''

بختیار نے کچھ طنز اور کچھ بے اعتمادی کے لہجے میں کہا:

دیکھ لیں گے، وہ مرد نیک یقیناً کوئی بڑا آدمی ہے۔ جس کے ایک اشارہ پر منصور شاہ کے آدمی سر جھکا کر اور کان دبا کر رخصت ہو گئے، جو مجھے قیمہ قیمہ کرنے کے لئے آگے بڑھے تھے۔ وہ یقیناً بادشاہ کے مزاج میں رسوخ رکھتا ہوگا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہ مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش کر دے گا۔''

ماہ نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا:

''پھر دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا، خدا نے چاہا تو نمک حرام منصور شاہ کیفر کردار کو پہنچے، اور ضرور پہنچے گا۔''

''انشاء اللہ!'' بے ساختہ عاصمہ خاتون کے منہ سے نکلا، پھر وہ کہنے لگیں۔'' لیکن یہ لبادہ پوش شخص جس کا تم ذکر کر رہے ہو کون تھا؟

''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یقیناً وہ کوئی اچھا آدمی ہے، آج اگر عین وقت پر وہ نہ آجاتا تو میں بھی قتل ہو چکا ہوتا اور ماہ بھی نہ جانے کہاں ہوتی۔''

عاصمہ نے پھر ایک سوال کیا:

''تو پھر مقدمہ کب پیش ہوگا بادشاہ کی عدالت میں؟''

بختیار نے بتایا۔

''وہ شخص کہہ رہا تھا جب منصور شاہ تندرست ہو چکے گا وہ خود اس مقدمہ کو پیش کرے گا، مجھے بھی گواہ کی حیثیت سے دربارِ سلطانی میں جانا پڑے گا۔ درحقیقت وہ وقت ہوگا بادشاہ کے امتحان کا۔ اس روز معلوم ہوگا کہ بادشاہ ظالم کا ساتھ دیتا ہے یا مظلوم کا، اور اسی دن میں فیصلہ

کروں گا کہ مجھے غزنی میں رہنا چاہیے یا کہیں اور جا کر جدوجہد کرنی چاہیے۔

ماہ نے ذرا خفا ہوتے ہوئے کہا:

''کہیں اور جانا ہی ہے تو آپ ہر وقت جا سکتے ہیں، مقدمہ پیش ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔''

بختیار نے ایک قہقہہ لگایا اور عاصمہ سے کہا۔

''بھوک لگی ہے۔''

(5)

قسمت کا فیصلہ

کئی دن گزر گئے، مگر نہ منصور شاہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا، نہ وہ لبادہ پوش دکھائی دیا۔ نہ دربارِ شاہی میں کسی مقدمہ کے پیش ہونے کا چرچا ہوا۔ دِل ہی دلِ میں بختیار نے بادشاہ کے سامنے جانے، پُرزور بیان دینے اور منصور شاہ کو سزا دلانے کا پورا پورا انتظام کرلیا تھا۔لیکن روز بروز مایوسی ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ معاملہ دب گیا۔ بھلا منصور شاہ مجرم کی حیثیت سے کس طرح پیش ہوسکتا ہے؟اس کے خلاف تن تنہا میری گواہی کیا وزن رکھ سکتی ہے۔

ایک روز ایسی ہی مایوسی کی باتیں بیٹھا وہ ماہ سے کررہا تھا، اور وہ اسے تسلی دے رہی تھی کہ میرا دل گواہی دیتا ہے لبادہ پوش جھوٹا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنے وعدے کوضرور پورا کرے گا، اتنے میں منادی کی آواز سنائی دی معلوم ہوا کہ کل سلطان کے دربار میں منصور شاہ کا مقدمہ پیش ہوگا، یہ سن کر ماہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا، اس نے کہا:

''دیکھئے میں نہ کہتی تھی کہ وہ لبادہ پوش جھوٹا آدمی نہیں ہے، اس کا قول ضرور کرسی نشین ہوگا۔''

بختیار کے چہرے پر بھی مسرت کے آثار نمایاں ہوئے، اس نے جواب دیا۔

''ہاں بھئی کہتی تو ٹھیک ہو، اب دیکھنا ہے بادشاہ سلامت کیا کرتے ہیں!''

ماہ نے نہایت اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ کہا:

''انصاف کریں گے......شہاب الدین غوری اور انصاف لازم وملزوم ہیں۔ اگر جُرم ثابت ہوگیا اور یقیناً ثابت ہوجائے گا، پھر منصور شاہ عتاب شاہی سے نہیں بچ سکتا۔''

ماہ نے کچھ دیر تک بختیار کا اس موضوع پر ساتھ دیا۔ پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا:

بادشاہ سے اپنی نوکری کا ضرور کہنا۔

بختیار ہنسنے لگا:

''گویا بادشاہ سلامت میرے منتظر بیٹھے ہیں کہ میں اشارہ کروں اور وہ مجھے اپنا ندیم

خاص بنالیں، کیسی باتیں کرتی ہو ماہ...... لیکن نہیں تم نے ٹھیک کہا اس سے بہتر اور نادر موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ بیان دینے کے بعد میں ضرور اپنی خدمات پیش کروں گا، آگے دیکھئے خدا کیا کرتا ہے۔''

ماہ مسکراتی ہوئی بولی:

''وہ آپ کو اچھی سی ملازمت دلوادے گا، پھر آپ روپے والے ہو جائیں گے، آپ کے پاس حویلی ہوگی، نوکر چاکر ہوں گے، بڑے بڑے معرکے سر کریں گے۔ کبھی کبھی ہم غریبوں سے بھی راستے گلی میں مڈبھیڑ ہو جایا کرے گی۔ ہم سلام کرتے رہ جائیں گے اور آپ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے نکل جائیں گے۔ اگر کبھی ہم آپ کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو مصروفیت کے باعث آپ ملاقات کا وقت نہیں نکال سکیں گے، اور اگر شرفِ حضوری ملے تو بس کھڑے کھڑے دو باتیں کیں اور رخصت...... کہیے کیسا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے میں نے، ٹھیک ہے نا؟''

ماہ نے یہ باتیں مذاق میں کی تھیں، لیکن بختیار نے انہیں سنجیدگی سے محسوس کیا۔ اس نے ایک آہ سرد بھر کر جواب دیا۔

''تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتی ہو، یہ آج معلوم ہوا۔''

ماہ نے ایک نظر بختیار کے سرخ وسفید چہرے پر ڈالی پھر کہنے لگی۔

''ارے آپ خفا ہو گئے، میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی۔''

بختیار کی تشفی ان باتوں سے نہیں ہوئی۔ اُس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا:

''رہنے بھی دو...... آج معلوم ہو گیا، تم مجھے کیا سمجھتی ہو...... لیکن ماہ میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں تم سے!''

آمادگی اور مستعدی کے ساتھ ماہ نے کہا۔

''ضرور پوچھیے، آپ کچھ پوچھیں اور میں جواب نہ دُوں۔''

بختیار نے تاثر کے عالم میں کہا۔

''اگر تم مجھے ایسا ہی گیا گزرا آدمی سمجھتی تھیں تو مجھے اپنے آپ سے اتنا قریب ہونے کا موقع کیوں دیا؟ اگر میں اتنا ہی ذلیل تھا تو اب تک تمہارے لطف وکرم کا مورد کیوں بنا؟ کاش یہ بات آج سے پہلے معلوم ہوگئی ہوتی کہ اس گھر میں میری حیثیت کیا ہے؟''

یہ کہتے کہتے بختیار کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے

کہا۔

''جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے خوشی نہیں دیکھی، خدا کے فضل سے باپ زندہ ہے، لیکن کونسا ظلم ہے جو اس نے مجھ پر نہیں توڑا۔ ماں مجھے یاد ہی نہیں۔ لہٰذا مجھے بھی نہیں معلوم ہوا کہ مہر مادری کیا چیز ہوتی ہے۔ سوتیلے بھائی بہن کئی ہیں وہ بھی ہمیشہ ذلیل ہی سمجھتے رہے۔ قسمت نے مجھے اس گھر میں لا پھینکا، یہاں آ کر میں نے خوشی کا منہ دیکھا۔ مسرت کی لذت محسوس کی۔ تمہیں دیکھ کر، تمہیں پا کر، تم سے قریب ہو کر میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے دُنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی ہے مجھے۔ لیکن آج...... لیکن آج معلوم ہوا کہ میں ایک خواب دیکھ رہا تھا، ایک نہایت خوشگوار خواب جس کی اتنی ہی بھیانک تعبیر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ ماہ تم نے میرا دل توڑ دیا، مجھے زندگی سے بیزار کر دیا۔''

ماہ نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بختیار نے اُسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ اپنی گفتگو جاری رکھی:

''اب پھر میں وہیں ہوں جہاں تھا، میں نے زندگی کے کیسے کیسے نقشے بنائے تھے، آرزوؤں کے کیسے کیسے قلعے تعمیر کئے تھے۔ امید کے کیسے کیسے محل بنا ڈالے تھے، وہ سب تمہارے چند الفاظ سُننے کے بعد مٹی کا ڈھیر بن گئے، کھنڈر بن گئے:

اب بختیار کی آنکھیں آب گوں ہو چکی تھیں، اس نے کہا۔

''شاید میں اسی قابل ہوں کہ خوشی میرے پاس نہ پھٹکنے پائے، حسرتیں پیدا ہوں اور مر جائیں، آرزو میں جنم لیں اور ختم ہو جائیں مجھے اپنا حال معلوم ہو گیا، میں نے اپنا مستقبل دیکھ لیا، شکریہ! بہت بہت شکریہ!!

ماہ اُٹھ کر بختیار کے قریب آ گئی، خود اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑے نرم اور رس بھرے لہجے میں کہا۔

''اس قدر جلد رائے نہ قائم کر لیا کیجئے، اتنی جلدی خفا نہ ہو جایئے۔ آپ تو مذاق میں ہی چڑ جاتے ہیں۔''

بختیار نے ایک نظر ماہ پر ڈالی اور بولا:

''یہ مذاق تھا؟''

ماہ نے کہا:

''اور کیا تھا اگر مذاق نہیں تھا۔''

بختیار کو گویا اب بھی یقین نہیں آیا۔

''کسی کے دل میں تیر پیوست کر دینا، کسی کا گلا گھونٹ دینا، کسی کی جان لے لینا......کیا مذاق میں سب کچھ ہوتا ہے، کیا اسی کو مذاق کہتے ہیں؟''

ماہ نے ایک جاں نواز تبسم کے ساتھ بختیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''ہاں''

اس تبسم میں اور اس ''ہاں'' میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ بختیار مسحور ہو کر ٹکٹکی باندھ کر ماہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ شرما گئی اور بختیار کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں جانے لگی، لیکن بختیار نے اس کا راستہ روک لیا، ماہ اُسے شریر نظروں سے دیکھنے لگی:

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ مجھے جانے کیوں نہیں دیتے؟''

''میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، اس پر میری قسمت کا، میری زندگی کا، میری امیدوں کا اور میری آرزوؤں کا فیصلہ ہے۔''

''اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں اسے سنے بغیر میں ''ہاں'' کہہ دوں تو؟''

بختیار کی آنکھیں چمکنے لگیں، اس پر عجیب دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ماہ......!''

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا، ماہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''اب اس کے بعد نہ آپ کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے نہ مجھے کچھ جواب دینے کی۔''

وہ چلی گئی اور بختیار چشم حیرت بنا اُسے دیکھتا رہا۔

(6)

دربارِ شاہی میں

دوسرے روز بختیار نے دربار سلطانی کا راستہ لیا۔ اور ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ دربارِ سلطانی تک پہنچنے کے راستے طے کرنے میں اُسے جاہ وجلال اور کرّ وفر کے جو مناظر دکھائی دیئے ان سے اس کی عقل حیران ہوگئی۔ اس نے آج تک دربارِ شاہی نہیں دیکھا تھا۔ نہ سلطانِ والا شان کی زیارت کی تھی، صرف دوسروں کی داستانیں سنتا رہتا تھا۔ آج یہاں پہلی بار اس نے شاہی دبدبے اور سطوط کے مناظر دیکھے۔ مسلح سپاہیوں کے دستے، کیل کانٹے سے لیس غلاموں کی فوج کی فوج زرق برق لباس میں آراستہ، باہزاراں شان وتجمل ادھر سے گشت کر رہے، حاجب، دربان اور چاؤش پرے باندھے اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہیں۔

یہ مناظر دیکھ کر بختیار بہت مرعوب ہوا۔

پہلے تو اس کے جی میں آئی واپس چلا جائے۔ بھلا اتنے بڑے اور اس شان کے دربار میں اسے کون گھسنے دے گا، اور اگر کسی طرح پہنچ گیا تو زبان یاری کب دے گی کہ کچھ کہہ سکے۔ اسی حیض بیض میں حیران و پریشان ایک گوشے میں ٹھٹکا ہوا تھا کہ ایک منتظمِ دربار کا اس کی طرف گزر ہوا۔ اُسے دیکھ کر بے ساختہ بختیار کے ہاتھ سلام کو اٹھ گئے۔ اس نے اخلاق اور شائستگی سے سلام کا جواب دیا۔

''تم کوئی نو وارد معلوم ہوتے ہو؟''

بختیار نے ادب کے ساتھ جواب دیا:

''میں ایک پردیسی ہوں اور تھوڑی سی مدت گزری غزنی آیا ہوں۔''

منتظمِ دربار نے سوال کیا،

''شاید تم سلطانِ عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ عرض معروض کرنا چاہتے ہو؟ لیکن آج تو ایک نہایت اہم مقدمہ پیش ہے۔ آج کسی غیر متعلق شخص کو اذن باریابی نہیں مل سکتا۔

جیسے دفعتہً بختیار کو کچھ یاد آ گیا، اس نے کہا۔

''میں غیر متعلق شخص نہیں ہوں، آج کے مقدمے سے میرا گہرا تعلق ہے۔''

منتظم دربار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا:

''آج کے مقدمے سے تمہارا تعلق ہے۔''

بختیار نے باادب ہو کر جواب دیا:

''جی ہاں اس مقدمے میں بیان دینے کے لئے مجھے بلایا گیا ہے۔''

منتظم نے سراپا حیرت بن کر سوال کیا:

''اس مقدمے میں گواہی دینے کے لیے تمہیں بلایا گیا ہے؟ لیکن کس نے بلایا ہے تمہیں؟''

بختیار نے وہ انگشتری جو لبادہ پوش نے اسے دی تھی جیب سے نکال کر پیش کر دی۔

وہ انگشتری دیکھتے ہی منتظمِ دربار فوراً گھوڑے اتر پڑا۔ اس نے کہا:

''تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا تھا؟......آؤ۔''

وہ اسے لے کر دربار ہال میں پہنچا۔ یہاں کا منظر اور زیادہ حیران کن تھا۔ خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سوئی بھی گرے تو آواز سن لی جائے۔ تجمل اور احتشام کی یہ کیفیت کہ بڑے بڑے امراء اور وزراء سر جھکائے، ہاتھ باندھے ادب سے کھڑے تھے، حالانکہ ابھی تک بادشاہ سلامت دربار میں نہیں پہنچے تھے۔

بختیار نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک کٹہرے میں ملزم کی حیثیت سے منصور شاہ کھڑا نظر آیا۔ آس پاس دو مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ منتظم نے بختیار کو بھی اس کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آواز گونجی۔

''ہوشیار، خبردار، ظل اللہ، سلطانِ عالم پناہ غازی شہاب الدین غوری نزولِ اجلال فرماتے ہیں۔''

سارے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ سب مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے، خود بخود سب کی گردنیں جھک گئیں۔ بختیار بھی انہی لوگوں میں تھا۔

دفعتہً اس کے پردۂ گوش سے ایک بارعب آواز ٹکرائی۔

''مقدمہ کی کارروائی شروع ہو؟''

یہ آواز کچھ مانوس تھی، بے اختیار بختیار کی نظریں تختِ شاہی پر جم کر رہ گئیں۔ تخت شاہی

پر پیکر جلال بنا ایک وجیہہ خوش رُو اور بارعب آدمی بیٹھا تھا۔ بے ساختہ اس کے دل نے سوال کیا:

''کیا وہی لبادہ پوش نہیں ہے؟''

اور دل نے جواب دیا:

''ہاں یہ وہی ہے......وہی آواز، وہی باوقار صورت!''

اور یہ سوچ کر نہ جانے کیوں وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ بادشاہ کی نظر بختیار پر پڑی، اس نے اس سے پوچھا:

''تم آ گئے؟''

بختیار نے سر ادب سے جھکا کر عرض کیا:

''غلام حاضر ہو گیا۔''

''بادشاہ نے پہلے سے زیادہ نرم اور مشفقانہ لہجے میں کہا۔

''تم پریشان نظر آتے ہو، ذرا بھی نہ گھبراؤ، یہاں کسی پر ظلم نہیں ہو سکتا، یہاں سب کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے، بتاؤ تمہیں ملزم کے خلاف کیا کہنا ہے؟''

بختیار نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور ساری کہانی از اول تا آخر سنا دی۔

بادشاہ نے خشمناک لہجے میں منصور شاہ سے کہا:

''ملزم تم کیا کہنا چاہتے ہو؟......کیا تمہیں جرم کا اقرار ہے؟''

منصور شاہ نے لرزتی اور کانپتی آواز میں کہا:

''جہاں پناہ! اس شخص (بختیار) نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے صحیح ہے، لیکن ملزم غلام نہیں، یہ شخص ہے!''

بادشاہ نے اس دعوے سے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا:

''وہ کس طرح!''

منصور شاہ نے کہا:

''اس شخص نے میرے دو ساتھیوں کو ہلاک کر دیا، اس نے مجھ پر حملہ کیا اور زخمی کر دیا۔ اُسے میرے معاملہ میں مداخلت کرنے کا کیا حق تھا جب کہ میں ایک ملزم کو انصاف کے دوازہ تک لانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

بادشاہ کے چہرے پر حیرت کے آثار طاری ہوئے۔

''ملزم!......تم کس ملزم کا ذکر کر رہے ہو، کیا وہ لڑکی ملزم تھی؟''

منصور نے ڈھٹائی اور خیرہ چشمی کے ساتھ کہا:

جہاں پناہ اس لڑکی کا نام ماہ بیگم ہے، وہ سلطنت کے سب سے بڑے دشمن، باغی خاطی، مجرم اور معتوب دشمن ابوالعباس کی بیٹی ہے جسے قتل کی سزا دی گئی تھی۔''

شہاب الدین غوری نے منصور شاہ سے کہا:

''ہاں ہمیں یاد ہے ابوالعباس قتل کیا گیا تھا، اسے کم سے کم یہی سزا دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کی لڑکی نے کیا کی خطا کی تھی۔ اسے کس جرم کی سزا دینے تم اسے جنگل میں لے گئے تھے!

منصور شاہ کے چہرے پر رونق آ گئی، اس نے کہا:

''جہاں پناہ یہ لڑکی جسے میں گرفتار کرنے گیا تھا سلطنت کے خلاف سازش کر رہی ہے یہ اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی ہے، مجھے اس کے جرائم کا پتہ چلا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے گرفتار کر کے سلطان کے حوالے کر دونگا کہ وہ جو چاہیں سزا دیں۔''

شہاب الدین غوری نے زہر خندہ کرتے ہوئے کہا:

''تو جھوٹ بولتا ہے، تو دغا باز ہے تو جعل ساز ہے، باپ کی سزا بیٹی کو نہیں مل سکتی۔ ہم نے ابوالعباس کو سزا دی اس لیے کہ وہ مجرم تھا۔ لیکن ہم اس کی بیٹی اور بیوی کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے کہ ان دونوں نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن دہشت کے باعث یہ ماں بیٹی کہیں غائب ہو گئیں۔ ہمارے جاسوس اور خبر رساں ہمیں ہر بات کی خبر دیتے ہیں کسی نے ہمیں یہ اطلاع نہیں دی کہ عاصمہ اور ماہ بغاوت پر تلی ہوئی ہیں۔ بلکہ ہمیں بتایا گیا کہ بیوی کو شوہر کے اور بیٹی کو باپ کے مارے جانے کا بے حد غم تھا، لیکن انہیں اس کا احساس بھی تھا کہ ابوالعباس خطا کار تھا، یہی وجہ تھی کہ ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہم ان کے ساتھ احسان کریں گے۔''

یہ باتیں سُن کر منصور شاہ بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی، یارائے تکلم نہ رہا۔ یکا یک شہاب الدین غوری کی آواز گونجی:

شاید تجھے معلوم نہیں ہم نے خود اپنے کانوں سے تیری وہ ساری باتیں تیرے بالکل قریب درخت کے پاس کھڑے ہو کر سنی ہیں۔ تو اس لڑکی کو اپنی ہوس رانی کا شکار بنانا چاہتا تھا۔ تو اسے بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ شخص (بختیار) عین موقع پر اس کی مدد کے لئے نمودار نہ ہوتا تو ہم آتے۔ اس نے تجھے صرف زخمی کیا تھا ہم وہیں تجھے قتل کر دیتے؟''

''اب تو منصور شاہ کی حالت اور ابتر ہوگئی، اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی بے بسی اور حسرت کے ساتھ کہا۔

''رحم، سلطان عالم پناہ رحم، بے شک یہ غلام خطاوار ہے اور ہر سزا کا سزاوار ہے، لیکن سلطان کے رحم وکرم سے امید ہے کہ جان بخشی کی جائے گی۔''

بادشاہ نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا:

''نہیں، تیری جان بخشی نہیں کی جا سکتی، تو نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اُٹھایا، تو نے ایک معصوم لڑکی کو اغوا کر کے اس کی زندگی برباد کرنی چاہی، تجھ جیسے لوگ اگر چھوڑ دیے جائیں تو مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوگی، ہماری رعایا کی آبرو محفوظ نہیں رہے گی۔''

پھر

''بزن!''

دفعتہً جلاّد کی تلوار فضا میں بلند ہوئی، گھن کی آواز آئی، اور منصور شاہ کی گردن لڑھکتی ہوئی بالکل بختیار کے قدموں کے پاس آ کر گر پڑی۔

اس واقعے نے سارے دربار پر دہشت کی کیفیت طاری کر دی۔

(7)
قِسمت کے کھیل

منصور کا مقدمہ فیصل کرنے کے بعد سلطان ایوان خاص میں گیا، اور وہاں اس نے بختیار کو طلب کیا، سلطان نے مہر والتاف کی نظروں سے اُسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا تم ہمارے انصاف سے مطمئن ہو؟''

بختیار نے سرادب سے جھکا کر عرض کیا۔

''سلطان نے ثابت کر دیا کہ انہیں اپنی رعایا کتنی عزیز ہے۔ انہوں نے دنیا کے سامنے مثال قائم کر دی کہ ظالم خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو سزا پانے سے نہیں بچ سکتا۔ اور مظلوم خواہ کتنا ہی حقیر ہو، دادرسی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ سلطان حقیقی معنوں میں ظل اللہ ہیں، اور غلام کے لیے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اس نے بچشم خود سلطان کو مسندِ عدالت پر جلوہ فرما ہوتے اور ظالم کو سزا دیتے دیکھ لیا۔''

بختیار کی باتیں سلطان غور اور توجہ سے سُن رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:

''شاید تم یہاں تلاش معاش میں آئے ہو؟''

''سلطان کا خیال صحیح ہے۔ غلام اسی لیے غزنی آیا تھا!''

''پھر کیا تمہیں کوئی ملازمت ملی؟''

''نہیں سلطانِ والاشان...... غلام کوئی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔''

''اور اگر ہم تمہیں رکھ لیں، خادمِ خاص بنالیں تو کیا یہ پیش کش تم قبول کرلو گے......؟''

(بے انتہا مسرور ہو کر) غلام کے لئے وہ دِن یومِ عید سے کم نہ ہوگا...... کلاہ گوشئہ دہقاں بہ آفتاب رسید۔ سچ پوچھئے تو غلام وطن سے یہی آرزو لے کر چلا تھا کہ سلطان کی غلامی کا فخر حاصل کر سکے، کچھ کر کے دکھا سکے، اپنی وفاداری، خدمت گزاری، جاں نثاری اور فداکاری ثابت کر سکے، اپنے جوشِ عقیدت کا ثبوت دے سکے۔

''(مسرور ہو کر) ہم نے تمہیں رکھ لیا...... آج سے تم ہمارے خادمِ خاص ہو تمہیں ہر

وقت ہمارے حضور میں رہنا ہوگا۔ ہم تمہیں معقول تنخواہ دیں گے، انعام واکرام سے سرفراز کریں گے۔ اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم کچھ کر کے دکھا سکے۔ اگر تم نے اپنی وفاداری اور جاں نثاری ثابت کر دی، اگر تم نے اپنی مستعدی اور کارگزاری کا سکہ ہم پر بٹھا دیا تو ہم تمہاری زیادہ سے زیادہ عزت افزائی کریں گے۔''

''غلام کو یقین ہے۔''

''تم ہمیں مہربان اور مشفق آقا پاؤ گے؟''

''غلام کو اپنے سلطان سے توقع بھی اسی کی ہے۔''

''اگر تم میں صلاحیت ہو تو تمہارے راستے کا ہر پتھر ہم خود اپنے ہاتھ سے ہٹا دیں گے۔ ہم تمہیں ترقی کی آخری منزل تک پہنچا دیں گے۔ اگر استحقاق ثابت کر سکو تو تم سپہ سالار بن سکتے ہو۔ ہماری فوج کے، ہماری مہمات کے سربراہ بنائے جا سکتے ہو۔ وزارت کے منصب پر فائز ہو سکتے ہو۔ ہم انسان کو دیکھتے ہیں۔ اس کی ذات، وطن، قبیلہ اور خاندان کو نہیں دیکھتے۔ ہمارے ہاں فلاں ابن فلاں کا سوال نہیں ہے۔

جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے!''

بختیار نے بڑھ کر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

سلطان نے شفقت کے ساتھ اس کا سر اپنے ہاتھ سے اُٹھایا اور قبل اس کے کہ کچھ کہے بختیار نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا:

''سلطان کے اس التفات خاص نے غلام کے اندر ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش پیدا کر دیا ہے۔ یہ غلام اپنے خون کا آخری قطرہ بھی سلطان کے ایک اشارے پر نثار کر دینے کے لئے تیار ہے، صرف حکم کا انتظار ہے، صرف اشارہ کی دیر ہے۔''

سلطان نے بختیار کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور تبسم کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمیں یقین ہے...... جو کچھ تم نے کہا وہ سچ ہے، شاید امتحان کا وقت بھی جلد آئے گا ہم اپنی آنکھوں سے تمہاری دلیری اور دلاوری کا نہ بھولنے والا کارنامہ دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے، جو کچھ تم نے کہا ہے اِس سے زیادہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر سکو گے۔''

جواب میں بختیار نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ سلطان بڑی توجہ سے اس کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سراپا لطف وکرم بن کر پوچھا۔

''ہاں وہ لڑکی...... کیا نام تھا اس کا؟''

''ماہ بیگم...... سلطانِ والا جاہ!''

''ہاں ماہ بیگم...... اس کا کیا حال ہے؟ اس روز تو اس کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی۔''

''اب وہ اچھی ہے اور دل و جان سے سلطان کی درازئ عمر و اقبال کی دعا گو ہے۔''

سلطان ہنسنے لگا۔

ہم یہ شبہ بھی نہیں کر سکتے کہ تم جھوٹ بول سکتے ہو...... لیکن کیا یہ سچ ہے، کیا واقعی ماہ بیگم ہماری درازئ عمر و اقبال کی دعا گو ہے...... ماہ بیگم جس کا خطا کار اور عصیاں شعار باپ ہمارے حکم سے قتل کیا جا چکا ہے؟''

''سلطان عالم پناہ غلام کبھی جھوٹ نہیں بولتا، بے شک ماہ کو اپنے مقتول باپ سے محبت ہے۔ بے شک اس کے قتل پر اب تک اس کی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں، بے شک باپ کو کھو کر وہ دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے صرف زمانے کی ٹھوکریں ہی اس کے مقدر میں آئندہ کے لئے لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ اس نے سلطان کی عدل گستری کے واقعات بیان کئے۔ اس نے اپنے باپ کی غلط روی کو تسلیم کیا۔ اور جب میں اپنی نادانی اور حماقت کے باعث شش و پنج میں مبتلا تھا کہ منصور شاہ جیسے مقرب بارگاہ کے خلاف مقدمہ چل سکے گا یا اُسے سزا مل سکے گی یا نہیں، وہ ماہ بیگم تھی جس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اگر لبادہ پوش نے...... اور یہاں اگر معلوم ہوا کہ وہ سلطان ذی شان ہی تھے...... مقدمہ پیش کیا تو سلطان ضرور عدل کریں گے۔ اس لیے کہ ان کے عہد میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔''

بختیار کی یہ باتیں سن کر سلطان ہنسنے لگا، اس نے کہا:

''پھر تو وہ لڑکی بہت سمجھدار ہے، بہت ہوش مند ہے۔''

''بہت زیادہ سلطان عالم پناہ، میں تو اس کی باتیں سن کر بعض وقت دنگ رہ جاتا ہوں۔''

''ابوالعباس کے قتل کے بعد اس کی بیوی اور بچی کو ہم کسی طرح کی تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ دونوں از خود روپوش نہ ہوگئی ہوتیں تو ہم ضرور ان کی راحت و آسائش کا انتظام کرتے۔ اور اب تمہاری باتیں سننے کے بعد تو ہمارا فرض ہوگیا ہے کہ جو ہم نے سوچا تھا، کر دکھائیں۔ ہم نے ماں بیٹی کو اپنے حضور میں طلب کیا ہے، اور ابھی تمہارے سامنے ہم اپنے فیصلے کا

اعلان کر دیں گے!''

اتنے میں چوبدار نے آ کر اطلاع دی کہ ابوالعباس کی بیوی اور بیٹی درِ دولت پر حاضر ہیں، سلطان نے حکم دیا، اُنہیں فوراً حاضر کیا جائے۔ فوراً ہی وہ دونوں حاضر کر دی گئیں۔ ماہ بیگم کی نظر سلطان پر جب پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اسے وہ لبادہ پوش یاد آ گیا، سلطان نے اس کی کیفیت بھانپ لی، اور ہنستے ہوئے کہا:

''لڑکی! شاید تم ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو؟ تمہارا خیال صحیح ہے، جس لبادہ پوش کو اس رات تم نے دیکھا تھا اس وقت وہی تمہارے سامنے ہے۔''

''ماہ نے آنکھیں جھکا لیں، کچھ نہ عرض کر سکی، سلطان نے عاصمہ کی طرف دیکھا اور کہا:

''تمہیں تکلیف پہنچی، غم پہنچا۔ لیکن ہم نے جو کچھ کیا وہ ہمارا فرض تھا۔''

عاصمہ نے سر اَدب سے جھکا کر عرض کیا:

''کنیز کو سلطان سے کوئی شکایت نہیں ہے!''

''سلطان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔'

''یہ تمہاری عالی ظرفی ہے۔''

عاصمہ کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوگئی۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، فخر کے تھے، سلطان نے اس وقت جس ذرہ نوازی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کا خراجِ تحسین تھا۔

''لیکن ابوالعباس کے بعد تمہاری یہ کیا حالت ہے۔ معلوم ہوتا ہے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں تم نے، اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت مصیبت میں زندگی کے دن بسر کر رہی ہو۔ تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئیں؟''

عاصمہ نے لرزتی ہوئی آواز میں عرض کیا:

''گھر چھین لیا گیا، جائیداد ضبط کر لی گئی۔ مال و املاک پر قبضہ کر لیا گیا، میں ایک باغی کی بیوی تھی۔ ماہ ایک مجرم کی لڑکی تھی۔ کون ہمیں پناہ دیتا، کون ہماری دستگیری کرتا۔ شاید زندگی کی یہ کٹھنائیاں مجھ سے اور ماہ سے نہ برداشت ہو سکیں گی۔ لیکن ہم نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ شاید اس طرح ہمارے گناہ ڈھل جائیں۔ خدا ہماری خطائیں معاف کر دے۔''

عاصمہ کی گفتگو سے سلطان بہت متاثر ہوا، اس نے کہا:

''نہیں، تمہاری یا ماہ کی کوئی خطا نہیں تھی، تم دونوں بالکل بے قصور تھیں۔ افسوس ہے کہ

تمہیں بڑی مصیبتیں سہنا پڑیں۔ ہمیں افسوس ہے، اس کا، ہم معذرت کرتے ہیں۔''

بے ساختہ عاصمہ کے منہ سے نکلا۔

''بس شہنشاہ ذی جاہ آگے کچھ نہ فرمائیے، کنیز نے اپنی ہر مصیبت کا صلہ پالیا۔ آپ شہنشاہِ دوراں ہیں۔ بادشاہِ وقت ہیں، ظل اللہ ہیں۔ آپ کا دل اگر کنیز کے حالِ زبوں پر کڑھ رہا ہے تو میں نے سب کچھ پالیا۔ آپ کی معذرت کی ضرورت نہیں۔''

سلطان نے اور زیادہ تاثر کے عالم میں کہا:

''فی الحال، ہم تمہارے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمہاری جائیداد و املاک وغیرہ ہر چیز واگزاشت کی جاتی ہے۔ آج سے اپنی ہر چیز کی تم مالک ہو، خزانۂ شاہی سے تمہیں ایک ہزار روپے ماہوار ملتے رہیں گے۔''

عاصمہ شکریہ میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سلطان نے فرمایا۔

''ہاں ایک بات اور سن لو...... ماہ بیگم آج سے ہماری لڑکی ہے، اس کے تمام مصارف ہم اپنی جیب خاص سے دیا کریں گے۔ اور جب تم اس کی شادی کہیں طے کرو گے تو یہ تقریب بھی اس کے باپ کی طرح ہمارے ہاتھوں سرانجام پائے گی۔''

اس گفتگو کے بعد سلطان چلا گیا، اور یہ لوگ خوش خوش رخصت ہو گئے۔

(8)

نیا شگوفہ

عاصمہ اور ماہ پورے اعزاز وقار کے ساتھ پھر اپنی شاندار حویلی میں واپس آ گئی تھیں۔ غربت، فلاکت اور بکبت کے دور میں جن عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں، جنہوں نے کبھی بات بھی نہ پوچھی تھی اب خواہ مخواہ ہمدرد اور جاں نثار بن کر وہ پھر حاضر ہونے لگے تھے، دوراد بار میں ان کی بے تعلقی اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ گویا کسی طرح رسم دراہ تھی ہی نہیں۔ اور اب دورِ عروج وفروغ میں یہ کیفیت تھی کہ جیسے ان سے بڑھ کر اس خاندان کا دوست اور وفادار کوئی ہے ہی نہیں۔

عاصمہ خاتون اپنے ساتھ بختیار کو بھی لے آئی تھیں۔ سارا انتظام، اس کے ہاتھ میں تھا۔ نہ عاصمہ نے کبھی اس کے کام میں مداخلت کی، نہ ماہ نے پرسش کی، مسرت اور نشاط کے یہ دن اس طرح آ گئے جیسے غم سے، فکر سے، پریشانی سے، کبھی واسطہ اور سابقہ پڑا ہی نہیں تھا۔

کچھ دنوں سے اس خاندان کے ایک معمر اور دولت مند شخص شمس الدین کی آمد ورفت عاصمہ خاتون کے ہاں بڑھ گئی تھی۔ یہ رشتے میں ماہ کے چچا ہوتے تھے۔ ابوالعباس کے قتل کے بعد انہوں نے اس گھر میں جھانکا بھی نہیں تھا۔ لیکن جب سے حویلی بحال ہوئی تھی اور یہ معلوم ہوا تھا کہ سلطان نے ماہ کو اپنی بیٹی بنالیا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً اسے محل میں طلب کر کے لطف وکرم کی بارش کیا کرتے ہیں۔ ان کا عزیزانہ جذبہ پوری قوت اور شدت سے پھر ابھر آیا تھا۔ وقت بہ وقت ان کی آمد ورفت کا یہ سلسلہ جاری رہنے لگا تھا۔ جب آ بیٹھتے تھے تو پھر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ موضوع صرف ایک ہوتا تھا یعنی اپنے بیٹے سیف الدین کی تعریف وتوصیف:

''سیف الدین ایک لاابالی اور بدمزاج شخص تھا۔ باپ کی دولت، جو بہت زیادہ نہ تھی، دونوں ہاتھوں سے اڑا رہا تھا۔ جب اس کی اصلاح سے مایوس ہو گیا تو باپ کی نگاہِ دوربیں ماہ پر جا کر رک گئی۔ انہوں نے سوچا کہ سیف الدین کی شادی ماہ سے ہو جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اور لڑکے کا مستقبل روشن ہو جائے گا۔ سلطان بہر حال اپنے قول کو نباہے گا۔ جب اس نے ماہ کو لڑکی بنایا ہے تو سیف الدین کو ضرور امرائے دربار میں شامل کرے گا۔ یہی امید تھی جو

انہیں یہاں لے کر آئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ماہ کو سیف الدین کے نام سے چڑ تھی۔ اور عاصمہ خاتون چونکہ سوجھ بوجھ کی خاتون تھیں اس لئے فرزند سعادت اطوار کے تمام کارناموں سے پورے طور واقف تھیں لہٰذا پدر بزرگوار کی ساری قصیدہ خوانی اب تک بے نتیجہ سی ثابت ہوئی تھی۔

ایک روز حسبِ معمول شمس الدین آئے ہوئے تھے۔ جس کمرے میں نشست تھی وہیں ایک بھس بھرا شیر بھی رکھا تھا۔ یہ شیر قد و قامت کے لحاظ سے کچھ غیر معمولی سا تھا، شمس الدین کی اس پر نظر پڑی، پہلے تو کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتے رہے، پھر سوال کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

ماہ مسکرانے لگی، پھر اُس نے کہا: ''بکری''

عاصمہ کو بھی ہنسی آ گئی کہنے لگیں:

''چل ہٹ، شیر ہے۔ ابھی چند دن ہوئے بختیار ہی نے تو اس کا شکار کیا تھا۔ بڑا موذی شیر تھا، آدمی کے خون کی چاٹ پڑ جائے تو پھر دوسرے شکار پر شیر توجہ نہیں کرتا، نہ جانے کتنے آدمیوں کا صفایا کر چکا تھا، لیکن ہمارے بختیار نے ایک ہی وار میں بھٹا سی گردن اڑا دی۔

شمس الدین کو گفتگو کا ایک نیا عنوان ہاتھ آ گیا۔

''شیر کا شکار تو سیف الدین کرتا ہے۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ناغہ جاتا ہو کہ وہ کسی شیر کا شکار نہ کر لاتا ہو، لاکھ سمجھاتا ہوں، بیٹے شیر آخر شیر ہے، کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہو، لیکن جواب کیا دیتا ہے اگر خواہی حیات اندر خطر زی، مجھے تو خطرے سے دلچسپی ہے، میں تو اس کا استقبال کرتا ہوں۔''

عاصمہ خاتون نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش ہو گئیں۔ ماہ ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ پھر بولی:

پھر تو آپ کے گھر میں شیر ہی شیر ہوں گے ہر طرف؟''

اس طنز کو شمس الدین نے محسوس نہیں کیا، نہایت سادگی سے جواب دیا:

''کیا کیا جائے پھر......؟ جوانی کا شوق ہے۔ میں آڑے آنا نہیں چاہتا۔ اور بیٹی سچ پوچھو تو بہادری ہمارے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہمارے ہاں بچے کھلونوں کے بجائے تیروں سے کھیلتے ہیں۔''

ماہ پھر ہنسنے لگی۔ اور اب اتنی دیر کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی داستان طرازی کا یقین نہیں کیا جا رہا ہے، غصہ تو بہت آیا، لیکن پی گئے۔ اس لئے کہ غرض اٹکی ہوئی تھی۔ اور غرض اتنی بڑی تھی کہ کسی قیمت پر اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

کفر واسلام کی جنگ

ستیزہ کار رہا ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویٰ سے شرارِ بو لہبی

(1)

لاہور، ملتان، پشاور کی فتح

۵۶۹ھ میں سلطان غیاث الدین غوری نے اپنے بھائی شہاب الدین غوری کو غزنی کے تخت پر بٹھا کر سلطان معزالدین کا لقب یا خطاب دیا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے تخت سلطان پر جلوس کر کے سب سے پہلے اپنی توجہ ملاحدہ الموت کا اثر مٹانے میں صرف کی۔ علاؤالدین جہاں سوز ملاحدہ کے مسلک پر عامل ہو چکا تھا، اس کے زمانے میں ملاحدہ الموت کے منادوں اور مبلغوں نے سلطنت غور کے قصبوں، شہروں اور گاؤں میں اپنے مسلک کی خوب تبلیغ کی تھی۔ علاؤالدین جہاں سوز کے بیٹے سلطان سیف الدین نے ملاحدہ کے اثر کو مٹایا۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین بھی چونکہ ملاحدہ الموت کا دشمن تھا۔ اُن کے اثر کو مٹانے اور شریعت اسلام کو رواج دینے میں مصروف رہا۔ اب جبکہ سلطان شہاب الدین غوری غزنی کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی تمام تر توجہ اسلام کے رواج دینے اور الحاد وکفر کے مٹانے میں صرف کی، دو سال تک سلطان شہاب الدین نواحِ غزنی کے انتظام اور اردگرد کے ملاحدہ کو خارج کرنے میں مصروف رہا۔ ۵۷۱ھ میں اس کو اطلاع پہنچی کہ ملاحدہ نے ملتان پہنچ کر اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ چونکہ اس سے پہلے ملتان قرامطہ کا مسکن و ملجاء رہ چکا تھا اس لیے ملاحدۂ الموت کو ملتان پر قابض ہونے اور ہندوؤں کی اعانت حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ غوری خاندان چونکہ غزنی خاندان کا

جانشین اور اپنے آپ کو محمود غزنوی کی قائم کی ہوئی سلطنت کا وارث و مالک سمجھتا تھا۔ لہٰذا غزنی پر قابض و متصرف ہونے کے بعد سلطان غیاث الدین غوری کے حسب الایماء سلطان شہاب الدین کا مصمم ارادہ تھا کہ پنجاب پر چڑھائی کر کے خسرو ملک سے پنجاب کا صوبہ چھین لیا جائے۔ چونکہ غزنی پر قابض ہونے کے بعد سلطنتِ غزنی کے تمام صوبوں کو اپنے قبضے میں لانے کا حق خاندان غور کو حاصل ہو چکا تھا۔ مگر چونکہ اپنی حدود مملکت سے ملاحدۂ الموت کا استیصال زیادہ ضروری تھا۔ لہٰذا دو سال تک کسی دوسری جانب متوجہ ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب ملتان پر ملاحدہ کے قابض ہونے کی خبر نے پنجاب کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھا اور ملتان کو پنجاب پر ترجیح دینا ضروری سمجھا گیا۔ کیونکہ ملتان بھی پنجاب کی طرح سلطنت غزنی کا ایک جزو تھا۔

چنانچہ ۵۷۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان پر حملہ کیا۔ ملاحدہ نے سخت مقابلے کے بعد شکست کھائی۔ اور اکثر گرفتار و مقتول ہوئے سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے سالار علی کرماغ کو ملتان کا حاکم و عامل مقرر کیا اور ملتان کے انتظام سے فارغ ہو کر مقام اُچ پر حملہ کیا، جہاں ملتان کے مفرور ملاحدہ نے پناہ لی تھی۔ اُچ کا راجہ مقابلے پر آمادہ ہوا، اور قلعہ بند ہو کر مداخلت کرنے لگا۔ راجہ کی بیوی نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر میری خوبصورت جوان بیٹی سے نکاح کرنے کا وعدہ کرو اور میرے مال و زیور و جائیداد وغیرہ کو نقصان نہ پہنچاؤ تو میں راجہ کا کام تمام کئے دیتی ہوں، اس طرح تمہارا کام بہت ہلکا ہو جائے گا۔ سلطان نے جواب میں راج کماری سے نکاح کرنے کا وعدہ کر لیا، رانی نے راجہ کو ہلاک کر دیا جو خود ہی مغلوب ہو کر ہلاک ہونے والا تھا۔ سلطان نے قلعہ اچ پر قابض ہو کر اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ راج کماری سے نکاح کر کے اس کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔ دو برس کے بعد یہ لڑکی فوت ہو گئی تھی۔ سلطان ابھی اُچ سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اس کے پاس سنقران میں بغاوت برپا ہونے کی خبر پہنچی۔ قلعہ الموت میں ملاحدہ کا بادشاہ محمد بن علی ذکرہ تخت نشین تھا جو تمام سلاطین ملاحدہ میں سب سے زیادہ مستعد و چالاک اور سب سے زیادہ اپنے مسلک کی اشاعت میں سرگرم تھا۔ سنقران کے لوگ محمد بن علی ذکرہ کے ہوا خواہ اور فدائی بن کر اس کے اشارہ سے باغی ہوئے تھے، کہ ملتان کی فتح معرضِ التوا میں پڑ جائے۔ مگر سلطان شہاب الدین نے ملتان و اُچ کو بھی فتح کر لیا، اور وہاں سے سنقران کے ملحد باغیوں کا بھی قتل عام کیا۔ ملتان کی فتح کو شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر پہلا حملہ سمجھنا چاہیے۔ محمد بن علی ذکرہ، فرمانروائے الموت اور راجہ بھیم دیو حاکم نہروالہ (ملک گجرات) کے درمیان شہاب الدین

کے خلاف سلام و پیام کا سلسلہ جاری ہو کر دوستی کا عہد نامہ ہو چکا تھا۔ راجہ بھیم دیو نے ملاحدہ سے امداد پا کر سندھ وملتان علی کرماخ سے چھین لینے کی تیاری کی۔ اور ایک عظیم الشان لشکر اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مرتب کیا۔

اس خبر کو سن کر ۵۷۳ھ کے آخر ایام میں سلطان شہاب الدین غزنی سے روانہ ہو کر ملتان پہنچا۔ اور یہاں سے نہروالہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس سفر میں سلطان سے ریگستان کی صعوبات اور پانی نہ ملنے کا صحیح اندازہ اور بھیم دیو کی جنگی طاقت کا تخمینہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ نہروالا کے قریب سلطان اس وقت پہنچا جبکہ اس کی فوج کا بڑا حصہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے راستے میں ہلاک ہو چکا تھا۔ بھیم دیو نے فدائی لشکر کی مدد سے سلطان کی تھکی ماندی اور نہایت قلیل فوج کو آرام لینے اور ستانے کی مہلت نہ دی۔ سلطانی لشکر کو ہندوؤں اور ملحدوں کی تازہ دم اور کثیر فوج کے مقابلے میں ناکامی تو ہوئی لیکن دشمنوں کے دل پر اس مٹھی بھر فوج کی شمشیر زنی و جاں بازی دیکھ کر ہیبت ضرور چھا گئی۔ سلطان کو بے حصول مقصد نہروالہ سے ۵۷۴ھ میں واپس آنا پڑا۔ اور واپسی میں بھی ریگستان کا سفر بڑی دشواریوں سے طے ہوا۔ اس سفر کے تجربے نے سلطان پر ثابت کر دیا کہ گجرات سے پہلے پنجاب پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ سلطان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، کیونکہ بھیم دیو کو بھی سندھ وملتان پر چڑھائی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سلطان نے ۵۷۵ھ میں غزنی سے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ اور شہر پشاور کو فتح کر کے پنجاب کے مغربی اضلاع کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان اضلاع کے انتظام واستحکام سے فارغ ہو کر ۵۷۶ھ میں لاہور پر حملہ آور ہوا۔ خسرو ملک تاب مقابلہ نہ لا کر لاہور میں محصور ہوا۔ اور اپنے عجز کا اقرار کر کے ایک ہاتھی بطور پیش کش سلطان کی خدمت میں بھیجا۔ اور اپنے بیٹے کو بھی بطور یرغمال سلطان کے پاس بھیج دیا۔ سلطان لاہور سے محاصرہ اُٹھا کر غزنی پہنچا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کو تمام حالات سے اطلاع دی، مغربی پنجاب کے شامل سلطنت اور خسرو ملک کے مطیع ہو جانے کے بعد پنجاب کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔ لہٰذا گجرات کے راجہ اور ملاحدۂ الموت کے خطرہ کا انتظام ضروری تھا۔ سلطان نے اس خطرہ سے مطمئن ہونے کے لئے بہترین تدبیر سوچی۔ اور پنجاب سے غزنی پہنچ کر آرام کیے بغیر فوراً دیبل (کراچی کے قریب) کی طرف فوج کشی کی۔ ساحل سمندر اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا علاقہ فتح کر کے اپنی طرف سے دیبل میں ایک عامل مقرر کر دیا۔ اس فتح اور اس انتظام سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ

ملاحدۂ الموت اور حاکمِ گجرات کے درمیان فوجی امداد آنے جانے کا راستہ مسدود ہو جائے، چنانچہ یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گیا۔ بظاہر سلطان کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ لیکن خسرو ملک نے لاہور میں پنجاب کے ہندوؤں کی مشہور جنگ جو قوم گکھڑوں کی بھرتی شروع کی، اور ان کو اپنی طرف مائل کر کے مغربی پنجاب کو فتح کرنے کی تیاری شروع کی۔ سلطان کو جب خسرو ملک کے اس ارادہ کا حال معلوم ہوا تو ۵۸۲ھ میں اس نے لاہور پر حملہ کیا اور خسرو ملک کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح تمام ملک پنجاب شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گیا۔ سلطان نے ملتان سے علی کرماخ کو طلب کر کے پنجاب و ملتان دونوں صوبوں کی حکومت اس کے سپرد کی۔ مولانا سراج الدین کو لشکر ہندوستان کا قاضی اور امام مقرر کیا۔ خسرو ملک کو اپنے ہمراہ غزنی لے گیا۔ غزنی سے سلطان غیاث الدین کی خدمت میں بمقام فیروز کوہ روانہ ہو گیا۔ جہاں پانچ سال قید رہ کر ۵۸۷ھ میں خسرو ملک اور اس کا بیٹا دونوں فوت ہوئے یا ہلاک کیئے گئے۔

خسرو ملک کی نسبت اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اُس نے اپنے ایام حکومت میں پنجاب کے مشرقی علاقہ پر دہلی کے راجہ کو قبضہ کر لینے دیا تھا۔ اور کوئی تدارک اس کا نہ کر سکا تھا۔ اب جب کہ سندھ و ملتان اور پنجاب کے صوبے بھی سلطان کے قبضہ میں آ چکے تھے تو یہ کسی طرح جائز نہ تھا کہ سلطنت محمودی کا ایک حصہ دہلی کے راجہ کو غصب کر لینے دیا جائے اور اس سے واپس نہ مانگا جائے جس پر کہ اس نے خسرو ملک کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر غاصبانہ کر لیا تھا۔[1]

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملاحدہ بڑی آسانی سے ضرورت کے وقت ہندو راجاؤں سے مسلمان حکومتوں کے خلاف ساز باز کر لیا کرتے تھے۔ اور ہندو راجگان اپنی مصلحت کے مطابق اس پر فوراً تیار ہو جایا کرتے تھے کہ دشمن کو اس طرح کمزور اور فنا کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو الموت کے فدائیوں کے ذریعہ تباہ کر دیا جائے۔ اور پھر بہ اطمینان فدائیان الموت کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، کیونکہ اتنے دور دراز مقام پر باہر سے کمک نہیں مل سکتی۔ اور فدائیانِ الموت بے بسی کی موت مرنے پر مجبور تھے۔

چنانچہ ملتان، اچ، سنقران، گجرات (نہروالہ) ہر مقام پر ہندو راجگان نے الموت کے فدائیوں کی دل و جان سے مدد کی۔

ان حالات نے سلطان کو اس عزم پر مستحکم کر دیا کہ کم از کم پنجاب کا علاقہ ہندو سیادت

[1] آئینہ حقیقت نما (مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی)

سے بالکل خالی کرالیا جائے۔ اور اس کا جواز واستحقاق بھی تھا کیونکہ محمود غزنوی کا پورے پنجاب پر تسلط تھا۔ اور سلطنت غوری، درحقیقت سلطنت غزنوی کی جائز وارث اور جانشین تھی۔

چنانچہ سلطان شہاب الدین نے غزنی سے نکل کر سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان راجگان کی سرکوبی اور قلع قمع کیا۔ جنہوں نے اس کے خلاف فدائیان الموت کو مدد دی تھی۔ ان سے نپٹ کر اس نے دیبل کو فتح کیا، تاکہ کسی طرح کی بحری کمک ایک دوسرے کو نہ پہنچ سکے۔

اس طرح ناکہ بندی سے فارغ ہو کر اب اس نے اس طرف توجہ کی کہ وہ علاقہ ہندو قیادت سے واپس لیا جائے جسے اپنی کمزوری اور خودغرضی کے باعث خسرو ملک نے پرتھوی راج کے حوالے کر دیا تھا۔ کیونکہ جب تک یہ علاقہ ہاتھ نہیں آتا پنجاب پر موجود تسلط عملی طور پر بیکار تھا۔ پرتھوی راج ہندوستان کا سب سے زیادہ طاقت ور اور جنگ جو فرمانروا تھا، شہاب الدین اس کے مقابلے میں تعداد سپاہ، ساز و سامان جنگ اور وسائل و ذرائع کے اعتبار سے کمزور تھا، وہ چاہتا تھا کہ صلح سے معاملہ طے ہو جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو اس مقصد کے لیے داؤں پر اپنی جان تک لگانے کو تیار تھا۔

(2)
سُلطان کا ایلچی

سلطان شہاب الدین غوری اپنے ایوانِ زریں میں خاموش بیٹھا ہے اس وقت تخلیہ ہے۔ وزیروں اور ندیموں میں سے کوئی حاضر نہیں ہے صرف بختیار موجود ہے، سلطان متفکر نظر آ رہا ہے، کبھی ٹہلنے لگتا ہے، کبھی آ کر مسند پر بیٹھ جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کسی خاص مسئلے کے حل کرنے میں مصروف ہے۔ آخر بختیار سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے سلطان عالم پناہ اس وقت کسی خاص مسئلے پر غور فرما رہے ہیں۔''

سلطان نے کچھ تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں بختیار تمہارا خیال صحیح ہے ایک بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جو اس وقت قابل غور ہے۔''

بختیار نے عرض کیا۔

''غلام کو اس کے بارے میں اگر کچھ اطلاع ہوتی تو شاید وہ بھی کچھ عرض کر سکتا۔ ویسے اتنا تو سلطان عالم پناہ کا عندیہ معلوم کیے بغیر عرض کر سکتا ہے کہ اگر کوئی مہم درپیش ہو تو غلام بڑی مسرت سے اسے اپنے ذمے لینے کو تیار ہ اور خواہ اسے اپنی جان کیوں نہ قربان کر دینی پڑے ہر قیمت پر وہ اسے اتمام تک پہنچا کر رہے گا۔''

''ہمیں یقین ہے۔'' سلطان نے کہا۔

بختیار کچھ نہ کہہ سکا۔ اور سلطان نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

ذرا دیر کے بعد پہلو بدلتے ہوئے سلطان نے جائزہ لینے والی نظروں سے بختیار کو دیکھا اور کہا۔

''واقعہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑی مہم درپیش ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ تم ہی اسے انجام دو...... تمہاری دلیری اور بہادری پر ہمیں اعتبار ہے۔''

یہ سُن کر بختیار خوش ہو گیا۔ اس نے وفورِ مسرت سے بے تاب ہو کر عرض کیا۔

''سلطانِ عالم پناہ ارشاد فرمائیں۔ غلام ابھی اسے سرانجام دینے کے لیے روانہ

ہو جائے گا۔''

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''نہیں......اتنی جلدی ضرورت نہیں ہے......لیکن شاید تمہیں جلد ہی جانا پڑے گا، ممکن ہے دو چار روز میں......یا شاید کل ہی!''

بڑی آمادگی اور مستعدی کے ساتھ بختیار نے کہا:

''بہ سروچشم......غلام ہر خدمت بجالانے کے لیے تیار ہے!''

اب سلطان اور زیادہ سنجیدہ ہو چکا تھا، اس نے کہا۔

''خسرو ملک غزنویوں کی طرف سے پنجاب کا گورنر تھا......کیا تمہیں معلوم ہے؟''

بختیار نے اقرار میں گردن ہلائی...... سلطان شہاب الدین نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''جسے گویا ہمارا گورنر ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ خاندانِ غزنوی کی وراثت ہمارے حصے میں آئی ہے، اس کے تمام مقبوضات بھی ہمارے ہی زیرنگیں ہیں۔''

''بجا ارشاد ہوا۔ سلطان عالم پناہ!......مگر؟''

''مگر یہ کہ وہ ایک کمزور شخص ثابت ہوا۔ اُسے صرف اپنی عزت اور سربلندی کا خیال تھا، اسلام کی سربلندی اور ملت اسلامیہ کی سربلندی سے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ چاہتا تھا کہ ہر قیمت پر اس کا اقتدار قائم رہے، اور اس ہوس میں اس سے بہت بڑا قومی گناہ سرزد ہو گیا تھا۔''

بختیار نے سراپا حیرت بن کر سوال کیا:

''قومی گناہ......سلطانِ عالم پناہ!''

سلطان نے برہمی اور خشونت کے ساتھ کہا:

''ہاں قومی گناہ۔ ناقابلِ معافی قومی گناہ......جس کی تلافی اور جس کا تدارک ہمارا فرض ہے۔ اس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے پنجاب کا ایک حصہ پرتھوی راج کے حوالے کر دیا تھا۔ تاکہ بے غل وغش وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکے ہم نے خسرو ملک کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن جو قومی گناہ اس سے سرزد ہوا تھا اس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ اور جب تک اس کی تلافی نہ ہو ہمیں قرار نہیں آ سکتا۔''

''بجا ارشاد ہُوا سلطانِ عالم پناہ، لیکن تلافی کی صورت کیا ہے؟''

''(عزم کے ساتھ) تلافی کی صرف ایک صورت ہے، وہ علاقہ ہمارے پاس رہے گا

پرتھوی راج کے پاس نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمارا ہے ہم اس کے مالک ہیں۔ پرتھوی راج کو یا کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہمارے مقبوضات کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اور اگر کسی نے ایسی جرأت کی تو اسے قرار واقعی سزا دینے میں اور نہ بھولنے والا سبق دینے میں ہمیں کوئی تامل نہ ہوگا۔

''تو سلطان عالم پناہ پرتھوی راج سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟''

''ہاں۔''

''پھر غلام کو فوج کے ساتھ ایک معمولی سپاہی کی طرح جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے..... کب روانہ ہوگی ہماری فوج؟''

سلطان شہاب الدین نے جواب دیا۔

''فوج روانہ ہوگی اور ضرور روانہ ہوگی اور یقیناً ہم بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ اور جہاں ہم ہوں وہاں تمہارا موجود رہنا لازمی ہے۔''

''بندہ پروری ہے سلطانِ والا جاہ کی!''

''لیکن ابھی فوج بھیجنے کا وقت نہیں آیا ہے، پرتھوی راج پر چڑھائی کرنے سے پہلے ہم اسے ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔''

بختیار نے پوچھا:

''وہ کس طرح سلطانِ والا شان؟''

سلطان شہاب الدین غوری نے بتایا:

''وہ اس طرح کہ نامہ و پیام کے ذریعے ہم اُسے آمادہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو غلطی اس سے سرزد ہو چکی ہے اس کی وہ خود تلافی کر دے۔ ہمارا علاقہ واپس کر دے اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں، وہ ہمارا دوست ہے..... لیکن اگر وہ سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارا علاقہ واپس کرنے پر تیار نہیں تو پھر بے شک تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔ اور بلاشبہ اس کا فیصلہ آخری ہوگا۔

بختیار نے سر ادب جھکا کر عرض کیا:

''بے شک، بے شک۔''

شہاب الدین کچھ تامل کے بعد بولے:

''ہم پرتھوی کے پاس تمہیں اپنا ایلچی بنا کر بھیجنا چاہتے ہیں۔ تم اس کے پاس جاؤ، ہمارا نامہ دو اور اس کا جواب لاؤ، ہمیں امید ہے کہ تم اسے قائل کر سکو گے کہ اس کا موجودہ طرزِ عمل صحیح

نہیں ہے۔''

بختیار نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا:

''غلام یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہے۔''

اس جواب سے شہاب الدین خوش ہو گیا، اس نے کہا:

''کل جمعہ کا مبارک دن ہے، ہم چاہتے ہیں کہ نماز جمعہ کے بعد اس مہم پر تم روانہ ہو جاؤ۔''

بختیار نے عرض کیا۔

''ارشاد والا کی تعمیل غلام دلِ و جان سے کرے گا۔''

شہاب الدین کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ اضطراب جو نظر آ رہا تھا اب اس کا کہیں پتہ نہ تھا، جس فکر نے اسے پریشان کر رکھا تھا وہ دور ہو چکا تھا...... وہ مسند سے اُٹھا اور گویا ہوا۔

''بس تو سامانِ سفر تیار کر لو۔''

بختیار نے جواب میں عرض کیا،

شاہ عالم پناہ، سپاہی ہر وقت تیار رہتا ہے، تلوار اس کی کمر میں ہمیشہ حمائل رہتی ہے، وہی اس کا ساز و سامان ہے وہی اس کا اوڑھنا بچھونا، جہاں پناہ کا اگر حکم ہو تو غلام ابھی اور اسی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتا ہے۔''

شہاب الدین کا چہرہ یہ باتیں سن کر پھول کی طرح کھل اٹھا، اس نے بختیار کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور گویا ہوا۔

شاباش نوجوان شاباش...... مجھے تم ہی جیسے دلیروں اور مجاہدوں کی ضرورت ہے، اگر تم جیسے چند سپاہی بھی میرے ساتھ ہوئے تو میں بڑی سے بڑی طاقت کو شکست دے سکتا ہوں، تمہارے اس جذبہ کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، مجھے امید ہے تم ویسے ہی ثابت ہو گئے جیسی امید ہے۔

اس گفتگو کے بعد بختیار نے ادب سے سر جھکایا اور رخصت ہو گیا!

(3)

سفر پر

محمد بختیار خلجی سلطان سے رخصت ہو کر گھر پہنچا، اور سفر کا سرو سامان کرنے لگا۔ رات کا بڑا حصہ سفر کا سامان ٹھیک ٹھاک کرنے میں صرف ہو گیا۔ ماہ برابر اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی، اس نے لاکھ کوشش کی کہ یہ جا کر سو رہے مگر اس نے ایک نہ مانی، دونوں میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عاصمہ خاتون بھی برابر ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ بڑی رات گئے یہ لوگ اس کام سے فارغ ہوئے اور اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔

صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی بختیار باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ سواروں کا ایک دستہ جا رہا تھا۔ اس کے انتظام کی دیکھ بھال ضروری تھی۔ پھر نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ جامع مسجد میں فریضہ انجام دیا۔ نماز کے بعد سلطان نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا اور کہا۔

''تم ایک بہت بڑے کام پر جا رہے ہو، تمہاری عقل، فراست، تدبر اور معاملہ فہمی پر مجھے اعتماد ہ، بے شک آخری چارۂ کار لڑائی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم ضرور لڑیں گے۔ اور دشمن دیکھ لے گا کہ ہماری لڑائی کیسی ہوتی ہے۔ لیکن کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ خلق خدا کا خون نہ بہے۔ معاملات اگر صلح و آشتی سے طے ہو جائیں تو بہت بہتر ہے۔ جہاں میری یہ ہدایت ہے کہ رائے پتھورا (پرتھوی راج) کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے وہاں اس سے زیادہ سختی کے ساتھ میرا یہ فرمان بھی ہے کہ اپنی طرف سے ہرگز کوئی اشتعال انگیز بات نہ کرنا، مجھے امید ہے میری ان ہدایات پر تم پوری طرح عمل کرو گے۔''

بختیار نے اپنے بادشاہ ذی جاہ سے عرض کیا:

''سلطان عالم پناہ نے جو کچھ ارشاد کیا ہے غلام اس کی حرف بہ حرف تعمیل کرے گا۔ اور حتی الامکان ہرگز کوئی ایسا موقع نہ آنے دے گا کہ معاملات رو براہ ہونے کے بجائے الجھ جائیں۔''

سلطان نے فرمایا:

جزاک اللہ! ہم تم سے یہی توقع رکھتے تھے...... جاؤ خدا تمہارا حافظ ناصر ہو۔"

سلطان سے رخصت ہو کر بختیار گھر پہنچا۔ صبح جب وہ گیا تھا اس وقت تک ماہ خوش وخرم نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، وہ حد درجہ غمگین اور دل گرفتہ نظر آ رہی تھی۔ یہ تبدیلی احوال دیکھ کر بختیار نے پوچھا۔

"ماہ کیا بات ہے تم اتنی افسردہ اور مضمحل کیوں نظر آ رہی ہو، میں تو یہ چاہتا تھا کہ تم ہنستی اور مسکراتی ہوئی مجھے رخصت کرو۔"

ماہ نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، بختیار نے بے تاب ہو کر کہا۔

"ماہ کیا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟ تمہیں روتا چھوڑ کر اگر جاؤں گا تو میرا حوصلہ جواب دے جائے گا۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اپنا فریضہ انجام نہ دے سکوں!...... خدا کے لیے ایسا نہ کرو...... ہنسو، مسکراؤ۔

ماہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ بختیار مطمئن نہ ہوا۔ اس نے کہا:

"نہیں، یوں نہیں...... باقاعدہ مسکراؤ، سچ مچ ہنسو۔"

ماہ کے نازک ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر پیدا ہوئی، اس گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کب تک واپس آ جائیں گے اس سفر سے؟"

بختیار نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہا:

"تین چار مہینے تو لگ جائیں گے، بہت دُور جانا اور واپس آنا ہے۔"

"راستہ خطرناک تو نہیں ہے؟"

"تم جانتی ہو میں خطروں سے دلچسپی لیتا ہوں، ان سے ہراساں نہیں ہوتا۔"

ماہ نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا:

"میں جانتی ہوں آپ بڑے بہادر ہیں۔"

بختیار ہنستا ہوا گویا ہوا،

"مجھے اپنے بہادر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، کم از سیف الدین سے تو کہیں زیادہ بہادر ہوں۔"

ماہ نے چھیڑتے ہوئے جواب دیا:

''یوں تو آپ رستم سے بھی زیادہ بہادر ہیں، لیکن کون زیادہ بہادر ہے اس کا فیصلہ تو مقابلے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔''

بختیار ہنسنے لگا۔

''بہت خوب، سمجھ گیا جناب کا خیال......تم ہم دونوں کو لڑانا چاہتی ہو۔''

وہ ہنستی ہوئی بولی:

''لڑانا تو نہیں چاہتی...... ہاں لڑائی ضرور دیکھنا چاہتی ہوں، تاکہ معلوم تو ہو آپ دونوں میں واقعی کون زیادہ شہ زور ہے، یا کون زیادہ دلاور ہے، چچا (شمس الدین) سے سیف کی تعریف سنتے سنتے کان پک گئے ہیں میرے، یہ سلسلہ تو بند ہو کسی طرح!''

بختیار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے واپس آ لینے دو ایسا معلوم ہوتا ہے اس جانِ ناتواں کی واقعی شامت آ گئی ہے کچھ بھی دم تو نہیں ہے اس میں۔''

ماہ نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا تو نہ کہیے......جس شخص نے سینکڑوں شیر ہلاک کر ڈالے ہوں، جس کے گھر میں شکار کیے ہوئے شیروں کے اتنے ڈھانچے پڑے ہوں کہ تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہ گئی ہو اسے آپ جانِ ناتواں کہہ رہے ہیں، اتنی خود بینی اور خود پسندی بھی اچھی نہیں ہوتی۔''

اسی اثناء میں عاصمہ خاتون بھی آ گئیں، انہوں نے پوچھا:

''بیٹے! کیا تمہارے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا؟''

بڑے سعادت مندانہ لہجے میں بختیار نے جواب دیا:

''جی ہاں! اب میں جاتا ہوں۔''

''خدا کی حفظ و امان میں۔''

''دُعا کیجئے کہ جس کارِ اہم پر جا رہا ہوں اُسے اچھی طرح انجام دے کر واپس آؤں۔''

''خدا کے بھروسے پر اپنے بیٹے سے مجھے یہی امید ہے۔ تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی جا رہے ہیں؟''

''صرف پچاس سواروں کا ایک دستہ میرے ساتھ ہوگا۔''

''اتنا اہم کام اور اتنے تھوڑے آدمی؟''

''(ہنستے ہوئے) میں کوئی لڑنے تو نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو سلطان کا ایلچی بن کر اجمیر اور دلی کے راجہ پرتھوی راج کے پاس جا رہا ہوں۔ ہمارا مقصد صلح ہے جنگ نہیں۔

ماہ بیچ میں بول پڑی:

''اوہو، اس لیے آپ اتنے مطمئن اور بہادر نظر آ رہے ہیں، واقعی پھر تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

عاصمہ نے گھور کر ماہ کی طرف دیکھا وہ چہکی ہو رہی...... پھر کچھ دعائیں پڑھ کر دم کیا اور خدا کے حفظ و امان میں اُسے رخصت کر دیا۔

(4)

پرتھوی راج کے سامنے

راستہ دشوار گزار اور کٹھن تھا، لیکن بختیار نے ہمت نہ ہاری۔ ہر دشواری کا مقابلہ کرتا، ہر رکاوٹ کو دور کرتا۔ بھوک، پیاس، گرمی، دھوپ، موسم کی نامساعدات اور حالات کی ناموافقت کا مقابلہ کرتا وہ سیلِ رواں کی طرح برابر آگے بڑھتا رہا۔ جہاں تھک جاتا پڑاؤ ڈال دیتا۔ جب تازہ دم ہوتا اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اتفاق سے جو ساتھی اس ملے تھے وہ بھی بڑے باہمت اور باحوصلہ تھے۔ کبھی کسی موقع پر ان کی جبیں پر شکن نہیں پڑی۔

آخر منزل طے کرتا وہ دہلی پہنچا۔

لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پرتھوی راج دہلی میں نہیں اجمیر میں ہے اس کا زیادہ تر قیام وہیں رہتا ہے۔

اب پھر ایک نئی منزل سامنے تھی۔

دہلی سے یہ چھوٹا سا قافلہ پھر آگے بڑھا اور اجمیر کی طرف چل پڑا، یہاں پرتھوی راج موجود تھا۔

دس پندرہ روز کے انتظار کے بعد، باریابی کی اجازت ملی۔ پرتھوی راج نے سر سے پاؤں تک ایک نظر بختیار پر ڈالی۔ پھر پُر رعب آواز میں پوچھا۔

''کیا تم سلطان شہاب الدین غوری کے ایلچی ہو؟''

بختیار نے نہایت شائستگی اور متانت کے ساتھ جواب دیا۔

''مہاراج کا خیال صحیح ہے، میں غزنی سے آ رہا ہوں، اور سلطان کا نامہ اپنے ساتھ لایا ہوں۔

پرتھوی راج کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''وہ نامہ پیش کرو۔''

بختیار نے سلطان کا مکتوب پیش کر دیا، پرتھوی راج نے وہ نامہ اپنے وزیر کی طرف

بڑھایا۔

وزیر نے سلطان کا مکتوب پڑھنا شروع کر دیا۔

"خدا کے ناچیز بندے شہاب الدین غوری کی طرف سے جو غزنی کا بادشاہ ہے دہلی اور اجمیر کے فرمانروا مہاراج ادھیراج پرتھوی راج کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی مملکت اب ہمارے قبضے میں ہے، ہم اس کے جائز وارث ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ خسرو ملک کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مہاراج نے ہمارے مقبوضات کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ طرزِ عمل اصول حکمرانی کے خلاف ہے۔ بادشاہوں کو آپس میں لڑنے کے بجائے دوستی اور آشتی کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لینے چاہئیں تا کہ خلق خدا کا خون نہ بہے۔ پس ہم مہاراج سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دستِ مصالحت کو قبول کریں۔ ہمارے علاقے واپس کر دیں۔ اور ایک ایسا معاہدہ کر لیں کہ ایک دوسرے کے مقبوضات پر حریصانہ نظر نہ ڈالیں گے۔"

پرتھوی راج خط سنتا جا رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ جب خط سُنایا جا چکا تو بختیار کی طرف متوجہ ہو کر اُس نے کہا:

"ادعائے دوستی کے ساتھ یہ ناواجب مطالبہ عجیب وغریب حرکت ہے اسے کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا...... کیا تمہارا سلطان نہیں جانتا کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہم اس ملک کے مالک ہیں۔ ایک غیر ملک کا فرمانروا کیونکر ہمارے ملک کے کسی علاقے پر کسی طرح دعویٰ کر سکتا ہے۔ کیا تم ہمارا مطلب سمجھ گئے؟"

"بختیار نے جواب دیا؟"

"آپ کا مطلب تو بہت صاف اور واضح ہے!"

پرتھوی راج اس جواب سے خوش ہو گیا۔

"کیا تم اپنے بادشاہ تک ہمارا جواب پہنچا دو گے؟"

بختیار نے جواب دیا:

"ضرور پہنچا دوں گا، مہاراج...... لیکن، اگر گستاخی معاف ہو تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جواب تو ایک قسم کا اعلان جنگ ہے۔"

پرتھوی راج پھر بھڑک اُٹھا۔

"کیا کہا...... اعلان جنگ؟"

بختیار نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہا:

''مہاراج میرا یہی خیال ہے۔''

پرتھوی راج کا غصہ اب زیادہ نمایاں ہونے لگا تھا۔

''کیا تمہارے سلطان نے دوستی کے اعلان کے ساتھ جنگ کا اعلان بھی کیا ہے...... اگر یہ بات ہے تو اس کو مطلع کر دو کہ ہم جنگ کے لیے تیار ہیں۔ آج تک کوئی دشمن ہم پر غالب نہیں ہو سکا۔''

اب بختیار کا ضبط بھی جواب دیتا جا رہا تھا۔

''میرا سلطان بڑے بڑے دشمنوں کو زیر کر چکا ہے۔ اس کی ہمت اور دلیری کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ طبعاً امن پسند ہے وہ جنگ سے نفرت کرتا ہے، لیکن اگر جنگ اس پر مسلط کر دی جائے تو پھر اس سے بڑھ کر شہ زور، خوفناک اور ناقابل مزاحمت دشمن بھی کوئی نہیں ہے۔''

پرتھوی راج نے کڑک کر کہا۔

اگر تم سفیر نہ ہوتے تو تمہاری گردن اُڑا دی جاتی۔ اس طرح کی گستاخی ہمارے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے۔''

بختیار نے جواب دیا۔

''مہاراج کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے زندگی کے مقابلے میں موت زیادہ عزیز ہے۔ شہید کی موت، میں موت سے نہیں ڈرتا، اور یہ بھی عرض کر دوں کہ میں بزدل اور کم حوصلہ نہیں ہوں، مرنے سے پہلے کچھ اور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار لوں گا تب مروں گا۔''

پرتھوی راج کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

''یہ دھمکی ہے۔''

بڑی ملائمت اور نرمی لیکن عزم و استقلال کے ساتھ بختیار نے کہا:

''نہیں مہاراج یہ دھمکی نہیں صرف اظہار حقیقت ہے۔''

پرتھوی راج نے سوال کیا:

''تمہارے سلطان کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے ملک میں قدم رکھے؟''

بختیار نے جواب دیا:

''فاتح اور کشور کشا دوسروں ہی کے ملک میں قدم رکھ کر فاتح اور کشور کشا بنتے ہیں۔''

پرتھوی راج نے اور زیادہ برہمی کے ساتھ کہا۔

''ان علاقوں پر تمہارے سلطان کا کوئی حق نہیں ہے۔''

بختیار نے اپنے دعوے کی دلیل پیش کر دی۔

''مہاراج یہ بات صحیح نہیں ہے، ان علاقوں پر سلطان محمود غزنوی نے قبضہ کیا تھا۔ ان کی تلوار نے ان علاقوں کو فتح کیا تھا، اب سلطنت غوری سلطنتِ غزنوی کی وارث ہے۔ وہ ان علاقوں پر کسی کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ اسی کے علاقے ہیں اسی کے پاس رہیں گے...... ویسے ہمارے سلطان کی امن پسندی کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ گو وہ سارے ہندوستان کو فتح کر لینے کی طاقت رکھتے ہیں مگر اپنے مقبوضات سے باہر قدم رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ہرگز آپ کے یا راجگان ہند میں سے کسی کے علاقے پر کوئی دعویٰ نہیں رکھتے۔''

پرتھوی راج نے حد درجہ خشمناک لہجے میں کہا۔

''کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک پر للچائی ہوئی نظر کوئی ڈال سکے......؟''

بختیار نے ویسی ہی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

''کیوں نہیں ہو سکتا مہاراج، لیکن ہمارا سلطان ایسا کرنا نہیں چاہتا وہ جنگ کو صلح پر ترجیح دیتا ہے۔ اور میں اس کی طرف سے صلح کا پیام لے کر آیا ہوں۔''

نخوت اور تکبر کے ساتھ پرتھوی راج نے کہا:

''ہم اس پیام کو قبول نہیں کر سکتے، ہم اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں......''

بختیار نے افہام وتفہیم کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا:

''بیشک مہاراج انکار کر سکتے ہیں۔ وہ صلح اور دوستی کی دعوت ٹھکرا سکتے ہیں، وہ اپنی رعایا کے ہزاروں آدمیوں کو میدانِ جنگ میں بھیڑ بکریوں کی طرح کٹوا سکتے ہیں......لیکن میں انسانیت کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ بے گناہوں پر رحم کیجئے۔ جنگ کا اعلان کر دینا آسان ہے لیکن اسے نباہ لے جانا مشکل ہے لڑائی کا بگل ہر وقت بجایا جا سکتا ہے لیکن جو لوگ لڑائی میں مریں گے پھر وہ زندہ نہیں کیے جا سکتے۔''

شاید بختیار کی تقریر ابھی جاری رہتی۔ لیکن پرتھوی راج اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ اس نے کڑکتے ہوئے لہجے میں بگڑتے ہوئے تیور کے ساتھ کہا:

''تم اپنے بادشاہ کے ایلچی کی حیثیت سے آئے ہو، یا ہمارے ناصح اور مربّی بن کر......! ہم اس طرح کی باتیں سننا نہیں چاہتے۔ ہم نے جواب دے دیا۔ یہ ملک ہمارا ہے۔ اور اس ملک کا ایک چپہ بھی کسی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا، اور ہاں کیا تم ہمارا بھی ایک پیام سلطان تک پہنچا دو گے؟''

بختیار نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا:

''ضرور پہنچا دوں گا مہاراج......ارشاد فرمائیے وہ کیا پیام ہے؟''

پرتھوی راج نے زہر خند کرتے ہوئے کہا:

''کیا تمہارا سلطان پشاور، لاہور، سیالکوٹ، ملتان وغیرہ پر قابض نہیں ہے؟''

''جی ہاں یہ علاقے ہمارے ملک میں شامل ہیں!''

''لیکن یہ علاقے ہماری ملکیت ہیں، سلطان سے کہو کہ انہیں واپس کر دے اگر اس نے امن و امان کے ساتھ یہ علاقے ہمیں واپس دے دیئے تو پھر ہم مستقل طور پر پیمان دوستی باندھنے کو تیار ہیں۔ لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا تو پھر تلوار ہمارا فیصلہ کر دے گی، اور وہ وقت بہت نازک ہوگا۔''

بختیار نے کہا:

''یہی تو میں بھی عرض کر رہا تھا، جنگ کا شروع کرنا آسان ہے لیکن اس کے نتائج کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔''

لیکن اگر تمہارا سلطان راہِ راست پر نہ آیا تو جنگ ہم شروع کریں گے، لیکن جنگ کے تلخ نتائج اسی کو برداشت کرنا ہوں گے۔''

مایوسی کے ساتھ بختیار گویا ہوا۔

''اس کے معنی یہ ہیں کہ مہاراج نے ہمارے بادشاہ ذی جاہ کا پیامِ صلح ٹھکرا دیا۔''

''پرتھوی راج نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کہا۔''

''کیا تمہیں شبہ ہے کچھ؟''

بختیار نے جواب دیا:

''مہاراج مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے، لیکن ایک مرتبہ میں پھر یہ استدعا کرتا ہوں کہ اپنے جواب پر غور کر لیجئے......نظر ثانی کر لیجئے، اس پر۔''

پرتھوی راج نے حقارت کی ایک نظر بختیار پر ڈالی اور گویا ہوا:

''اب ہم اتنا اور اضافہ کرتے ہیں اپنی گفتگو میں کہ اگر تمہارے سلطان نے ہمارا یہ مطالبہ نہ مانا تو نہ صرف ہماری فوجیں ملتان، لاہور اور پشاور وغیرہ کو چھین لیں گی بلکہ آگے بڑھیں گی اور بڑھتے بڑھتے غزنی تک پہنچ جائیں گی...... یقیناً وہ وقت بہت نازک ہوگا، اور اس کے نتائج بھگتنا بہت زیادہ مشکل ہوگا۔''

بختیار نے خشک لہجے میں پرتھوی راج سے کہا۔

''میں آپ کا یہ پیغام اپنے بادشاہ تک پہنچا دوں گا۔''

پرتھوی راج پھر ہنسنے لگا...... خندۂ حقارت...... پھر اُس نے کہا۔

''اور جو کچھ تمہارا سلطان جواب دے، وہ بھی جلد از جلد ہم تک پہنچایا جائے!

بختیار نے اس لب ولہجہ میں کہا:

''مہاراج اگر جواب چاہتے ہیں تو میں ابھی اور یہیں اور اسی وقت دے سکتا ہوں۔''

پرتھوی راج نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا، پھر پوچھا:

''کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

وہ بولا:

''میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ واقعی جنگ کے لیے تیار ہیں تو جتنی تیاریاں کر سکتے ہیں کر لیجئے، کیونکہ مجھے یہاں سے غزنی پہنچنے میں ضرور دیر لگے گی، لیکن سلطان کو اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ یہاں آنے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ سیلِ رواں ہوں گے، اور اس سیلِ سبک سیر وز مین گیر کو دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔''

پرتھوی راج نے پھر ایک قہقہہ لگایا:

''تم اپنے بادشاہ کے ضرورت سے زیادہ وفادار ہو۔''

بختیار نے تیور بدل کر کہا:

مجھے اس پر فخر ہے۔

پرتھوی راج نے کہا۔

''کیا کسی جنگ میں تم نے شرکت کی ہے؟''

بختیار نے بے جھجک کہا:

''لوگوں کوشیر وشکار سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی مجھے جنگ سے، میدانِ جنگ سے ہے۔''

پرتھوی راج کا رنگ رُخ پھر بدل گیا، اس کا چہرہ تمتما گیا، آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے، اُس نے گرجتے ہوئے کہا:

''تم گستاخ ہو، آدابِ سفارت سے ناواقف ہو۔ اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہوتو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

بختیار نے اُٹھتے ہوئے کہا:

''میں جاتا ہوں، لیکن اپنے سلطان کے ساتھ پھر آؤں گا۔''

پرتھوی راج نے خون آسام نظروں سے بختیار کو دیکھا اور برہمی کے ساتھ اُٹھ کر راج محل میں چلا گیا۔

(5)

خواجہ آستانے پر

باریابی کے انتظار میں بختیار کو دس پندرہ دن اجمیر میں گزارنا پڑے تھے یہاں آ کر اس نے ایک مسلمان بزرگ کا شہرہ سُنا تھا کہ وہ کفرستان میں خاموشی کے ساتھ مبلغِ اسلام کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تھے۔ کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو اور سعادت دارین حاصل کرے۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ پیش آ گئی کہ یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔

اب پرتھوی راج سے رخصت ہو کر جب اجمیر سے واپس جانے کا وقت آیا تو بختیار کسی طرح بھی اپنا جذبہ اشتیاق نہ دبا سکا، اس نے طے کر لیا کہ حضرت خواجہ کی زیارت کے بغیر وہ ہرگز غزنی واپس نہیں جائے گا۔ چنانچہ دربار سے واپس آ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت خواجہ صاحب کے آستانے پر سر کے بل حاضر ہوا۔

ایک سادہ سی اور مختصر سی خانقاہ میں حضرت خواجہ صاحب ایک مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چہرے پر نور برس رہا تھا، تابانی کا یہ عالم تھا کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی، جلال کی یہ کیفیت کہ کافر بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اور لطف کی بات یہ کہ حاضرین سب کے سب ہندو تھے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ ان کا مہاراج حضرت خواجہ اور ان کی دینی سرگرمیوں سے بہت برہم ہے اور انہیں طرح طرح سے ستاتا اور پریشان کرتا رہتا ہے۔ یہ جوش عقیدت سے مجبور ہو کر اپنی جان خطرے میں ڈال کر برابر حاضر ہوتے رہتے تھے۔

بختیار ایک گوشے میں جا کر ادب سے بیٹھ گیا۔ یہ لوگ اپنی مختلف مرادوں کے سلسلے میں حضرت سے دُعا کرانے آئے تھے، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد رفتہ رفتہ مجمع ختم ہو گیا۔ اور حضرت تنہا رہ گئے، اب اُنہوں نے بختیار کی طرف دیکھا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم مہاراج سے مل لیے۔''

''یہ سوال سن کر بختیار کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا، حضرت کی خدمت میں آج

پہلی بار مجھے حاضری کا موقع ملا ہے۔ انہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں مہاراج سے ملنے آیا تھا۔ بہر حال اُس نے عرض کیا۔

''میں وہیں سے حاضر ہو رہا ہوں۔''

حضرت نے تبسم فرمایا:

''امید لے کر گئے تھے ناکام واپس ہوئے۔ صلح کا پیام لے کر پہنچے تھے جنگ کا پیام لے کر واپس آئے ہو۔''

بختیار نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''یا حضرت ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔''

حضرت نے پھر تبسم فرمایا۔

''ہمیں معلوم ہے...... تم نے پرتھوی راج کا لاؤلشکر دیکھا، اس کا جاہ وجلال دیکھا، اُس کا کرّ وفر دیکھا، اس کی ہیبت وعظمت دیکھی، اس کی نخوت ورعونت دیکھی، اس کی قوت وشوکت دیکھی، اس کی صولت وسطوت دیکھی۔ دیکھ لی!''

''یا حضرت یہ سب کچھ میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔''

''تم مرعوب تو نہیں ہوئے!''

''الحمد اللہ کہ نہیں۔''

''شاباش...... مُسلمان خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اَور جب مسلمان خُدا سے ڈرتا ہے تو پھر دُنیا اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے، پھر اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ پھر کامیابی و کامرانی اس کے قدم بہ قدم چلتی ہے۔ پھر فتوحات کا دروازہ اس کے لیے کھل جاتا ہے۔ پھر اس کی حاکمیت اور بالا دستی قبول کرنے پر دشمن مجبور ہو جاتا ہے، خدا نے فرمایا ہے، **ان الارض یرثھا عبادی الصالحون** (اس زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) اگر تم نیک ہو، اگر تم صالح ہو، اگر تم سچے ہو۔ اگر تم دیانت دار ہو، اگر تم خدا کے احکام کے سامنے سر جھکاتے ہو، تو یہ زمین تمہاری ہے، یہ کائنات تمہاری ہے، تم ہی اس کے مالک ہو، تم ہی اس کے فرمانروا ہو...... کیا ہمارا مطلب سمجھ رہے ہو؟''

''یا حضرت سمجھنے کی کوشش تو کر رہا ہوں۔''

''تمہارا چہرہ روشن ہے، تمہاری پیشانی چمک رہی ہے، تم ذاتی طور پر بہت کچھ بننے کی

صلاحیت رکھتے ہو، تمہیں ضرور ترقی، کامرانی اور کامسگاری کے غیر متواقع مواقع ملیں گے، لیکن خبردار خدا کو نہ بھولنا، اپنی حقیقت کو نہ بھول جانا......''

بختیار کا بدن لرز رہا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے لرزتی اور کانپتی آواز سے کہا۔

''یا حضرت دُعا کیجئے کہ میں خدا کو کبھی نہ بھولوں......اپنی حقیقت کو فراموش نہ کروں۔''

حضرت نے ایک روح پرور تبسم کے ساتھ فرمایا۔

''لیکن ہم سے پہلے تمہیں خود دُعا کرنی چاہیے۔ انسان اپنے لیے گڑگڑا گڑگڑا کر جب خدا سے کچھ مانتا ہے تو اس کی دُعا رد نہیں ہوتی، ضرور قبول ہوتی ہے۔''

بختیار حضرت کے قدموں پر گر پڑا، حضرت نے اُسے اُٹھایا، شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

''اب تمہیں یہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیے۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور جاؤ......اللہ تمہارا حافظ اور معین و ناصر ہو۔''

ان الفاظ سے بختیار کو کچھ عجیب طمانیت حاصل ہوئی، وہ آہستہ آہستہ الٹے پاؤں واپس ہوا اور رخصت ہو گیا۔

(6)

سُلطان کا جلال

بختیار اجمیر سے غزنی پہنچا۔ اور براہِ راست سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے تپاک اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا، پھر دریافت فرمایا۔

''کیوں بختیار ہمارے پیام کا جواب کیا لائے؟''

بختیار نے از ابتداء انتہا ساری سرگزشت بیان کردی۔ سلطان بڑے غور اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وفور غضب سے اس کا چہرہ تمتما تا جارہا تھا۔ جب بختیار گفتگو ختم کر چکا تو سلطان نے کہا۔

''تم نے توقع سے زیادہ کامیابی کے ساتھ فرائض سفارت انجام دیئے، ہم تم سے خوش ہیں۔ ہماری نظر میں تمہاری وقعت اور اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی، تم ہمارے انعامات اور بخشش کے سزاوار ہو گئے۔''

بختیار نے انکسار وفروتنی کے لہجے میں کہا۔

''ذرہ نوازی ہے سلطان بندہ پرور کی۔''

دفعتہً خشونت اور برہمی کے آثار چہرۂ سلطانی پر ہویدا ہوئے اور اس نے گرجتے ہوئے کہا:

''ہم نے چاہا تھا کہ معاملات صلح وآشتی سے طے پا جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ رائے پتھورا کو جنگ کا شوق ہے۔ وہ لڑنے کو تیار ہے، وہ نہ صرف یہ کہ ہمارے مقبوضات واپس کرنا نہیں چاہتا، بلکہ پشاور، ملتان اور لاہور بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ وہ حیرت انگیز سزا کا مستحق ہے۔ اسے ایک سبق دینے کی ضرورت ہے۔ اور یہ سبق ہم دیں گے۔''

بختیار نے عرض کیا:

''بجا ارشاد فرمایا ظلِ اللہ نے...... بیشک وہ چاکر کمترین عبرت انگیز سزا کا مستحق ہے، اسے ایک سبق دینے کی ضرورت ہے۔

''سلطان نے بختیار کے تائیدی الفاظ پر توجہ کیے بغیر فرمایا۔

''ہم دونوں صورتوں کے لیے تیار تھے۔ اگر رائے پتھورا ہمارا دوستی کا ہاتھ جھٹک نہ دیتا تو ہم سے بڑھ کر اُسے کوئی دوست نہیں مل سکتا تھا۔ اب اگر وہ دشمنی پر آمادہ ہے تو ہمیں بدترین دشمن پائے گا۔''

''بجا ارشاد فرمایا ظلِ اللہ نے!''

''ہم اس کی سرزمین پر قبضہ کرنا نہیں چاہتے تھے ہمیں اپنے مقبوضات کے سوا کوئی چیز درکار نہیں تھی۔ ہم نہ توسیع مملکت کا پروگرام بنا رہے تھے، نہ ہمیں ہوس جوع الارض تھی، امن و امان ہمیں مرغوب تھا، صلح و آشتی ہمارا شعار تھا۔ لیکن رائے پتھورا نے ہمارے اس جذبے کی قدر نہ کی، اور اب ہم ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اس کی سرکوبی کے لیے جانا چاہتے ہیں۔''

''ظلِ اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ بجا اور درست ہے۔''

''ہماری تیاریاں ہر طرح سے مکمل ہیں۔''

''یقیناً ظلِ اللہ نے ہر طرح کی تیاریاں مکمل کر لی ہوں گی، لیکن......

''لیکن......تم کیا کہنا چاہتے ہو بختیار؟''

''غلام یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ معاملات نے نازک صورت اختیار کر لی ہے، گو ہم ہر طرح سے مقابلے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمیں اپنے وطن سے ایک نئے غیر اور دشمن ملک کی سرزمین پہنچنے میں کچھ نہ کچھ دیر بہر حال لگے گی۔ ہماری فوج لاکھ بہادر ہو، لیکن کثرت میں رائے پتھورا، کھانڈے راؤ، اور راجگان ہند کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ فوج لے کر جلد از جلد کوچ کرنا چاہیے۔''

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا:

''کھانڈے راؤ کا نام ابھی تم نے لیا تھا......یہ کون شخص ہے؟''

بختیار نے جواب میں عرض کیا:

''یہ رائے پتھورا کا ایک قریبی عزیز ہے، شجاعت اور سپہ گری میں اپنے آپ کو یکتا سمجھتا ہے۔ رائے پتھورا اسی لیے اس کی حد سے زیادہ عزت کرتا ہے۔ خود زیادہ تر اجمیر میں رہتا ہے۔ دلی اس نے کھانڈے راؤ کے حوالے کر دی ہے، جہاں وہ شان و شکوہ کی زندگی مہاراج کی حیثیت سے بسر کر رہا ہے۔ غلام پہلے دہلی ہی پہنچا تھا......اس نے کھانڈے راؤ کو بہ چشم خود بھی

دیکھا ہے۔''

''کیسا پایا تم نے اُسے؟''

''صورت سے واقعی وجیہ معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ مہاراجہ کا نائب بن کر دہلی میں مقیم ہے۔ اور اس طرح عملاً اس سارے علاقے کا مالک وہی ہے۔ اس لیے بڑے کروفر اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا ہے۔ میں نے اس کا ایک جلوس دیکھا تھا، اپنے خاصے کے سواروں کے ساتھ ایک کوہ پیکر ہاتھی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں افتاں وخیزاں ایک ہرکارہ حاضر ہوا۔ اس نے کورنش بجالا کر عرض کیا:

''رائے پتھورا نے قلعہ سرہند پر قبضہ کرلیا۔''

بے اختیار بختیار کے منہ سے نکلا:

''وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔''

سلطان بے قرار ہو کر پوچھا:

''اور قاضی ضیاء الدین! کچھ اُن کا حال بھی معلوم ہوا؟''

عرض کیا گیا:

''وہ صحیح سلامت اپنی فوج کے ساتھ لاہور پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے رائے پتھورا کے محاصرہ کا بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آخر رائے پتھورا نے انہیں بہ اطمینان واپس جانے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ وہ ان کی مقاومت سے تنگ آچکا تھا۔

سلطان نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا:

''ہماری فوج آج نماز عصر کے بعد روانہ ہوگی۔ بختیار تم، باڈی گارڈ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ چلو گے۔

(7)
کوچ

سلطان نے یہ بات دوپہر کو کہی تھی اور تین گھنٹے کے بعد اس کا لشکر باہزاراں جاہ وتجمل غزنی سے روانہ ہوگیا۔ بختیار کو عاصمہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور ماہ سے بات چیت کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔

سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۷۸ھ میں لاہور آکر تحقیق کی۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کرنال وتھانیسر تک کا علاقہ پرتھوی راج کے قبضے سے نکالنا ضروری ہے۔ چنانچہ فوج کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوا اور سرہند کا قلعہ پرتھوی راج کے آدمیوں سے چھین لیا۔ اور قلعہ سرہند میں قاضی ضیاء الدین کو لکی کو بارہ سو آدمی دے کر قلعہ دار مقرر کیا۔ اور اس تصرف کو کافی سمجھ اور قلعہ[1] سرہند پر قبضہ کرنے کا انتظام کر کے لاہور کی طرف واپس ہوا۔

اس قلعہ سے لاہور کی جانب روانہ ہونے کے بعد سلطان نے سُنا کہ پرتھوی راج اور اس کا بھائی کھنڈے راؤ مع بہت سے راجاؤں کے دو لاکھ سپاہی اور بہت سے جنگی ہاتھی لیے سلطان کے مقابلے کو آرہا ہے، سلطان اگرچہ اس وقت ہرگز پرتھوی راج کے مقابلے کی استعداد اور لڑائی کا ارادہ نہ رکھتا تھا، کیوں کہ اس کے ہمراہ تین چار ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ مگر یہ سُن کر کہ پرتھوی راج لڑائی کے ارادہ سے نکلا ہے، غیرت سلطانی نے گھوڑے کی باگ موڑی اور دشمن کے استقبال کو تھانیسر کی جانب روانہ ہوا، پرتھوی راج خود اجمیر میں رہتا تھا۔ اور دہلی میں اپنے ایک رشتے کے بھائی کھانڈے راؤ کو بطور نائب السلطنت مقرر کر رکھا تھا، کھانڈے راؤ پرتھوی راج کی فوج کا سپہ سالار اعظم اور ہندوستان کا مشہور بہادر اور سردار سمجھا جاتا تھا۔

موضع نرائن میں جس کو آج کل تراوری کہتے ہیں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقام دریائے سرسوتی کے کنارے تھانیسر سے سات کوس اور دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر تھا۔

---

[1] طبقات ناصری، طبقات اکبری، منتخب التواریخ، خلاصۃ التاریخ وغیرہ اکثر کتابوں میں قلعہ سرہند لکھا ہے۔ لیکن تاریخ فرشتہ میں اس قلعہ کا نام بھٹندہ بتایا گیا ہے۔

سلطان اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کو میمنہ و میسرہ و قلب میں تقسیم کر کے ہندو فوج کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ سلطانی لشکر کسی طرح چار ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ایک فروگزاشت یہ بھی ہوگئی تھی کہ بارہ سو کی تعداد میں جو سب سے بڑا انتخابی لشکر تھا اس میں شامل نہ تھا۔ ہندو لشکر نے بڑے جوش و خروش سے حملہ کیا۔ سلطان قلبِ لشکر میں موجود اور مصروف قتال تھا کہ ایک مصاحب نے سلطان کو اپنی طرف مخاطب کر کے کہا کہ میمنہ و میسرہ کی فوجیں فرار ہو چکی ہیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں، اس وقت یہاں سے جان سلامت لے جانا ہی مصلحت ہے۔ تا کہ دوسرے وقت پوری تیاری اور مضبوطی سے آ کر ہندوؤں کا مقابلہ کر سکیں۔ سلطان نے کہا کہ میدان سے منہ موڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔ اسی اثناء میں ہندو لشکر نے اسلامی لشکر کے دونوں بازوؤں کو مفرور دیکھا تو اور زیادہ دلیر ہو کر پوری شدت سے حملہ کیا اور قلب کی قلیل جمعیت کو جس میں سلطان بھی موجود تھا چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سلطان نے پہلے چوگنی شمشیر زنی شروع کی، کھانڈے راؤ جو ہاتھی پر سوار تھا اس نے سلطان کو سب سے زیادہ مصروف شمشیر زنی دیکھ کر اپنا ہاتھی اس پر ریل دیا۔ سلطان نے بھی چابک دستی اور حملہ آوری میں مطلق کوتاہی نہیں کی۔ کھانڈے راؤ اور سلطان کے وار ایک دوسرے پر برابر ہوئے۔ سلطان کا نیزہ ہودے میں سوراخ کرتا ہوا کھانڈے راؤ کے چہرے تک پہنچا اور اس کے دو دانت اس نیزے کی ضرب سے منہ میں ٹوٹ کر گر گئے۔ کھانڈے راؤ کے نیزے نے سلطان کے بازو کو زخمی کیا۔ اور ساتھ ہی دوسرے ہندو سرداروں کے وار سلطان پر پڑے۔ جس سے سلطان زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ گھوڑے سے گر پڑے، پیچھے سے ایک خلجی نوجوان نے سلطان کی یہ حالت دیکھی تو ہمت اور بے حد قابلِ تعریف ہوشیاری سے کام لے کر اچھلا اور فوراً سلطان کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر سلطان کو کولی میں بھر کر گھوڑے کو مہمیز کر دیا۔ گھوڑے کی جفاکشی اور شہ زوری اس خلجی بچے کی چابک دستی سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ دو آدمیوں کو لے کر اس ہجوم میں اس طرح بھاگا کہ کسی کو تعاقب کی جرأت نہ ہوئی، میدان جنگ سے بیس میل کے فاصلے پر جا کر سلطان کو گھوڑے سے اتارا گیا جہاں بعض مفرورین پہلے سے پہنچے ہوئے تھے۔ سلطان کی حالت ہیبت نازک تھی۔ سپاہیوں نے نیزے توڑ کر اور نیزوں کے بانسوں کو جوڑ کر سلطان کے لیے ایک ڈولی بنائی اور اس میں ڈال کر لاہور کی جانب چلے۔ سلطان لاہور سے غزنی کی جانب گیا۔ یہاں پرتھوی راج نے تراوری کے میدان میں فتح پا کر قلعہ سرہند پر حملہ کیا اور قاضی ضیاء الدین کو محصور کر لیا۔ قاضی ضیاء الدین نے قلعہ بند ہو کر اس

خوبی کے ساتھ مدافعت کی کہ پرتھوی راج کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ تیرہ مہینے تک محاصرہ جاری رہا مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا، آخر تیرہ مہینے کے بعد...... قاضی ضیاء الدین نے خود ہی صلح کے ساتھ قلعہ خالی کر دیا۔ اور تمام سامان لے کر لاہور پہنچ گیا۔[1]

قاضی ضیاء الدین نیز لاہور اور ملتان کے عالموں نے سلطان کی شکست اور پھر غزنی واپس چلے جانے کے بعد ہراسانی اور تشویش و پریشانی کے زمانے میں بھی قلعہ، سرہند کے علاوہ ہندوؤں کو کسی ایک مقام پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دیا۔ نہایت مضبوطی اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی جگہ جمے رہے اور ہر طرح کی دشواریوں کا خندہ جبینی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔

[1] تاریخ ہند ۷ (نجیب آبادی)

(8)

شکست کا زخم

یہ پہلی شکست تھی جو شہاب الدین غوری کو نصیب ہوئی تھی۔

شہاب الدین غوری نے بڑے بڑے معرکے جیتے تھے، بڑی بڑی لڑائیوں میں کامیابی اور سرخروئی حاصل کی تھی۔ اس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن کھانڈے راؤ نے اس کے سپاہیوں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ فتح خراسان اور غور کے سپاہی جو فتح حاصل کرنے آئے تھے، جو اپنی کامرانی اور کشور کشائی کا پرچم بلند کرنے آئے تھے۔ بے شک دشمن کی تعداد شمار سے خارج تھی اور یہ مسلمان سپاہی اس مور و ملخ کے لشکر کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے، پھر بھی اس فرار نے ان کے دامن پر داغ لگا دیا تھا۔

جن حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں شہاب الدین کے سپاہیوں نے راہ فرار اختیار کی تھی انہی حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں شہاب الدین آخر وقت تک لڑتا رہا تھا اس نے اپنے لشکر کے بڑے حصے کو (افغانوں کے سوا) فرار ہو کر بھاگتے دیکھا، لیکن اس پائے ثبات میں لغزش نہ آئی وہ برابر لڑتا رہا۔ اس کی تلوار دشمنوں کی گردن کاٹتی رہی۔ یہاں تک کہ جب کھانڈے راؤ نے اپنا فیل مست اس پر ریل دیا، جب بھی نہ وہ خوف زدہ ہوا نہ ہراساں نظر آیا، اس حالت میں بھی اس نے نیزے کا ایک ایسا وار کیا کہ کھانڈے راؤ کی عماری کو چھیدتا ہوا وہ اس کے منہ پر لگا۔ اور اس کے سامنے کے دو دانت گر گئے اور وہ لہولہان ہو گیا۔ غوری نے یہ حملہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے اس نے ایسی جرأت کی تھی کہ موت سامنے کھڑی ہے۔ دُشمن کے دَل بادل اس کا تکا بوٹی کرنے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں۔ اور جب وہ زخمی ہو کر گرا تو انہوں نے اسے قیمہ قیمہ کر ہی ڈالا ہوتا مگر بختیار خلجی نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر اور اُسے کولی میں بھر کر اسے بگٹٹ نہ بھگا دیا ہوتا۔

شہاب الدین بیہوش ہو چکا تھا۔

بختیار جس اسپ صبا رفتار پر سوار تھا وہ ہوا سے باتیں کرتا رواں دواں تھا۔

میدان جنگ سے بہت دور جا کر دو سپاہی نظر آئے جو جان بچا کر بھاگے تھے، ان لوگوں نے ایک محفوظ مقام پر خیمے نصب کر لیے تھے، اور انتظار کر رہے تھے کہ جنگ کا آخری نتیجہ معلوم ہو تو آگے بڑھنے یا نہ بڑھنے کا فیصلہ کریں۔

سلطان کو بے ہوش لیکن زندہ دیکھ کر ان لوگوں کی جان میں جان آئی، فوراً زخم دوزی اور مرہم پٹی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک دن رات تک سلطان کو ہوش نہیں آیا، بختیار پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ اور دل ہی دل میں خُدا سے دُعا کر رہا تھا کہ سلطان کو جلد ہوش آ جائے۔

آخر اس کی دُعا خدا نے سن لی۔ سلطان ہوش میں آ گیا، سارا بدن پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں پھرا کر ادھر اُدھر دیکھا جیسے اس جگہ کو، اس ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کمزور اور نحیف آواز میں کہا۔

''میں کہاں ہوں؟''

بختیار نے بتایا:

''سلطانِ عالم پناہ میدان جنگ سے بہت دور اور ایک محفوظ مقام پر تشریف فرما ہیں۔''

سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''ہم یہاں کیسے آئے! ہمیں یہاں کون لایا؟''

بختیار نے عرض کیا:

''سلطان عالم پناہ نے کھانڈے راؤ پر حملہ کیا، وہ زخمی ہو گیا، اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ وہ خون میں لت پت ہو گیا۔ اس نے تلوار میان سے نکالی اور سلطان پر بے تحاشا حملہ کر دیا۔ سلطان بہت زیادہ زخمی ہو گئے۔ پھر ہر چہار طرف سے دشمن ٹوٹ پڑے کہ سلطان کی جان لے لیں۔''

سلطان اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے بے کلی اور برہمی کے ساتھ پوچھا:

''پھر......؟''

بختیار نے کہا:

''یہ غلام سایہ کی طرح اپنے آقا اور مالک کے ساتھ تھا، یہ منظر دیکھ کر میں فوراً جھک کر

اسی گھوڑے پر سوار ہو گیا جس پر سلطان رونق افروز تھے اور زخموں سے نڈھال ہو کر اب گرا چاہتے تھے۔''

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے فکر مند لہجے میں کہا:

''ہوں؟''

بختیار نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک ہاتھ سے سلطان والا شان کے ڈولتے ہوئے جسم مبارک کو روکا، دوسرے ہاتھ سے باگ سنبھالی، پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا آخر سلطان کا تھا۔ موقع کی نزاکت محسوس کرلی، وہ ہوا سے باتیں کرتا۔ دشمن کی صفوں کو چیرتا میدان جنگ سے نکل آیا اور ۳۰، ۳۵ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہاں آ کر دم لیا:

شہاب الدین نے قطع کلام کرتے ہوئے سوال کیا:

''ہم کب تک بیہوش رہے؟''

بختیار نے بتایا:

''ایک رات اور ایک دن؟''

سلطان نے پھر ایک سوال کیا:

''جراحوں اور حکیموں کا کیا خیال ہے! ہم کب تک سفر کے قابل ہو سکیں گے؟''

بختیار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''پندرہ دن تو لگ جائیں گے۔''

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''پندرہ دن؟''

''بختیار تم نے حق وفا ادا کر دیا، ہم تمہارے ممنون ہیں۔''

''یہ غلام کا فرض تھا جہاں پناہ، جسے اس نے ادا کیا۔''

''لیکن ہمیں تم سے شکایت بھی ہے۔''

''(سہم کر) اگر غلام سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو اس کی گردن حاضر ہے۔''

''نہیں ہم تمہیں سزا نہیں دے سکتے...... لیکن بختیار (بتیابانہ الفاظ میں) تم ہمیں کیوں بچا لائے؟ کیا میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنا شہاب الدین غوری کے لیے باعث ننگ نہیں

ہے۔''

''جہاں پناہ تو آخر وقت تک دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ سلطانِ عالم پناہ تو کھانڈے راؤ کے فیل مست کو بھی خیال میں نہ لائے۔ اور نیزے کا ایسا جچا تلا وار کیا کہ وہ بری طرح گھائل ہو گیا۔ لیکن سلطان تن تنہا تو اس بڑے لشکر سے جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی اس حالت میں کہ زخموں سے چُور چُور ہو رہے تھے اور بہ کثرت خون بہہ جانے کے باعث بیہوش ہو چکے تھے۔''

''ٹھیک کہتے ہو بختیار...... لیکن اس حالت میں وہاں مر جانا ہمارے لیے زیادہ خوشگوار تھا۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم وہاں سے زندہ واپس آ گئے۔

ایک سپاہی کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے واپس آ جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ زخمی ہو کر میدان جنگ میں کام آئے...... تم نے ہمیں شرف شہادت سے محروم رکھا۔ تم نے ہم سے وہ آن چھین لی جو ایک سپاہی کا حق ہوتی ہے۔ تم ہمیں زندہ اُٹھا لائے...... یہ زندگی، شرم کی زندگی ہے۔ ندامت کی زندگی ہے۔''

''جہاں پناہ......؟''

''نہیں بختیار ہم غلط نہیں کہتے۔''

''جہاں پناہ!''

''تم ہمیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو، ہمارا دل خون ہو رہا ہے، ہمیں اپنے وجود سے شرم آ رہی ہے، جی چاہتا ہے ہم اسی حالت میں جائیں اور اس وقت تک دشمن سے لڑتے رہیں جب تک بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔''

''سلطان عالم پناہ!''

''شکست، ذلت بخش شکست، شہاب الدین کو شکست...... آہ! یہ کیا ہو گیا......؟''

''آقائے ولی نعمت......''

''کاش تین چار ہزار سپاہیوں کے بجائے ہمارے پاس بختیار جیسے صرف چند سو بہادر ہوتے۔ پھر ہم کھانڈے راؤ کے ٹڈی دل کو بتا دیتے کہ جنگ کیا چیز ہے!''

''لیکن سلطانِ والا شان کھانڈے راؤ مر تو نہیں گیا وہ زندہ ہے۔ ہم اس سے پھر لڑیں گے۔ ہم اسے شکست دیں گے۔ ہم ضرور فتح حاصل کریں گے ہم پتھورا سے اپنے علاقے چھین لیں گے۔''

''یہ سب کچھ کون کرے گا؟''

''سلطان کی زیرِ سرکردگی سلطنتِ غوری کے سپاہی اور دلاور یہ کام انجام دیں گے۔''

''بختیار تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو؟''

''(کانپ کر) سلطان والا......!''

''بختیار تم ہمیں ذلیل کرتے ہو۔''

''آقائے ولی نعمت!''

''کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ اس مرتبہ جو لوگ بھاگ آئے آئندہ وہ ثابت قدم رہیں گے، تم بھگوڑوں سے یہ امید کرتے ہو؟''

''لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دشمن کا لشکر ہم سے کئی گنا زیادہ تھا؟''

''ہاں یہ حقیقت ہے......پھر!''

''پھر ہمارے تھوڑے سے سپاہی کس طرح اُن کا مقابلہ کر سکتے تھے؟''

''اس لیے ضروری تھا کہ وہ راہ فرار اختیار کریں......؟ اگر یہ بھی کوئی حقیقت ہے تو بتاؤ تم کیوں نہیں بھاگے! ہم نے کیوں راہِ فرار اختیار نہیں کی غفان سپاہیوں نے کیوں حوصلہ نہیں ہارا؟''

''آقائے ولی نعمت نے بجا ارشاد فرمایا۔''

''ہاں ہم نے ٹھیک کہا۔ بزدل کبھی میدانِ جنگ میں نہیں ٹھہر سکے، خواہ وہ تعداد میں کم ہوں یا زیادہ، بہادر کبھی میدانِ جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ خواہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہو! وہ حد شمار سے خارج ہوں، ان بزدلوں، ان بھگوڑوں کو، اپنے ساتھ لا کر ہم نے غلطی کی۔''

سلطان کے ایک اشارے پر دوسری فوج تیار ہو سکتی ہے۔ اور وہ ایسے افراد پر مشتمل ہو گی جو کبھی اور کسی حالت میں میدانِ جنگ سے منہ نہیں موڑیں گے۔''

''ہاں (کچھ سوچتے ہوئے) یہ ہو سکتا ہے۔''

''آقائے ولی نعمت ایسا ہی ہو گا۔''

''لیکن ان بھگوڑوں کا حشر کیا ہوا؟ یہ بھی کچھ معلوم ہے؟''

''وہ ہمارے ساتھ موجود ہیں۔''

یہ سن کر وفورِ غضب سے سلطان کا چہرہ آگ ہو گیا۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش

کی، لیکن اٹھ نہ سکا،

اس نے گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا:

''کیا کہا تم نے؟''

''وہ لوگ جو میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، یہیں ہیں ہمارے ساتھ؟''

''وہ ہمارے پاس آئے ہیں یا ہم ان کے پاس لائے گئے ہیں۔''

'میں سلطان کو لے کر جب یہاں پہنچا ہوں تو وہ لوگ پہلے سے یہاں خیمہ زن تھے۔''

''(اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہماری توہین ہے۔''

''کس کی ہمت ہے آقائے ولی نعمت کی توہین کا خیال بھی دل میں لا سکے۔''

''جو لوگ ہمیں میدان جنگ میں بے سہارا چھوڑ کر بھاگ آئے، اب ہمارا اور اُن کا کیا تعلق ہے۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان کیا تعلق رہ سکتا ہے؟''

''بہر حال وہ سلطان کی رعایا ہیں۔ سلطان کے غلام ہیں، بے شک اس موقع پر انہوں نے کم ہمتی دکھائی۔ لیکن اس سے پیشتر متعدد مواقع پر بار ہا یہی لوگ دادِ شجاعت بھی دے چکے ہیں۔ نہ یہ سلطان کا دامن چھوڑ سکتے ہیں نہ سلطان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے قطع تعلق کر سکتے ہیں۔ آخر یہ غیر تو نہیں اپنے ہی لوگ ہیں۔''

بختیار کے ان الفاظ سے سلطان کا جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا:

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ غزنی جا کر نئی فوج بھرتی کریں گے۔''

بختیار نے خوش ہو کر جواب دیا:

''سلطان کا فیصلہ بہت مبارک اور مستحسن ہے۔''

''ہم نے طے کر لیا ہے کہ جب تک رائے پتھورا کو ہم شکست نہیں دے لیتے، جب تک کھانڈے راؤ کو ہم عبرت انگیز سبق نہیں دے لیتے، اس وقت تک...... اس وقت تک نیا لباس نہیں پہنیں گے۔ بال نہیں ترشوائیں گے۔ ناخن نہیں کٹوائیں، لذیذ کھانا نہیں کھائیں گے۔ مسہری پر آرام نہیں کریں گے، عیش و تنعم کی زندگی بسر نہیں کریں گے، کسی خوشی میں حصہ نہیں لیں گے۔ نشاط و تفریح کا کوئی پروگرام ہماری زندگی میں شامل نہیں ہو گا۔''

''(لرز کر) آقائے ولی نعمت یہ بہت سخت فیصلہ ہے۔''

''ہاں، اور ہم اس پر عمل کریں گے۔''

بختیار نے پھر کچھ نہ کہا، خاموش ہو گیا۔

سلطان نے بھی سکوت اختیار کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گویا ہوا۔

''اور ہم نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ غزنی پہنچ کر ہم ان بھگوڑوں کو قرار واقعی سزا دیں گے۔''

بختیار نے جواب میں سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''سلطان کو اختیار ہے اپنے غلاموں کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔''

(9)

شکست خوردہ سپاہی

شہاب الدین غوری کی آمد آمد کی خبر جب غزنی اور فیروز کوہ میں مشہور ہوئی تو سلطان غیاث الدین اپنے چھوٹے، چہیتے اور دلارے بھائی کے استقبال کیلئے بہ نفس نفیس فیروز کوہ سے غزنی آ گیا، سارے غزنی میں سلطان شہاب الدین کے استقبال کی تیاریاں زور شور اور جوش و خروش سے ہونے لگیں۔ خوشی کچھ اس بات کی تھی کہ رعایا کا محبوب فرماں روا میدانِ جہاد سے واپس آ رہا ہے، اتنے دنوں سے اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں اس نے اپنے عدل و انصاف، رواداری اور حسنِ سلوک سے ساری رعایا کا دل موہ لیا تھا۔ مرد وزن، طفل و جوان، ضعیف و توانا سب اسکی محبت کے جوش میں سرشار تھے۔ اور خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حسبِ معمول وہ مالِ غنیمت سے لدا پھندا واپس آئے گا۔ سیم وزر کے انبار اس کے ساتھ ہوں گے۔ وہ غریبوں کو نہال کر دے گا محتاجوں کو تونگر کر دے گا۔ ضرورت مندوں کو اتنا دے گا، اتنا زیادہ دے گا کہ انہیں تنگی داماں کی شکایت ہو جائے گی، بہت سے لوگ آج خوش تھے کہ سلطان کے آتے ہی ایک مرتبہ پھر غزنی میں بہار آ جائے گی، اس کی آمد اور کامرانی کی خوشی میں سارے شہر کے اندر چراغاں ہوگا، دھوم مچے گی، محفلیں برپا ہوں گی۔ میلہ ہوگا، عیش وطرب کے پروگرام ہوں گے۔ رقص ونغمہ کے سامان ہوں گے اور کئی روز تک ایسا معلوم ہوگا جیسے عید آ گئی ہے۔

’’ہر روز سلطان کا انتظار ہوتا تھا، ہرکارے کئی کئی میل تک آگے جا کر خبر لاتے تھے، مگر مایوس آتے تھے۔ شہر کے منچلے لوگوں کو اس تاخیر سے تکلیف تو ضرور ہو رہی لیکن اُن کے جوش اشتیاق میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

آخر وہ دن آیا کہ شاہی سواری آتی ہوئی نظر آئی۔

سارا شہر استقبال کرنے کے لیے ٹوٹ پڑا، اور جوش اشتیاق سے بیقرار لوگوں کی صف میں خود سلطان غیاث الدین غوری شہاب الدین غوری کا بڑا بھائی بھی تھا۔

سلطان شہاب الدین غوری کا لشکر آیا، لیکن اس لشکر کو دیکھتے ہی اوس پڑ گئی سب پر۔

سب کے منہ لٹک آئے سر جھک گئے۔

کہاں اشتیاق کی وہ کیفیت کہاں افسردگی اور اضمحلال کا یہ عالم......!

کہاں نشاط وطرب وہ پروگرام کہاں غیم اور اندوہ کے یہ بادل،

فوراً ہی معلوم ہو گیا، اس مرتبہ سلطان فتح یاب نہیں ہوا شکست کھا کر آیا ہے۔

اور اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کی خیریت اور خبر دریافت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے جو اس معرکے میں سلطان کے ساتھ گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ عزیز اور رشتہ دار اس جنگ میں جس کا انجام شکست ہوا مارے گئے فوراً ہی بہت سے گھروں سے نوحہ و ماتم اور نالہ و شیوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

اگر فتح ہوتی تو غم و اندوہ کی یہ کیفیت نہ ہوتی، اس لیے کہ فتح کی خوشی اس کو غم کو محو کر دیتی۔

جب بھی سلطان کسی معرکہ پر گیا اور کامیاب و کامران ہو کر واپس آیا۔ لشکر کے آدمی ہلاک و مجروح بھی ہوئے، کتنی ہی زبردست فتح ہو، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ صرف دشمن کے ہی آدمی ہلاک و مجروح ہوں، اپنے سارے آدمی سلامت رہیں۔ جو لوگ جنگ میں کام آتے تھے ان پر افسوس بھی کیا جاتا تھا، آنسو بھی بہائے جاتے تھے، ماتم بھی کیا جاتا، لیکن فتح کی خوشی اس زخم کو بہت جلد مندمل کر دیتی تھی۔ خوشی کے ترانے غم کے نالوں پر غالب آ جاتے تھے، یہاں کچھ لوگ مغموم و دلگیر نظر آتے تھے وہاں کچھ آدمی جوشِ مسرت سے دیوانے بھی دکھائی دیتے تھے مغموم اور دلگیر صرف وہی لوگ ہوتے تھے جن کے عزیز اور رشتہ دار میدانِ جنگ سے واپس نہیں آتے تھے، اور ایسے لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں، بہت کم ہوتے تھے جو فتح کی خوشی دل کھول کر مناتے تھے۔

لیکن اس مرتبہ صورتِ حال بالکل بدلی ہوئی تھی۔

اس مرتبہ کوئی خوشی ہی نہیں تھی۔

اس مرتبہ صرف آہیں تھیں، آنسو تھے، قہقہے نہیں تھے۔ صورِ مسرت نہیں تھا۔

اس مرتبہ ہر شخص پیکرِ اندوہ و ملال نظر آتا تھا۔

اور سب سے زیادہ عبرتناک اور رقّت خیز اُن لوگوں کی حالت تھی جو زندہ واپس آئے تھے، لیکن اپنے ساتھ فراری ہونے کا داغ بھی لائے تھے۔ ان لوگوں کا کوچہ و بازار میں نکلنا مشکل تھا

ہر شخص انہیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، جو شخص انہیں دیکھتا تھا بیزاری سے منہ پھیر لیتا تھا۔

یہ زندہ تھے مگر مُردوں سے بدتر تھے۔ انہیں خود بھی اپنی زندگی پر، اپنے وجود پر، اپنے زندہ رہ جانے پر شرم آ رہی تھی۔ یہ اپنے وجود سے شرما رہے تھے، موت اگر ان کے بس میں ہوتی تو یہ مر جاتے، یہ زندگی موت سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھی۔

سُلطان نے غزنی آنے سے پیشتر بختیار سے جو کچھ کہا تھا اس کے ایک ایک حرف پر عمل کیا، اُس نے کوئی نیا کپڑا نہیں پہنا۔ اس نے مسہری پر سونا ترک کر دیا۔ اس نے لذیذ غذاؤں سے کوئی سروکار نہ رکھا، اس نے ہر طرح کی خوشی اور مسرت سے یکسر کنارہ کشی کر لی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن غیاث الدین نے کہا:

''تم نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے، جنگ میں فتح و شکست تو ہوتی ہی ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جسے ہمیشہ فتح ہوئی ہو، جو شکست سے کبھی دوچار نہ ہوا ہو۔''

شہاب الدین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے لرزتی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بھائی صاحب آپ بجا فرماتے ہیں، مجھے شکست کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اس بات کا ہے کہ میرے سپاہی میدان جنگ سے بھاگے۔''

دل دہی اور تشفی کے لہجے میں غیاث الدین نے کہا:

''یہ بہت بُرا ہوا، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس کا غم کرنے سے کیا حاصل؟''

شہاب الدین نے افسردہ اور غمگین لہجے میں کہا:

''بھائی صاحب جب تک میں رائے پتھورا اور کھانڈے راؤ کو شکست نہیں دے لوں گا مجھے قرار نہیں آئے گا، مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ مجھے کسی چیز میں لذت نہیں ملتی، کسی بات میں لطف نہیں آتا۔ یہ غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔ دُعا کیجئے کہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں۔''

غیاث الدین نے محبت بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا اور سراپا شفقت بن کر کہا۔

''میرے عزیز کیا تم سمجھتے ہو مجھے اس حادثہ کا غم نہیں ہے؟ جو تمہاری کیفیت ہے وہی

میرا حال ہے، جب تک تم دشمن پر غالب نہیں آؤ گے اور اسے شکستِ فاش نہیں دے لو گے میں بھی سچی خوشی سے محروم رہوں گا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ تم اپنی زندگی خطرہ میں ڈال لو، اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاؤ۔ سوچو تو سہی، اگر خدانخواستہ تم ہی نہ رہے تو پھر دشمن کو شکست کون دے گا؟

پھر ذرا غیاث الدین نے خاموش رہ کر کہا:

''تمہیں چاہیے کہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دو، نئی فوج بھرتی کرو، زیادہ سے زیادہ سامانِ جنگ اپنے ساتھ لے جاؤ، پچھلی مرتبہ تم بہت تھوڑے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے، اس مرتبہ بہت بڑا لشکر تمہارے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں میرے لائق جو خدمت ہو میں موجود ہوں۔''

میں آپ کو والد کی جگہ سمجھتا ہوں۔ اس دنیا میں آپ ہی میرے سب کچھ ہیں، آپ ہی کے طفیل میں مجھے عزت ملی۔ حشمت ملی، جاہ و تجمل ملا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غزنی کا تخت ملا۔ مگر افسوس کہ میں ان نوازشوں کا اہل ثابت نہ ہو سکا۔

غیاث الدین نے آگے کچھ نہیں کہنے دیا۔

''یہ اور اس طرح کے الفاظ زبان پر نہ لاؤ، بیشک تم مجھے اولاد کی طرح عزیز ہو، لیکن صرف اس لیے نہیں کہ تم میرے بھائی ہو اس لیے کہ تم میں خداداد صلاحیتیں ہیں، تم بہادر ہو، معاملہ فہم ہو، صاحب ادراک ہو، تم بہترین سپاہی ہو، بہترین سپہ سالار ہو، بہترین بادشاہ ہو...... اور بہترین، مجھے تم پر فخر ہے۔ تم میری سب سے بڑی اور سب سے قیمتی پونجی ہو، یہ تم نے کیا کہا کہ تم اہل نہیں ثابت ہوئے تم سے بڑھ کر کوئی بھی میری نظر میں اس عزت اور جلال کا سزاوار نہیں ہے، جس پر تم فائز ہو...... مایوسی اور دل گرفتگی کی باتیں چھوڑ دو نئے حوصلے، نئے عزم نئے ارادے اور نئے جوش کے ساتھ اپنی تیاریاں مکمل کرو اور دشمن کو ایسا سبق دو کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے......

شہاب الدین نے بدلے ہوئے تیور کے ساتھ کہا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا...... میں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں، نئی فوج تیار ہو رہی ہے۔ اور انشاء اللہ میں اسے بہت جلد لے کر میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہو جاؤں گا، اور اس وقت تک آپ کو منہ نہ دکھاؤں گا، جب تک کامیاب اور سرخ رو نہ ہو جاؤں، جب تک شکست کا یہ دھبہ اپنے دامن سے نہ دھو ڈالوں۔''

یاتن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

غیاث الدین نے خوش ہو کر کہا۔

''ہمیں تمہارے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے اور ہم خُدا کے فضل سے یقین رکھتے ہیں کہ اس مرتبہ تم شادکام اور بامراد واپس آؤ گے۔''

کچھ سوچتے ہوئے شہاب الدین نے کہا:

'لیکن بھائی صاحب اس مرتبہ میں نے ایک اٹل فیصلہ کرلیا ہے۔''

''غیاث الدین سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا، پھر پوچھا:

''وہ کیا......کون سا اٹل فیصلہ کیا ہے تم نے! کیا ہمیں نہیں بتاؤ گے؟''

شہاب الدین نے جواب میں عرض کیا:

''وہ فیصلہ یہ ہے کہ اس مرتبہ کوئی شخص بھی جو غور، خراسان اور بلخ کا رہنے والا ہے میرے لشکر میں شامل نہیں ہو سکے گا۔''

غیاث الدین ہنسنے لگا، اُس نے پوچھا۔

''یہ کیوں......؟ اس فیصلے کا سبب؟''

''ان لوگوں نے مجھے بہت تکلیف دی ہے، بہت ذلیل کیا ہے، مجھے خود میری نظروں میں۔''

''نہیں میرے عزیز ایسا نہ کہو، چند لوگوں کے جرم کی سزا پوری قوم کو دینا نہ انصاف ہے، نہ معقولیت، بے شک جن لوگوں نے غداری کی، کمزوری دکھائی، راہِ فرار اختیار کی انہیں اپنے ساتھ نہ لے جاؤ، جو لوگ لڑنے مرنے اور جان دینے کے لئے تیار ہیں ان کی حوصلہ شکنی بھی نہ کرو۔''

شہاب الدین نے پوچھا۔

''تو آپ مجھے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ جن لوگوں نے پیٹھ دکھائی انہیں سزا دوں......؟''

''ہاں ہاں ضرور وہ مستحق اسی کے ہیں، لیکن مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود فرماں روائے وقت ہو، بادشاہ غزنی ہو، تمہارا فیصلہ اپنی مملکت کے ہر معاملہ میں آخری اور قطعی ہے، ہاں جہاں تک مشورہ کا تعلق ہے۔''

''نہیں بھائی صاحب ایسا نہ کیجئے، جب تک آپ یہاں رونق افروز ہیں آپ ہی یہاں

کے بادشاہ ہیں۔''

''غیاث الدین ہنسنے لگا اور گویا ہوا۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں کل ہی واپس چلا جاتا ہوں تا کہ تم بے غل وغش بادشاہت کر سکو۔''

آج پہلی بار شہاب الدین کے ہونٹ ایک لمحہ کے لئے تبسم آشنا ہوئے لیکن دفعتہً سلطان کو کچھ یاد آیا۔ اس نے اپنا تبسم ضبط کرلیا، دوسرے روز اُس نے اپنے عہد کے ایک اور حصے پر عمل کیا۔

اپنی فوج کے ان لوگوں کو جنہوں نے جنگِ تراوری میں اپنی جان بچا کر مجبوراً فرار کی عار گوارا کی تھی نہایت اور ذلت آفریں سزائیں دیں، یعنی جس طرح گھوڑوں کو دانہ کھلایا جاتا ہے اسی طرح توبروں میں جو بھر کر ان کی گردنوں میں لٹکا دیے۔ اور غزنی کے گلی کوچوں میں گشت کرایا۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص کھانے سے انکار کرے اس کی گردن اڑا دی جائے۔ غرض اسی طرح گھوڑوں کی طرح جَو کھلا کر اور ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔ اور نئی فوج کی بھرتی اور ترتیب وتہذیب میں مصروف ہوا۔ جن لوگوں کو یہ سزائیں دی گئیں وہ عموماً غور و بلخ وخراسان کے لوگ تھے، افغان ان میں کوئی نہ تھا، یعنی افغانوں نے تراوری کے میدان میں سلطان کے ہم رکاب رہ کر اپنی جانیں قربان کردیں مگر فرار کی عار گوارا نہ کی۔[1] چونکہ سلطان شہاب الدین غوری نے اپنے گھوڑے کی باگ میدان جنگ سے نہیں موڑی تھی بلکہ وہ بیہوشی کی حالت میں میدانِ جنگ سے باہر لایا گیا تھا۔ اس لیے وہ ہرگز ان لوگوں کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا، جنہوں نے ایک نازک ترین مرحلے پر اپنی جان بچانے کے لیے میدان میں ڈٹے رہنے پر بھاگ جانے کو ترجیح دی۔

ان بھگوڑوں کو سزا دے کر اسے ایک طرح کا اطمینان ہوا۔

وہ بہادر تھا، بہادروں کا قدر دان تھا۔

وہ بزدل نہیں تھا، اُسے بزدلوں سے نفرت تھی۔

وہ میدانِ جنگ میں مرجانے کو میدان جنگ سے بھاگ آنے پر ترجیح دیتا تھا، اور جو

---

[1] ''فرشتہ'' کے الفاظ یہ ہیں۔

''بافغان ہیچ نگفت وغور خراسان رامعائب و مواخذ گردانید وتوبرہ ہائے پُر جُو در گردنِ ایشاں در آویختہ گرد شہر بہ گردانید وحکم کرد یا کہ ہر آنچہ در توبرہ مست نخورد سرش از تن جدا کنند۔''

لوگ اپنی جان بچانے کے لیے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کریں، ان کے لیے وہ پیام قضا بن جاتا تھا، وہ ہر خطا کو معاف کر سکتا تھا، ہر جرم اس کی بارگاہ میں بخشا جا سکتا تھا، لیکن بزدلی، فرار، بے حوصلگی، شکست کا عار برداشت کرنے والوں کے لیے اس رحم دل بادشاہ کے پاس رحم نہ تھا، وہ انہیں زیادہ سے زیادہ سزا دے کر بھی یہ سمجھتا تھا کہ ابھی یہ کیفرِ کردار کو نہیں پہنچے ہیں۔ اگر یہ لوگ میدانِ جنگ میں کام آجاتے تو ان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا، یہ جنت میں جاتے، اور ان کے متعلقین اور پسماندان کو وہ مالا مال اور نہال کر دیتا، اگر یہ زخمی ہو کر آتے، تو وہ اپنے خزانے کا دروازہ ان کے لیے کھول دیتا، اور ہر قیمت پر ان کا علاج کرتا، انہیں نوازتا، ان کے دامن سیم وزر سے بھر دیتا، ان کی ہر مراد، ہر آرزو بڑے شوق سے پوری کرتا۔

لیکن یہ بھاگ کھڑے ہوئے، انہوں نے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا لیا، انہوں نے اپنی قوم کو رسوا کیا، اُنہوں نے اپنے ملک کی عزت پر بٹہ لگایا، انہوں نے بادشاہ ذی جاہ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ بہادروں کی فہرست سے انہوں نے اپنا نام خود کاٹ دیا، اور اپنے ہاتھوں سے نامردوں اور بزدلوں کے رجسٹر میں اپنا نام لکھ لیا۔

کیا اس کے بعد بھی یہ رحم کے سزاوار ہو سکتے تھے؟

کیا اس کے بعد بھی ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا جا سکتا تھا؟

ان کے ساتھ رحم کے معنی یہ تھے کہ ایک دن دشمن آکر اس ملک پر قبضہ کر لے، اور ان کی بہادری انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہ دے۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی، اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟

ہلچل

ہم تو خود چاہتے ہیں چین سے بیٹھیں کوئی دم
آپ کی یاد مگر دل سے بھلا ہی نہ سکے

O

کچھ طرز ستم بھی ہے کچھ اندازِ وفا بھی
کھلتا نہیں حال ان کی طبیعت کا ذرا بھی
عشوہ بھی ہے شوخی بھی تبسم بھی حیا بھی
ظالم میں اور اک بات ہے ان سب کے سوا بھی
ایمان بھی تھا، علم بھی تھا، عقلِ رَسا بھی
وہ لے گئے دل اور کوئی بولا نہ ذرا بھی
دیکھیں کسے حاصِل ہو قدمبوسیٔ جَانا بھی
پسنے کو ہے موجود مَرا دِل بھی حنا بھی

(1)

نرملا کماری

تراوری کے میدان میں کھانڈے راؤ نے غوری کو شکست دی تو پرتھوی راج سے داد لینے کو جی چاہا، چنانچہ ایک فاتح کی حیثیت سے سیدھا اجمیر پہنچا جہاں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کئی مہینے وہاں قیام کرنے کے بعد دلی کا عزم کیا۔ اپنے ساتھ کماری کو بھی لیتا گیا جو پرتھوی راج کی اور خود اس کی بھی بھانجی تھی۔

نرملا کو دہلی آئے ہوئے کئی ہفتے ہو چکے تھے۔

جب بھی نرملا دہلی آتی تھی تو سارے محل میں کچھ عجیب رونق، چہل پہل اور گہما گہمی کی کیفیت نظر آنے لگتی تھی۔ اس مرتبہ وہ کچھ بجھی بجھی سی، کھوئی کھوئی سی دکھائی دی تھی۔ یا تو شوخی کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ہنسی دل لگی کی باتیں کرتی رہتی، فقرے کسی رہتی، یا اب کے کچھ ایسی خاموشی اختیار کی تھی کہ دوسری سہیلیوں اور کھانڈے راؤ کی چہیتی بیٹی آشا یعنی اپنی محبوب سہیلی تک کی چہلوں اور دلچسپیوں میں حصہ نہ لیتی۔ ہر دم گم صم نظر آتی۔ کوئی ایسی ہنسی کی بات ہوتی تو مسکرا دیتی۔ اور پھر خاموش ہو جاتی۔

کھانڈے راؤ گو امورِ سلطنت میں حد درجہ مصروف تھا لیکن خاص طور پر وقت نکال کر نرملا کے پاس کچھ دیر کے لیے ہر روز ضرور آتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر محبت اور شفقت کی باتیں کر کے چلا جاتا۔ اس نے نرملا کی یہ تبدیلی دیکھی تو، لیکن محسوس نہیں کی۔ اور اگر محسوس بھی کی تو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔

ایک روز نرملا اپنے شبستانِ راحت میں بیٹھی تھی کہ دبے پاؤں آشا آئی اور اس نے اس ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے کہا:

''نمسکار عرض کرتی ہوں۔''

اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور پھر نرملا کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی۔

''نرملا تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

وہ کچھ سہم سی گئی، پھر بولی:

''نہیں ایسا نہیں، نہ اُداس رہتی ہوں نہ کوئی خاص بات ہے۔''

آشا مچل گئی۔

''مجھے باتوں میں اڑانے کی کوشش نہ کرو، میں یہ راز حل کر کے رہوں گی۔''

نرملا نے سنجیدگی سے جواب دیا:

''اگر کوئی راز ہے تو ضرور حل کر ڈالو، میں بھی تمہاری مدد کروں گی۔''

''تو پھر بتاؤ کیوں چپ رہتی ہو؟ تم تو اتنی چنچل تھیں کہ سارے راج محل کو سر پر اٹھائے رکھتی تھیں۔ ہر ایک کو چھیڑا کرتی تھیں، چٹکیوں میں اُڑایا کرتی تھیں۔ ایک دم اتنی متین اور سنجیدہ کیوں بن گئیں؟''

''عمر کا تقاضا سمجھو۔''

''(ہنستے ہوئے) عمر کا تقاضا سمجھو، ہوں؟...... کیا عمر ہے تمہاری! ہوگی کوئی سو برس کی؟''

''اسی بیاسی سال کے بعد سو برس کی بھی ہو جائے گی۔''

دونوں ہنس پڑیں، آشا نے نہ ماننے کے انداز میں اصرار کیا:

''دیکھو خیریت اسی میں ہے کہ ہمیں اپنا راز دار اور غم گسار بنالو۔''

نرملا نے جواب دیا۔

''اب؟...... تم تو بچپن سے میری راز دار اور غم گسار ہو...... یاد ہے میں نے ایک مرتبہ تمہارے مشورے سے شمشیر زنی کی مشق کرنے کے لیے مہاراج رائے پتھورا، کی تلوار چرالی تھی جس کا دستہ سونے کا تھا اور جس میں موتی اور ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب اس کی ڈھنڈیا مچی اور راج بھون میں طوفان آیا تو چپکے سے لے جا کر وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔ یاد ہے نا؟''

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آشا نے کہا۔

''ہائے وہ زمانہ...... کیا زمانہ تھا وہ بھی......؟''

نرملا نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی سوال اٹھا:

''تو پھر نہیں بتاؤ گی؟''

نرملا نے سادگی اور بھولے پن سے پوچھا۔

''کیا بتاؤں؟''

''کیوں چپ ہو؟''

''جی گھبراتا ہے...... طبیعت کچھ ڈولی سی رہتی ہے...... تم پوچھو گی کیوں؟''

''ظاہر ہے یہ سوال مجھے کرنا پڑے گا اور تمہیں جواب بھی دینا پڑے گا۔''

''لیکن آشا میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تکلف کر رہی ہوں۔''

آشا ہنسنے لگی۔

''تکلف کیوں کرتی، لیکن باتوں میں ٹال ضرور رہی ہو، مگر میں بھی کوئی اور نہیں آشا ہوں، بات کی دھنی...... جس کام کے پیچھے پڑ جاؤں اسے ہر قیمت پر کر کے رہتی ہوں، تمہاری ٹوہ مجھے لگانی ہے۔ اور وہ لگا کر رہوں گی، لیکن بہتر ہے تم...... خود ہی سب کچھ اگل دو۔''

نرملا نے افسردہ لہجے میں جواب دیا:

''جو کچھ میں جانتی تھی بتا دیا، آئندہ اگر کچھ اور معلوم ہو گا تو وہ بھی بتا دوں گی۔''

آشا نے کچھ سوچتے ہوئے پھر سوال کیا۔

''کیا تم کسی سے محبت تو نہیں کرتی؟...... سچ سچ کہنا؟''

اس بے ساختہ سوال پر نرملا کچھ سٹ پٹا سی گئی، لیکن جلد ہی اپنی کیفیت پر غالب آ گئی، اس نے کہا:

''محبت!...... یہ آج معلوم ہوا کہ محبت کی جاتی ہے، میں تو سمجھتی تھی ہو جاتی ہے۔''

آشا نے یہ استدلال تسلیم کر لیا، اور پوچھا۔

''اچھا یوں ہی سہی، کسی سے محبت ہو گئی ہے تمہیں؟''

نرملا کی زبان اب کھل چکی تھی، کہنے لگی:

''یہ تو اسی وقت بتاؤں گی جب محبت ہو جائے گی کسی سے۔''

''آشا نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا:''

''تم تو کسی طرح قابو میں آتی ہی نہیں...... اچھا یہ بتاؤ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟''

نرملا نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا:

تمہیں چھوڑ کر اگر مجھ سے کوئی محبت کرے گا تو یا بیوقوف ہو گا یا دیوانہ۔ اور میں دونوں میں سے کسی کی محبت نہیں قبول کر سکتی۔''

آشا نے پُر اعتماد لہجے میں کہا:

''کچھ بھی ہو لاکھ پینترے بدلو، میں یقین نہیں کر سکتی؟''

''کس بات کا یقین نہیں کر سکتیں آشا کماری؟''

''یہ کہ تم کسی سے محبت نہیں کرتیں یا تم سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے۔ یا تو تم کسی سے اُلفت کرنے لگی ہو یا تم پر کوئی جان دینے لگا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں باتیں ہوں۔''

''ہونے کوتو بہت کچھ ہوسکتا ہے، کیا نہیں ہوسکتا۔لیکن کسی بات کا ہوسکنا دوسری بات ہےاور ہونا الگ بات ہے۔''

''پھر وہی ضد...... جانتی ہوں ہمیشہ کی ضدی ہو،لیکن میرے سامنے کبھی بھی چلی ہے تمہاری! دیکھواب گدگدی شروع کرتی ہوں پھر سارے کمرے میں بھاگی بھاگی پھروگی؟''

نرملانے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

''نہیں میری بہن بھگوان کے لیے ایسا نہ کرنا، جوسزا چاہو مجھے دےلولیکن یہ سزا زیادہ ناقابلِ برداشت ہے۔''

آشا کھلکھلا کر ہنس پڑی،اس نے کہا۔

''دل کی بات زباں پر لے آؤ یاد رکھو سچا ہمدرد اور دوست بڑی مشکل سے ملتا ہے اور مجھے یقین ہے میرے سچے اور ہمدرد ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہے۔''

نرملا اقرار کرتی ہوئی گویا ہوئی،

''ہاں بالکل نہیں......ہوبھی کیسے سکتا ہے؟''

''بس تو یہ راز تمہیں مجھ پر منکشف کرنا پڑے گا، بتاؤ کون خوش قسمت ہے، جسے تم نے اپنی محبت کا سزاوار بنایا ہے۔''

یہ باتیں سُن کر نرملا کچھ بیکل سی نظر آنے لگی۔اس نے کئی بار پہلو بدلا،کئی دفعہ اس کے ہونٹوں نے جنبش کی، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہولیکن زبان نے یاری نہ دی۔آشا نے اس کیفیت کو بھانپ لیا۔اب اس نے آخری اور فیصلہ کن وار کیا۔رونے لگی،اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔نرملا نے اسے گلے سے لگالیااوراُسے چمٹاتے ہوئے کہا۔

''ارے آشا تو رورہی ہے...... یہ کیا حماقت ہے؟''

آشا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہ چھیڑو نرملا، رونے دو...... اگر میں تمہاری رازدار نہیں بن سکتی تو کیا اپنے نصیب پر روبھی نہیں سکتی۔''

نرملا نے ہارے ہوئے جواری کی طرح سوال کیا:

''لیکن رونے کا سبب بھی تو کچھ ہوگا، وہ تو بتاؤ؟''

آشا نے دیکھا، تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔اس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا:

''کیوں دل دکھانے پر تلی ہوئی ہو، بھولی بن کر کیوں وہ بات پوچھتی ہو جو تمہیں معلوم ہے، میرے آنسوؤں کی تمہارے دشمنوں کو کیا فکر ہے...... بہتے ہیں آنسو بہنے دو۔''

نرملا نے ایک مرتبہ پھر اُسے سینے سے لگایا:

''واہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے، تمہارا رونا میں دیکھ سکتی ہوں؟''

''اتنے میں ایک باندی آئی، اس نے اطلاع دی مہاراج (کھانڈے راؤ) آرہے ہیں۔''

دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

(2)

دِل کی کہانی

حسبِ معمول کھانڈے راؤ تھوڑی دیر تک نرملا کے پاس بیٹھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ آشا بھی گفتگو میں حصہ لیتی رہی، جب کھانڈے راؤ چلا گیا، تو وہ آئی، اور پھر آ کر نرملا کے پاس بیٹھ گئی، اور بولی:

''تو کیا پھر رونا شروع کر دوں؟''

نرملا کھلکھلا کر ہنس پڑی، جب سے اس مرتبہ وہ اجمیر سے آئی تھی، آج پہلی مرتبہ اتنی بے ساختگی کے ساتھ ہنسی تھی۔ اس نے آشا کو ذرا پرے ہٹاتے ہوئے کہا:

''آخر تمہیں دھمکانے میں اتنا مزا کیوں آنے لگا ہے، ہم غریبوں کو!''

اب آشا کی باری تھی، اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولی:

''بجا ارشاد ہوا، اگر راجکماری نرملا دیوی کا شمار غریبوں میں ہے تو ہم جیسے لوگ کس فہرست میں لکھے جائیں گے، مہافقیروں میں؟''

نرملا بولی۔

''تم دُنیائے حسن و جمال کی ملکہ ہو، تمہارا کون مقابلہ کر سکتا ہے!''

آشا نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

''اور تم دُنیا کے حُسن جمال کی شہنشاہ ہو، تمہارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، تمہیں آسمان کے تارے جھک جھک کر دیکھتے ہیں۔ پھول اس لیے ہیں کہ تمہارے گلے کا ہار بنیں۔ آخر تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟''

بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ نرملا نے کہا:

''میری حیثیت تو اس سے ظاہر ہے کہ اتنی دیر سے بیٹھی طعنے دے رہی ہو۔ چٹکیاں لے رہی ہو، ستا رہی ہو، پریشان کر رہی ہو، دھمکا رہی ہو، مگر میں کچھ نہیں کر سکتی، اگر کسی شمار قطار میں یہ بندی ہوتی تو ایسا کر سکتی تھیں تم، پھر تو ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہوا کرتیں۔''

فوراً ہی آشا اُٹھی، اور ہاتھ باندھ کر نرملا کے سامنے کھڑی ہوگئی، اور کہنے لگی:

''میں نے تمہاری خواہش پوری کردی، کہو تو قدموں پر سر بھی رکھ دوں، لیکن پرنالہ وہیں بہے گا جہاں بہتا تھا، میرے سوال کا جواب تمہیں بہر حال دینا پڑے گا۔''

نرملا ہنسنے لگی:

''بڑی شریر ہوگئی ہو، اس سے پہلے تو ایسی نہ تھیں۔''

آشا نے تڑ سے جواب دیا۔

''ہاں میں پہلے ایسی نہ تھی، لیکن تم بھی تو پہلے اتنی کٹھور اور ظالم نہ تھیں، جتنی اب ہوگئی ہو، اتنی دیر سے خوشامد کر رہی ہوں، مگر مجال ہے کہ تمہارا پتھر دل ذرا جو پسیج جائے۔''

بہت ہی بے بس ہو نرملا نے کہا:

''زیادہ ستاؤ گی تو جھوٹ سچ جو کچھ جی میں آئے گا بک دوں گی، یقین کرنا پڑے گا تمہیں؟''

آشا نے سراپا اشتیاق بن کر جواب دیا:

''بہت اچھا جھوٹ سچ جو جی میں آئے کہہ دیجئے، اور میں اس پر یقین کرلوں گی۔''

''جھوٹ پر بھی یقین کرلو گی؟''

''جھوٹ پر نہیں، تمہاری بات پر یقین کروں گی، ویسے میرا یہ ایمان ہے کہ دیوتا جھوٹ بول سکتے ہیں مگر...... مگر......''

''راج کماری نرملا دیوی نہیں بول سکتی، کیوں جی!''

''ہاں میری پیاری بہن میرا یہی مطلب تھا...... آج تو مجھے تمہاری عقلمندی کا بھی قائل ہونا پڑا، بالکل وہی بات کی ہے جو میرے دل میں تھی...... ہاں تو بس اب شروع کردو۔''

نرملا نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش ہوگئی۔

آشا نے بھی کوئی تقاضا نہیں کیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

بڑی دیر اسی طرح گزر گئی، اور عین اس وقت جب نرملا یہ سمجھنے لگی تھی کہ بلا ٹلی، آشا پھر چہکی۔

''اب زیادہ انتظار کی تاب نہیں ہے، ہم میں!''

نرملا کسی گہرے خیال میں غرق تھی، اس نے شاید آشا کے الفاظ نہیں سُنے، اسی طرح گم

صم بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

آشا نے نرملا پر ایک نظر ڈالی، پھر زیرلبِ تبسم کے ساتھ عارفانہ انداز میں گردن ہلائی، گویا راز معلوم ہو گیا، چور پکڑ لیا، پھر اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''کس سے باتیں کر رہی ہو؟''

نرملا چونک پڑی۔

''کسی سے نہیں۔''

''کس کے خیال میں گم تھیں؟''

''کسی کے بھی نہیں...... تمہیں تو سودا ہو گیا ہے۔''

''آشا بے بس ہو کر تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کرے، اب کیا کہے؟

دفعتہً نرملا نے ساری مشکل خود بخود آسان کر دی، اس نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا:

''آشا جو کچھ پوچھتی ہو میں بتاتی ہوں، لیکن ہنسو گی تو نہیں، نفرت تو نہیں کرنے لگو گی مجھ سے، میری صورت سے تو بیزار نہیں ہو جاؤ گی؟''

اگر نرملا کسی غیر آدمی سے، کسی دوسرے آدمی سے محبت کرنے لگی ہو تو میں اس کی مدد کر سکتی ہوں، اس کا ساتھ دے سکتی ہوں، سچے معنوں میں اس کی غمگساری اور ہمدرد ثابت ہو سکتی ہوں، نفرت نہیں کر سکتی، بیزار نہیں ہو سکتی۔

اگر واقعی نرملا راجکمار شاہو کو دل دے چکی ہے تو پھر کیا ہوا۔

کیا میں اس چرکے کو سہہ سکوں گی؟

لیکن نرملا اس دُنیا میں میری سب سے عزیز اور پیاری بہن اور سہیلی ہے اگر واقعی وہ راجکمار شاہو سے محبت کرنے لگی ہے تو میں ایثار کر دوں گی۔ ہٹ جاؤں گی نرملا کے راستے سے۔

آشا یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ نرملا نے کہا:

''آشا میں اس لیے چپ تھی، بہتر ہے کہ مجھے جنبش لب پر مجبور نہ کرو۔''

آب آشا سنبھل چکی تھی، اب ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت پیدا ہو چکی تھی، اس نے کہا:

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا نرملا! میں تم سے نفرت نہیں کر سکتی، میں تمہاری صورت پر جان

دیتی ہوں اس سے بیزار کیسے ہوسکتی ہوں؟ ایسا بے تکا خیال تمہارے دل میں کیوں آیا! مجھے تم سے شکایت ہے، تم نے میری توہین کی، مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں ہے، تم نے میری محبت کی، میرے خلوص کی، میری دوستی کی توہین کی...... ذرا بھی فکر نہ کر، کوئی اندیشہ دل میں نہ لاؤ، کہو جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کہو میں تمہارے لیے سب کچھ کرسکتی ہوں اپنی ہستی کو فنا کر کے بھی۔''

یہ کہتے کہتے آشا کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

نرملا نے اُسے ایک مرتبہ پھر سینے سے لگالیا، اور دُور خلا میں گھورتی ہوئی بولی۔

''ہاں آشا میں محبت کرتی ہوں۔''

'' آشا نے لرزتی اور کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:

''کس سے۔ نرملا کس؟''

نرملا نے بھی لرزتی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''سایہ سے...... بھلا سایہ سے بھی محبت کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں کرتی ہوں۔

سایہ بھی کسی کے ہاتھ آیا ہے کبھی۔ کیا یہ میری حماقت نہیں ہے...... اچھا آشا میں سایہ سے نہیں چاند سے محبت کرتی، چاند سے، جس تک ہاتھ نہیں جاسکتا، جسے صرف دُور دیکھا جاسکتا ہے، وہ بھی ہر روز نہیں۔''

نرملا یہ کہہ رہی تھی اور آشا کی آنکھوں کے سامنے راجکمار کی تصویر پھر رہی تھی۔ اب اُسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ ذکر خیر انہی حضرت کا ہے۔

اتنے میں نرملا کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

' آشا تم نے سنا میں نے کیا کہا؟''

آشا مری ہوئی آواز میں گویا ہوئی:

''ہاں سُن لیا نرملا؟''

نرملا نے پوچھا:

''پھر تم میرا مذاق کیوں نہیں اُڑاتیں! مجھ پر قہقہے کیوں نہیں لگاتیں! مجھے بیوقوف ہونے کا طعنہ کیوں نہیں دیتیں! میرے پاگل پن پر مہر تصدیق کیوں نہ لگائیں!...... اب چپ کیوں ہو؟

آشا کو نرملا کی صحت دماغ پر شبہہ ہونے لگا۔ اس پر ترس بھی آیا۔ اس کا جذبۂ ایثار پھر

اُبھر آیا، اس نے کہا۔

''نہیں نرملا، میں تمہارا مذاق نہیں اڑا سکتی میں ساتھ دوں گی دل و جان سے۔''

نرملا نے سوال کیا:

''تم میرا ساتھ دو گی؟''

آشا نے ایک عزم کے ساتھ استقلال بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں کیوں نہیں...... میں تمہارا آخر وقت تک ساتھ دوں گی، تم جس سے بھی محبت کرتی ہو، اسے لاکر تمہارے قدموں پر ڈال دوں گی۔''

نرملا زور سے ہنس پڑی، ایسی ہنسی جیسے دیوانے ہنستے ہیں۔ پھر اُس نے پوچھا:

''اری پگلی جس سے محبت کرتی ہوں اسے تو پائے گی کہاں...... کچھ جانتی ہے وہ کہاں ہے، یا کون ہے؟''

آشا نے دل میں سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا:

''نام بتاؤ...... میں ڈھونڈ ھ لوں گی۔''

نرملا کے ہونٹوں پر پھر ایک افسردہ سا تبسم نمودار ہوا اس نے کہا:

''نام تو میں بھی نہیں جانتی!''

آشا کو ایسا معلوم ہوا جیسے اب تک جو کچھ اُس نے سوچا تھا وہ غلط تھا۔ نرملا راجکمار شاہو کو نہیں کسی اور کو چاہتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی، اس نے کہا:

''کچھ اَتا پتا تو بتاؤ؟''

نرملا ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی:

''آشا وہ بہت خوبصورت ہے، چاند سے بھی زیادہ خوبصورت، وہ بہادری میں یکتا ہے، اپنے وقت کا ارجن اور بھیشم۔ جب باتیں کرتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، وہ کسی سے نہیں ڈرتا، آشا وہ کسی سے نہیں ڈرتا، ہنستی ہو آشا۔ وہ مہاراج (رائے پتھورا) سے بھی نہیں ڈرتا۔

آشا کو حیرت تھی کہ یہ کس شخص کا ذکر ہو رہا ہے، وہ کون ایسا سورما اور جیالا ہے جو رائے پتھورا سے بھی نہیں ڈرتا جس کے رعب سے زمین کانپتی اور آسمان لرزتا ہے، جس کے سامنے بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ گونگوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں اور ہاں وہ کون ہے جو چاند کی طرح

خوبصورت ہے، جب بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، یہ تو عجیب معمہ ہے جو کسی طرح حل نہیں ہوتا؟

نرملا نے آشا کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''مان لی ہار...... اب تو نہیں کہو گی کہ اسے لا کر میرے قدموں پر ڈال سکتی ہو۔''

آشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''لیکن یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے، وہ کون ہے؟''

نرملا نے بتایا:

''کہہ تو چکی ہوں اس کا نام نہیں جانتی، جب وہ مہاراج کے پاس آیا تو میں نے اسے دیکھا، اس کی باتیں سنیں، اس کے تیور دیکھے، اس کی صورت دل میں کھب گئی، اس کی باتیں دل پر نقش ہو گئیں، اس کے تیور کچھ ایسے تھے کہ دل خود بخود اس کے سامنے جھک گیا۔''

آشا نے ایک سراغرساں کی طرح پوچھا:

''وہ کہاں سے آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟''

نرملا نے کہا:

''وہ غزنی سے آیا تھا، وہ سلطان شہاب الدین غوری کا ایلچی بن کر آیا تھا۔''

یہ سن کر آشا کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر بجلی گر پڑی، اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا:

''وہ تو مسلمان تھا!''

''ہاں آشا وہ مسلمان تھا۔''

''تم ایک مسلمان کو دل دے بیٹھیں، ایک مسلمان سے محبت کرنے لگیں۔ اور مسلمان بھی وہ جو غزنی کا، ہمارے دشمن ملک کا رہنے والا ہے۔ جو غوری کا، ہمارے دشمن کا ایلچی ہے۔ یہ تم نے کیا کیا نرملا...... یہ تم نے کیا کیا نرملا؟''

ان باتوں کا نرملا پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، وہ بولی:

''سچ کہتی ہو آشا، وہ ہمارے دیس کا، ہمارے مہاراج کا، ہماری قوم کا دشمن ہے، مجھے اس سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن ابھی میں نے تم سے کہا تھا محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی۔ ایک ہی نظر میں بس یوں سمجھو میں نے جیسے ہی اُسے دیکھا محبت کا سمندر

لہریں مارنے لگا۔''

''آشا کو نرملا پر ترس آ رہا تھا۔

''لیکن میری بہن تو نے یہ بھی سوچا...... یہ محبت کس طرح پروان چڑھے گی۔''

نرملا نے جواب دیا:

''نہیں، یہ میں نے نہیں سوچا...... اس لیے کہ پروان چڑھنے میں محبت کسی رکاوٹ کو خیال میں نہیں لاتی۔''

مایوسی اور بے دلی کے عالم میں آشا بولی:

''بس تو اس کی مورت بنا کر اپنے من مندر میں رکھ لو اور پوجا کیا کرو۔ وہ تمہیں مل تو نہیں سکتا، تم اُسے پا تو نہیں سکتیں۔ یہ ان ہونی بات کس طرح نہیں ہو سکتی۔ ناممکن، قطعاً ناممکن۔''

نرملا آشا کی تائید کرتے ہوئے بولی:

''سچ کہتی ہو آشا، میں تمہاری ہی ہدایت پر عمل کر رہی ہوں، میں نے اس کی مورت بنا کر اپنے من مندر میں رکھ لی ہے۔ اور اس کی پوجا صبح شام کرتی رہتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرا نہیں ہو سکتا، میں اُس کی نہیں ہو سکتی ہم دونوں ایک ندی کے دو کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے، کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں!''

یہ کہتے کہتے نرملا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نرملا کو روتا دیکھ کر آشا بھی ضبط نہ کر سکی، وہ بھی رونے لگی۔

بڑی دیر تک دونوں روتی رہیں، نرملا اپنی قسمت پر، آشا نرملا پر۔

پھر جب طبیعت ذرا سنبھلی تو آشا نے کہا۔

''وہ اگر ہمارے دیس میں رہتا ہوتا تو شاید کوئی تدبیر بھی بن پڑتی، وہ تو پردیسی تھا، اپنے دیس واپس چلا گیا، تم نے اسے دیکھا اور محبت کرنے لگیں۔ اس نے تمہیں نہیں دیکھا، تمہارے دل میں ہر وقت اس کا خیال ہی رہتا ہے، لیکن اس کے دل میں کبھی خیال نہیں آتا ہوگا۔''

نرملا نے آشا کے ایک ایک لفظ کی تائید کی۔

''ہاں آشا یہی بات ہے اُس نے مجھے نہیں دیکھا، وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔'' وہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتا، وہ مجھ سے ہرگز اور کبھی محبت نہیں کر سکتا۔ مسلمان اپنے دین کے معاملے میں تو بہت سخت ہوتے ہیں، لیکن آشا میں اس کی محبت اپنے دل سے کھرچ کر نہیں نکال سکتی، میں اس

سے محبت کرتی ہوں، اور کرتی رہوں گی، مرتے دم تک!''

آشا سہم کر چونک پڑی، اس نے کہا:

''اتنا بڑا عہد؟''

نرملا نے عزم واستقلال کا پیکر بن کر جواب دیا:

''ہاں...... آسمان پر اس عہد کا بھگوان گواہ ہے اور زمین پر تم۔''

نرملا کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی، آشا آگے بڑھی، اُس نے نرملا کا سرا اپنے سینے سے لگایا اور خود اس کی آنکھیں بھی آنسو بہانے لگیں۔ اس عجیب وغریب حادثہ پر، اس ان ہونے واقعہ پر، جس کا کوئی تدارک نہیں تھا۔

(3)

کتنا بہادر تھا وہ!

پہلے پہل آشا کو یہ معلوم کر کے ایک جھٹکا لگا تھا کہ نرملا ایک مسلمان سے محبت کرتی ہے، لیکن بہت جلد اس کا دل پسیج گیا، اس نے سوچا، بیچاری سچ ہی تو کہتی ہے۔ محبت ہو جائے تو کوئی کیا کرے؟ کوئی یہ بس کی چیز ہے؟ اور پھر یہ محبت بے ضرر بھی تو ہے، وہ جس سے محبت کرتی ہے وہ غزنی میں بیٹھا ہے۔ اُسے پتہ بھی نہیں کہ ایک برہا کی ماری اس کے لیے جان دیے دے رہی ہے۔ دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بات چیت نہیں ہو سکتی، نامہ و پیام نہیں ہو سکتا، میل جول نہیں ہو سکتا، ملاپ نہیں ہو سکتا، پھر بھی اگر یہ عقل کی اندھی اور گانٹھ کی پوری محبت کرتی ہے تو کیا کرے، کسی کا کیا بگاڑے گی؟ نہ خاندان کی ناک کٹے گی، نہ قوم کی بے آبروئی ہو گی۔ اس طرح یکطرفہ محبت نہیں چل سکتی۔ کب تک چلے گی۔ آخر تھک ہار اور رو پیٹ کر ایک نہ ایک دن اس پردیسی کو بھول جائے گی۔ اور پھر مزے سے چین کی زندگی بسر کرے گی۔

یہی کچھ سوچ کر آشا نے نہ صرف نرملا کی مخالفت نہیں کی بلکہ ایک حد تک حوصلہ افزائی بھی کی۔ یعنی جب وقت ملتا اور تخلیہ ہوتا آشا یہی قصہ لے کر بیٹھ جاتی اور نرملا بھی چونکہ اسے اپنا ہمدرد، رازدار اور غم گسار سمجھتی تھی اس لیے اپنے واردات بیان کر ڈالتی تھی۔ کچھ اس لیے کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا تھا اور کچھ اس لیے کہ محبوب کا چرچا بھی سرشاری الفت کی عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

ایک روز نرملا آشا بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ تخلیہ تھا، اس لیے بہت جلد موضوع اس پردیسی کا چھیڑ گیا، آشا نے پوچھا۔

''آخر اس شخص میں بات کیا تھی جو یوں تم اس کا کلمہ پڑھ رہی ہو، کیا بہت خوبصورت ہے؟''

نرملا نے سادگی اور معصومیت سے جواب دیا:

''ہاں بہت زیادہ کوئی حد ہی نہیں ہے اس کی خوب صورتی کی۔''

آشا نے پھر ایک سوال کیا:

''کیا وہ راجکمار شاہو سے بھی زیادہ خوبصورت ہے؟''

نرملا ہنسنے لگی۔

''وہ بیچارے کب سے خوبصورت ہو گئے...... کیوں اُن پر تہمت لگاتی ہو؟''

آشا نے چڑتے ہوئے کہا:

''واہ اچھی رہیں کچھ پاگل تو نہیں ہو گئیں، راجکمار شاہو کی خوبصورتی کا تو ایک زمانہ مداح ہے، جدھر نکل جاتے ہیں انگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں۔''

نرملا نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

''کیا وہ کوئی عجوبہ ہیں!''

آشا اور چڑ گئی۔

''عجوبہ کیوں ہوتے!......ان میں ایسا جادو ہے کہ جو دیکھتا ہے پھر نظر نہیں ہٹا سکتا۔''

نرملا بھی اس وقت بحث کرنے کو تیار تھی، کہنے لگی۔

''تم تو اس طرح ان کی تعریف کر رہی ہو جیسے کوئی مرد کسی عورت کے حسن کی تعریف کرتا ہے، اگر واقعی راجکمار شاہو اتنے خوبصورت ہیں جتنا تم سمجھتی ہو، تو گویا ان کا حسن زنانہ پن لیے ہوئے ہے اور یہ ایک مرد کی تعریف نہیں ہجو ہے آشا دیوی۔''

آشا غصہ سے نرملا کو گھورنے لگی، جیسے کھا ہی تو جائے گی، نرملا نے کہا:

اس طرح خونی آنکھوں سے کیوں گھورے جا رہی ہو، اچھا ہم نے تمہاری بات مان لی۔ اپنے الفاظ واپس لے لیے، اب تو خوش ہو گئیں تم؟''

آشا نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا:

''خیر راجکمار شاہو تو جیسے ہیں ویسے ہیں، اب تو مجھے اشتیاق پیدا ہو گیا ہے کہ تمہارے گلفام کو دیکھوں!''

نرملا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''انہیں دیکھ کر تم سب کو بھول جاؤ گی......آشا وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں تمہارے راجکمار شاہو کی طرح نزاکت نہیں ہے۔ آن ہے، شان ہے دبدبہ ہے، رعب ہے، وقار ہے۔ ایک بات اور بتاؤں آشا؟''

''بتاؤ بھی کسی طرح؟''

ان کا سب سے بڑا وصف یہ نہیں کہ خوبصورت ہیں، یہ ہے کہ بہادر ہیں، ان جیسا بہادر آج تک پیدا نہیں ہوا؟''

آشا نے ایک قہقہہ لگایا:

''لو اور سنو...... دیوانی ہوئی ہو...... ان جیسا بہادر آدمی آج تک پیدا نہیں ہوا...... کیوں؟''

اور پھر وہ ہنسنے لگی۔

نرملا نے کہا۔

میں ہنسنے کو منع نہیں کرتی، خوب ہنس لو جی بھر کے، اور کہو تو تھوڑا سا گدگدا بھی دوں، تا کہ کوئی کسر باقی نہ رہ جائے قہقہوں میں۔لیکن میری بہن میں نے غلط بات نہیں کی۔''

آشا نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا:

''کیسے مان لوں...... کیا صرف اس لیے کہ تم کہہ رہی ہو؟ یا کیا، اس لیے کہ جب وہ غوری کے ایلچی بن کر مہاراج (رائے پتھورا) کے پاس آئے تھے تو انہوں نے بڑھ چڑھ کر اس اطمینان پر گستاخانہ باتیں کی تھیں کہ سفیر پر کوئی زوال نہیں، کم از کم تو اسے بہادری ماننے کے لیے تیار نہیں...... ہاں بیشک اگر سلطان شہاب الدین غوری کو بہادر کہو تو مان لونگی۔''

''کیوں مان لوگی، یونہی؟''

''یوں ہی کیوں، وہ ہے ہی بہادر؟''

''تم نے کون سی بہادری دیکھی ہے اس کی؟''

''اس کی بہادری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہمارے کئی گنا لشکر سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ حالانکہ لڑائی ٹال سکتا تھا، اور جب لڑائی شروع ہوئی اور ہمارے بہادروں اور سورماؤں نے اس کے سپاہیوں کو نرک دم بھگا دیا، تو پھر بھی وہ اکیلا لڑتا رہا، پھر جب ہمارے مہاراج (کھانڈے راؤ) نے اس پر ہاتھی ریل دیا۔تب بھی وہ نہیں ڈرا، ہاتھی پر پاؤں رکھ کر اس زور کا نیزہ مارا کہ مہاراج کے دو دانت ٹوٹ گئے، یہ کوئی معمولی بات ہے، خود ہمارے مہاراج اُس کی بہادری کے گن گایا کرتے ہیں۔

''کیا کہتے ہیں مہاراج؟''

''کہتے ہیں، بیشک وہ ہمارا دشمن ہے۔ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟''لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بڑا اجیالا سپاہی ہے۔''

''اچھا ایک بات تو بتاؤ آشا!''

''سن رہی ہوں کہو؟''

''اگر مہاراج (کھانڈے راؤ) اس کی بہادری کا کلمہ پڑھتے ہوں پھر تو مان لوگی اسے بہادری میں یکتا!''

''ہاں ضرور مان لوں گی، لیکن ہمارے مہاراج سے تو اُسے کوئی واسطہ نہیں پڑا؟''

''کیسے نہیں پڑا......تم کیا جانو۔''

''یہ لو......بھلا میں نہ جانوں؟ جھوٹی کہیں کی۔''

''آشا تم جانتی ہو......میں جھوٹ نہیں بولتی......اگر چاہوں تو بھی نہیں بول سکتی، کیا کروں میری فطرت ہی کچھ اس طرح کی ہے؟''

ہاں نرملا پہلے میرا بھی ایسا ہی خیال تھا، لیکن آج سے بدل گیا ہے۔اب تو میں نے یقین کر لیا ہے ایسا سفید جھوٹ بولتی ہو کہ کیا تمہارا کوئی مقابلہ کر سکے گا؟''

''دیکھو آشا میں نے چپ چپاتے تمہاری داستان سن لی، کم از کم اتنا کرو جو کچھ میں کہوں اسے بھی سن لو، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔''

''لیکن کچھ کہو بھی تو......خالی خولی اُلجھ رہی ہو۔اور مجھے ایسی باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔''

''اچھا آشا یہ بتاؤ......غوری کو شکست دینے کے بعد مہاراج (کھانڈے راؤ) اجمیر آئے تھے نا۔''

''ہاں......ترادری کے میدان سے وہ اجمیر ہی واپس آ گئے تھے، اور وہاں کئی ہفتے رہ کر دہلی واپس آئے تھے۔''

ٹھیک......اور وہاں اس لیے گئے تھے کہ ہمارے مہاراج (رائے پتھورا) کو جنگ کی ساری کتھا سنائیں۔''

''ضرور اسی لیے گئے ہوں گے، مانتی ہوں۔''

''میں بھی مہاراج کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، جب اس جنگ کی کہانی چھوٹے مہاراج

نے بڑے مہاراج سے بیان کی تھی۔''

''یہ بھی مانے لیتی ہوں، تم تو ہر جگہ منہ کی داروغہ بن کر پہنچ جاتی ہو۔''

(ہنستے ہوئے) اچھا یوں ہی سہی..... لیکن سنتی جاؤ..... بڑے مہاراج نے چھوٹے مہاراج کے ٹوٹے ہوئے دانت دیکھ کر بہت افسوس کیا۔ چھوٹے مہاراج کو بھی اس حادثہ کا غم نہیں تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے ان کا سارا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ بڑے مہاراج اظہارِ افسوس اور اظہار ہمدردی کے بعد کہا:

''لیکن تم نے شہاب الدین غوری پر جب ایسا وار کیا تھا کہ اس کا شانہ جھول گا اور زخموں سے وہ لہولہان ہو گیا تو آخر میدانِ جنگ سے کس طرح نکل گیا۔ اگر وہ بھاگا بھی تھا تو تمہارا ٹڈی دل اس ایک اکیلے آدمی کو نہیں پکڑ سکتا تھا؟''

یہ سن کر چھوٹے مہاراج کا منہ اتر گیا، انہوں نے افسردہ لہجے میں کہا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

''بڑے مہاراج نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے ملائم الفاظ میں کہا۔''

''نہیں ہمارا یہ مطلب نہیں ہے۔''

چھوٹے مہاراج بولے:

''اگر آپ مجھے جھوٹا نہیں سمجھتے تو بزدل ضرور خیال کرتے ہیں۔''

بڑے مہاراج نے چھوٹے مہاراج کی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''کھانڈے راؤ ایسی باتیں کر کے ہمارے دل کو دکھ نہ دو ہمیں تمہاری بہادری پر فخر ہے، ناز ہے..... تم اتنا بڑا معرکہ سر کر کے آئے ہو، اتنے بڑے دشمن کو شکست دے کر آئے ہو، ہم تمہیں کائر (بزدل) سمجھ سکتے ہیں۔''

پھر ذرا دیر رک کر بڑے مہاراج بولے:

''لیکن برا ماننے کی بات نہیں کھانڈے راؤ، یہ تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ زخموں سے لہولہان اور دشمن سپاہیوں کے نرغے میں گھرے ہونے کے باوجود غوری کا صحیح سلامت نکل جانا ایک معجزہ ہے۔''

یہ سن کر چھوٹے مہاراج نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا:

''ہاں معجزہ ہے، لیکن غوری کا نہیں اس کم بخت کا!''

بڑے مہاراج نے حیرت سے پوچھا:

''کس کم بخت کا، کس کا ذکر کر رہے ہو تم ؟''

چھوٹے مہاراج بُرا سامنہ بنا کر کہا:

''وہ کم بخت نوجوان جو آپ کے پاس غوری کا سفیر بن کر آیا تھا، اور خود آپ سے گستاخانہ باتیں کر گیا ہے۔''

''ہاں وہ دیدہ دلیر اور گستاخ شخص صرف اس لیے اپنی جان سلامت لے گیا کہ ایلچی تھا، ورنہ ہم ضرور اسے قتل کر دیتے۔''

چھوٹے مہاراج نے جل کر کہا:

''کاش آپ نے قتل کر دیا ہوتا اسے؟''

بڑے مہاراج نے پوچھا:

''لیکن بات کیا ہوئی، کچھ کہو بھی تو۔''

چھوٹے مہاراج نے بتایا:

''عین اُس وقت جب غوری زخموں سے نڈھال ہو کر بے ہوش گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ یہ شخص بجلی کی سی تیزی سے اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے غوری کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور بازو کے سہارے اُسے گرنے سے محفوظ رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے باگ پکڑی، اور اتنی تیزی سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا نکلا ہے جیسے کماں سے تیر نکل جاتا ہے، بجائے اس کے کہ سپاہی حملہ آور ہوتے۔ یہ عجیب منظر دیکھنے لگے اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ اور بھائی صاحب جھوٹ کیوں بولوں خود میں بھی انہی لوگوں میں تھا، کمال کر دیا اس شخص نے، نہ جانے بجلی تھا یا چھلاوا۔ پاس ہی ہودے میں دیش پانڈے کا خادم خاص بھی بیٹھا تھا، جو میرے پاس آپ کا پیام لے کر آیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ یہ شخص کون ہے؟''

بڑے مہاراج ہنسنے لگے اور بولے! واقعی کمال کر دیا اس نے، مانتا ہوں بہادری میں یکتا ہے۔ تو آشا جس شخص کو چھوٹے اور بڑے مہاراج بہادری میں یکتا مان لیں، تم پھر بھی نہ مانو گی۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خواص آئی اور اس نے اطلاع دی:

''راجکمار شاہو اور ان کے ساتھ راجکمار اندر کمار آ رہے ہیں۔''

(4)

نوک جھوک

راجکمار شاہو اور اندر کمار آئے اور اُن کی پرتپاک پذیرائی ہوئی، نرملا کو دیکھ کر راجکمار شاہو نے بے ساختہ کہا۔

''ارے راجکماری آپ کب آئیں یہاں؟''

نرملا مسکراتی ہوئی بولی:

''آشا نے کھینچ بلایا۔''

شاہو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، بڑی دیر تک یہ مجلس طرب قائم رہی سب نے اس میں حصہ لیا، لیکن اندر اور نرملا کے مابین براہ راست بات چیت نہیں ہوئی۔ نرملا کے سامنے وہ پہلی بار آیا تھا۔ راجہ کرشن پور کا ولی عہد تھا، پرتھوی راج، کھانڈے راؤ، جے چند اور اندر سب کے درمیان خاندانی رشتے قائم تھے۔ اور یہ سب آپس میں بڑا میل جول رکھتے تھے۔ لیکن اندر کمار کو کبھی اجمیر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، دہلی بھی اس کا آنا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ نرملا نے اندر کا اور اندر نے نرملا کا نام سن رکھا تھا۔ لیکن ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ آج پہلا موقع تھا کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کا آغاز کرنے میں جھجک رہے تھے۔ شاہو اور اندر میں بڑی گہری دوستی تھی، دوستی بچپن سے چلی آ رہی تھی اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے پسینے پر خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ چنانچہ شکار کا لالچ دے کر شاہو زبردستی اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

شاہو نے آشا سے کہا:

''اندر کی خاطر کرنا تمہارا فرض ہے، تمہیں شیر کی کھال میں بھس بھروا کر رکھنے اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور اندر کمار تلوار کے ایسے دھنی ہیں کہ للکار کر شیر پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی وار میں اس طرح اس کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں جیسے چھری سے ککڑی کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں، ان کی خاطر کرو گی تو ضرور دس پانچ شیر لا کر تمہارے

قدموں پر ڈال دیں گے۔ ڈرو نہیں، وہ مردہ شیر ہوں گے۔''

نرملا کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے کہا۔

''تو کیا آپ آشا کو بزدل خیال کرتے ہیں، وہ کسی سے کیا کم ہے۔ اس نے تو شیر سے بھی بڑی ہستی کا شکار کیا ہے؟''

شاہو نے پوچھا:

''کیا شیر ببر کا؟''

نرملا زیرِ لب تبسم کے ساتھ بڑی سادگی سے گویا ہوئی۔

''آپ جانوروں کا نام کیوں لیتے ہیں...... کیا آدمی شیر سے بڑا نہیں ہوتا! کیا آپ آدمی نہیں ہیں؟''

آشا جھینپ گئی، شاہو خوش ہو گیا، اندر کھلکھلا کر ہنس پڑا، آشا نے بگڑتے ہوئے کہا۔

''چپ رہتی ہو یا نہیں...... ورنہ میں ایسی خبر لوں گی کہ یاد کرو گی۔''

نرملا بولی۔

''وہ کونسی گھڑی ہے جو تمہاری یاد سے خالی گزرتی ہو...... کیوں شاہو جی میں جھوٹ تو نہیں کہتی؟''

آشا جھینپی تو جھینپی اس مرتبہ خود شاہو بھی جھینپ گیا، اور کوئی جواب نہ دے سکا، اندر نے شاہو کو چھیڑا۔

''وہ لا جواب ہو گئے!''

آشا نے اندر کو ٹوکا:

''آپ تو کرم کیجئے، بس چپ چاپ بیٹھے رہیے۔''

نرملا بول پڑی:

''ورنہ ایسی خبر لینا کہ زندگی بھر یاد رہے۔ تمہیں آتا ہی کیا ہے۔''

نرملا کے ان مسلسل حملوں سے بیچاری آشا گھبرا گئی۔ اس نے بڑی بے بسی سے پوچھا۔

''آج تمہیں ہو کیا گیا ہے نرملا؟''

نرملا بولی:

''ہوتا کیا تمہیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔''

شاہو اور اندر پھر ہنسنے لگے۔ شاہو نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کی:

''کیوں نرملا کماری آپ یہاں کب تک رہیں گی؟''

آشا نے جواب دیا:

''جب تک ہمارا جی چاہے گا، ہماری مرضی کے بغیر کیسے جاسکتی ہیں بھلا؟''

شاہو نے نرملا سے پوچھا:

''کیا آشا سچ کہتی ہیں، واقعی آپ اس کی اتنی پابند ہیں؟''

نرملا نے جواب دیا:

''میری فکر نہ کیجئے، شاید آپ کو رشک آرہا ہے مجھ پر؟''

شاہو نے پوچھا:

''اور اگر آرہا ہو تو؟''

نرملا بولی:

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

نرملا کے اس جواب پر ایک مرتبہ پھر قہقہہ پڑا۔ شاہو نے کہا۔

''آپ اتنی حاضر دماغ اور بذلہ سنج ہیں، مجھے تو اس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔''

نرملا بولی:

''دوسری باتوں پر وہم وگمان دوڑانے کی آپ کو فرصت ہی کب ملتی ہے۔ میں جانتی ہوں ایک ہی گمان نے آپ کو اتنا عدیم الفرصت اور مصروف بنا دیا ہے کہ گئے گزرے ہوئے ہو کر رہ گئے ہیں، بعض وقت تو ترس آنے لگتا ہے آپ پر!''

شاہو کا خیال تھا کہ وہ آشا کے سامنے نرملا پر خوب خوب فقرے چست کرے گا۔ اور اس طرح اس پر اپنی دھاک بٹھا دے گا، لیکن یہاں معاملہ برعکس نظر آیا بر ملا نے خود اس کو زچ کر دیا۔

اندر نے شاہو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''واقعی...... کم از کم آج تو تم بہت زیادہ ہمدردی کے لائق نظر آرہے ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم سے بڑھ کر تیز طرار، زندہ دل، شوخ طبع اور بذلہ سنج کوئی نہیں ہے، لیکن آج معلوم ہوا کہ بالکل اناڑی ہو۔''

شاہو نے جل کر کہا۔

''جی ہاں میرے اناڑی پن کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ پانچ سال سے مسلسل تیر، تبر، نیزہ ہر چیز سے شیر کا شکار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آج تک ایک کو ابھی نہ مار سکا۔''

شاہو نے یہ بھرپور طنز اندر پر اس لیے کیا [illegible] پھر اسے یارائے تکلم نہ رہے۔ چنانچہ وہ شرمندہ سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن نرملا خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے پھر اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

آپ تو بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں شاہو جی، یا تو للکار کر شیر پر حملہ کرنے اور ککڑی کی طرح اس کے دو ٹکڑے کر دینے کا افسانہ بیان کر رہے تھے کہاں رازِ درون منکشف کرنے پر آئے تو فرما دیا کہ کوے کا شکار بھی نہیں کیا۔ آخر آپ کی کون سی بات سچ مانی جائے! کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی آپ صرف مردہ شیر کا شکار کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔''

شاہو تلملا گیا، اندر ہنسنے لگا۔ شاہو نے کہا:

''اچھا یوں ہی سہی ...... لیکن کیا آپ کو دعویٰ ہے اس فن میں دستگاہ کا؟''

نرملا نے سوال کیا۔

''یہ کیوں آپ پوچھ رہے ہیں کیا میرا امتحان لینا چاہتے ہیں؟''

آشا نے شاہو کو بتایا۔

یہ نرملا واقعی تیر کمان اور تلوار سے بڑا اچھا شکار کر لیتی ہے۔''

پھر اُس نے نرملا کو یاد دلایا:

''کیوں نرملا ایک دفعہ تم نے شیر مارا تھا نا؟''

سراپا انکسار فروتنی بن کر نرملا بولی:

''ہاں اتفاق سے نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا مر گیا بیچارہ، اور نشانہ ٹھیک نہ بیٹھتا تب بھی مرنا تو اُسے تھا ہی۔''

شاہو نے سوال کیا:

''نشانہ ٹھیک نہ بیٹھتا تو کیوں مرنا تھا اُسے؟''

نرملا بولی:

''وہ دق کا مریض تھا، میرا اس کا سامنا جب ہوا تو وہ عالمِ نزع میں گرفتار تھا، چنانچہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکی ہوں کہ پہلے شیر مرا پھر میں نے حملہ کیا یا میں نے حملہ بعد میں کیا اور

پہلے شیر مرا؟''

اندر کمار کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا، شاہو نے طنز کرتے ہوئے آشا سے سوال کیا۔

''تو یہ تھی حقیقت نرملا کماری کے شکار کی...... خوب، بہت خوب؟''

آشا نے نرملا کو ایک دفعہ غصہ سے گھورا۔

''کیوں جھوٹ بول رہی ہو؟''

اندر نے سوال کیا:

''پھر سچ آپ کہہ دیجئے۔''

وہ بولی:

''سچ یہ ہے کہ بڑا تگڑا اور خونی شیر تھا، کئی آدمیوں کو کھا چکا تھا۔ آس پاس کے دیہاتی اس کے ذکر سے کانپ جاتے تھے۔ بڑے مہاراج نے اس کارنامہ پر اسے خوب شاباش کہا پھر یادگار کے طور پر بھس بھروا کے رکھ لیا۔ آج بھی اجمیر کے راج بھون میں وہ رکھا ہوا ہے جس کا جی چاہے دیکھ آئے اور میرے سچ کی تصدیق کر لے جا کر اپنی آنکھوں سے۔''

اندر نے شاہو کو چھیڑا:

''آشا دیوی یہ تو بڑا طویل نسخہ بتایا آپ نے، آپ کے دعوے کی تصدیق ضرور ہونی چاہئے، لیکن تصدیق کے لیے اجمیر کی منزلیں طے کرنا بہت مشکل ہے، ویسے آپ کی خاطر سے ہمیں مان لینے میں بھی عذر نہیں۔''

شاہو نے بھی چٹکی لی۔

''ہاں تمہاری خاطر سے یہ ناقابلِ یقین دعویٰ ہم بھی تسلیم کیے لیتے ہیں۔''

آشا جل کر بولی:

''واہ میری خاطر سے کیوں، آپ لوگ تسلیم کر لیں گے تو مجھے کیا مل جائے گا۔''

شاہو نے کہا:

''سچی مشہور ہو جاؤ گی۔''

آشا جل گئی۔

''آپ کے مشہور کرنے سے مشہور ہو جاؤں گی؟''

شاہو نے آشا سے پھر کہا:

''پھر تصدیق کرا کیوں نہیں دیتیں جو یہ جھگڑا چکے کسی طرح:
آشا نے عاجز آ کر بے بسی کے لہجے میں کہا:
''آخر آپ کیا چاہتے ہیں، کس طرح تصدیق کراؤں؟''
اندر نے جھٹ تجویز پیش کر دی:
''ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شکار کا کوئی دن مقرر کر لیا جائے۔ اس دن ہم سب چلیں اور دیکھیں کہ کون فن کار شکاری ثابت ہوتا ہے۔''
شاہو نے یہ تجویز سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔
''بھئی واہ..... کیا بات کی ہے۔ اس سے عمدہ کوئی اور تجویز تو ہو ہی نہیں سکتی۔''
آشا نے امید و بیم کے عالم میں نرملا کو دیکھا اور کہا،
''کیوں نرملا چلو گی شکار کو..... کیا حرج ہے ذرا تفریح رہے گی؟''
نرملا نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ جواب دیا:
''ہاں کوئی حرج نہیں، تم چلو گی تو میں چلی چلوں گی۔''
شاہو خوش ہو گیا، اُس نے نرملا سے پوچھا:
''نرملا دیوی واقعی آپ تیار ہیں؟''
وہ بڑی سادگی سے بولی:
''کیا کروں جھوٹے کو گھر تک پہنچانا ہی پڑے گا۔''
شاہو چونک پڑا، اس نے کہا۔
''آپ کا مطلب کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔''
نرملا اپنا مطلب سمجھاتے ہوئے بولی:
''مطلب یہ ہے کہ آشا نے میرے بارے میں جو گپ اڑائی ہے اور جسے بجا طور پر آپ غلط سمجھ رہے ہیں اس کی تصدق ہو جائے گی۔''
اندر نے مطمئن اور مسرور لہجہ میں کہا۔
''اچھا آشا کماری یہ بات تو طے ہوئی، اب یہ بتائیے کب چلنا ہے؟''
آشا نے کہا:
''جب چاہے انتظام ہو سکتا ہے۔''

شاہو کے دل میں ایک خطرہ گزرا:

''مجھے مہاراج منع تو نہیں کریں گے؟''

آشا نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''نہیں وہ تو ایسے معاملوں میں ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔''

(5)

شکار

آشا نے دوسرے ہی دن شکار کا بندوبست کرلیا، اور دہلی سے چند میل کے فاصلے پر یہ شاہی قافلہ ایک جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر سب میں مزے مزے کی دلچسپ باتوں اور نوک جھوک کا سلسلہ جاری رہا۔ آشا نے شاہو سے پوچھا:

''تم کیوں جا رہے ہو، ایک آدمی تمہاری حفاظت کے لیے چاہیے۔''

وہ ترنگ کر بولا:

''آپ فکر نہ کیجئے، مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے۔''

نرملا نے شاہو سے سوال کیا۔

''بتایئے کتنے شیر ماریں گے آپ آج کے دن؟''

اس نے ترنگ میں آ کر کہا:

''ایک درجن سے کیا کم تعداد ہوگی بیچاروں کی...... ترس آتا ہے اتنی قیمتی جانیں ضائع کرنے پر مگر مجبوری ہے، آن کا سوال آپڑا ہے۔''

اندر کمار نے ہنستے ہوئے پہلی مرتبہ نرملا کو مخاطب کیا:

''راجکماری یہ شاہو تو یونہی گپ ہانکتا ہے، مجھ سے پوچھئے میں کتنے شیروں کا شکار کروں گا آج؟''

نرملا نے اس تخاطب سے برا نہیں مانا، مسکراتی ہوئی بولی:

''پوچھ کر کیا کروں...... کیا میں جانتی نہیں؟''

اندر نے حیرت سے نرملا کو دیکھا، پھر پوچھا:

''آپ کو معلوم ہے میں کتنے شیروں کا شکار کروں گا؟''

نرملا نے اصرار اور یقین کے ساتھ جواب دیا:

''معلوم ہے...... خوب معلوم ہے!''

اندر نے اشتیاق کچھ حیرت کے ساتھ پوچھا:

''تو بتا دیجئے، کیا تعداد ہوگی اُن کی؟''

بڑے بھولے پن اور معصومیت کے ساتھ وہ بولی۔

''تعداد...... صفر!''

یہ سن کر اندر کا منہ اُتر گیا۔ وہ بری طرح جھینپ گیا، شاہو اور آشا نے قہقہوں سے آسمان سر پر اٹھالیا، اندر نے جھینپ مٹانے کے لیے نرملا سے سوال کیا:

''اچھا اپنی تعداد بتایئے آپ کتنے ماریں گی؟''

اس نے اسی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کہا:

''تعداد پوچھ کر کیا کیجئے گا، راز کی باتیں نہ پوچھنی چاہئیں نہ بتائی جاسکتی ہیں؟''

آشا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

''سب اپنی اپنی کہہ رہے ہیں ہم سے کوئی نہیں پوچھتا...... حالانکہ دیکھ لینا سب سے نمبر نہ لے جاؤں تو میرا نام آشا نہیں۔''

نرملا ہنستی ہوئی بولی۔

''میں جانتی تھی اسی لیے تو پوچھا نہیں۔''

اس نوک جھوک کے بعد قصہ کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، آشا نے تجویز پیش کی کہ وقت گزاری کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے شکار کا سب سے اہم واقعہ بیان کرے...... کیوں نرملا، کیا کہتی ہو؟''

نرملا کو اس تجویز کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا تھا، اس نے کہا:

''ضرور...... میں بڑے شوق سے سنوں گی۔''

شاہو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

''تجویز تو بڑی دلچسپ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ابتدا کس کی طرف سے ہوگی؟''

نرملا نے آشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''جس نے تجویز پیش کی ہے۔''

سب نے نرملا سے اتفاق کیا، اور آشا سے تقاضا شروع کر دیا۔ اس نے لاکھ لاکھ معذرت کی، میں نے کبھی شکار و کار نہیں کیا، لیکن تقاضا تھا کہ سب کی طرف سے جاری تھا۔ آخر نرملا

نے یہ قصہ ختم کر دیا۔

''یہ بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔ ہرگز زبان نہیں ہلا سکتی اپنی تعریف میں۔ لہٰذا اگر مجھے اجازت ہوتو میں بیان کر دوں؟''

اندر نے بڑی پُر زور تائید کی۔

''ضرور..... نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

خود آشا کو بھی اشتیاق پیدا ہوا کہ نرملا کیساتھ جھوٹ تصنیف کرتی ہے۔ دیکھنا چاہئے، نرملا نے کہا:

''زندگی میں آشا نے صرف ایک ہی شکار کیا ہے، اور اس پر قناعت بھی کر لی ہے، رحم دل اتنی ہے کہ اپنے شکار کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کرتی ہے۔ کیوں شاہو جی آپ میری تائید کرتے ہیں۔''

شاہو پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اتنے بھرپور وار کی اس سے توقع نہیں تھی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ آشا بگڑ گئی۔

''دیکھو نرملا کہے دیتی ہوں، ایسی باتیں نہ کرو ورنہ پھر اچھا نہیں ہوگا۔''

نرملا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاہو سے کہا:

''ہاں شاہو جی اب آپ شروع کیجئے۔''

شاہو نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک مرتبہ میں ایک ضروری سفر پر نکلا، بے خیالی میں چلا جا رہا تھا کہ میرا گھوڑا بھڑ کنے لگا۔ میں نے لاکھ لاکھ زور کیا لیکن وہ اڑ گیا، کیا مجال ہے جو ایک قدم بھی بڑھا ہو۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو کوئی بات ہے۔ لیکن کیا بات ہے؟ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آیا، اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ سامنے کی جھاڑی سے ایک شیر ببر برآمد ہوا، اسے دیکھتے ہی گھوڑا اپچھلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا، میں توازن نہ قائم رکھ سکا، گر پڑا، گھوڑا تو بھاگ گیا۔ میں بالکل شیر کے سامنے پڑا ہوا تھا، اتنا موقع نہیں تھا کہ اُٹھ کر وار کر سکوں۔ اتنی دیر میں تو وہ حملہ کر دیتا میرے اوپر، آخر بجلی کی تیزی سے میں نے لات جو چلائی تو شیر صاحب کے دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون ابلنے لگا۔ یہ ایسا اچانک اور کاری وار تھا کہ وہ تاب نہ لا سکا، جھاڑی میں گھس گیا، میں نے اس کا تعاقب کیا، لیکن وہ چھلانگیں مارتا نکل گیا۔''

آشا بڑی محویت سے یہ داستان سُن رہی تھی، نرملا نے پوچھا:

''پھر خواب سے جب آپ کی آنکھ کھل گئی، تب کیا ہوا؟''

شاہو نے جھلا کر کہا:

''پھر سو گیا۔''

اس بے ساختہ جواب پر سب کو ہنسی آ گئی۔ اب نرملا اندر کمار سے مخاطب ہوئی۔

''آپ......! اب آپ شروع کیجئے۔''

اندر نے انکسار کرتے ہوئے لیکن پوری خودنمائی کے ساتھ کہا۔

''یوں تو شکار میری زندگی کا بہترین مشغلہ ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ میں نے شیر کے سامنے آ کر اس پر تلوار سے وار کیا ہے اور گردن اڑا دی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ اگر حواس بجا نہ رہتے تو جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ جس مچان پر میں بیٹھا تھا وہ کمزور بندھی تھی۔ اتفاق کی بات کہ ادھر ہانکنے والوں نے شیر کو کھدیڑ کھدیڑ کر مچان کی طرف ہانکا۔ ادھر مچان دھڑ سے گر پڑی، شیر نے پہلے تو مجھے دیکھا پھر بادل کی طرح گرجا، میرا کام تمام کرنے کے لیے پنجہ اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس صفائی سے تلوار کا نپا تلا ہاتھ مارا کہ پنجہ وہ گرا۔ خون کا فوارہ بہنے لگا۔ شیر بھی آخر شیر تھا، اور زیادہ زور سے دھاڑا۔ اور خونخوار نظروں سے مجھے گھور کر دوسرا پنجہ بڑھایا، لیکن چشم زدن میں وہ بھی کٹا ہوا پڑا تھا۔ اب بیچارہ سر کے بل گر پڑا، میں نے تول کر ایسا ہاتھ مارا کہ گردن گری جا کر دو گز کے فاصلے پر!''

شاہو نے نرملا کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''کہہ دیجئے......اندر کمار بھی خواب بیان کر رہے ہیں۔''

وہ تڑ سے بولی:

''ایسی جرأت میں کیسے کر سکتی ہوں، جب کہ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ اندر کمار جی نے آپ کے نہلے پر دہلا لگایا ہے۔''

اندر نے اپنی داستان ایسے ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کی تھی کہ اُسے کامل یقین تھا کہ حاضرین اسے مان لیں گے۔ اور خاص کر نرملا کے دل پر تو اس کی دلیری اور شجاعت کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ لیکن اس کے جواب نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، اور وہ بجھ کر رہ گئے، آشا نے چڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی سب جھوٹے، اب تم شروع کر دو اپنا قصہ۔''

نرملا بولی۔

''اپنا قصہ محل واپس چل کر سناؤں گی۔''

آشا اُلجھ پڑی!

''یہ کیوں! یہاں کیا بات ہے کہ نہیں سناتیں، وہاں کیا ہے کہ سنادوں گی؟''

نرملا نے سمجھاتے ہوئے کہا:

''دیکھو آشا دیوی ضد نہیں کرتے...... میں بڑے شکار پر آج نکلی ہوں۔ لہٰذا آج ہی کوئی کارنامہ مجھ سے سرزد ہوگا۔ پھر اسے نمک مرچ لگا کر اطمینان سے سناؤں گی۔''

آشا نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''لو آ گیا جنگل بھی، دیکھے لیتے ہیں تمہارا کارنامہ؟''

واقعی اب یہ قافلہ جنگل میں پہنچ چکا تھا۔

مچان جہاں لگائی گئی تھی وہ جگہ یہاں سے کافی دور تھی۔ ہانکنے والے بھی۔ اسی طرف تھے، صرف ایک راہ نما ساتھ تھا، نرملا رتھ سے اتر پڑی اس نے کہا۔

''اتنی دیر ہوگئی بیٹھے بیٹھے، اب ذرا پیدل چلنا چاہیے۔''

شاہو اور اندر بھی بول پڑے۔

''ہاں ٹھیک ہے، شاید کوئی بھولا بھٹکا شکار یوں ہی مل جائے۔''

آشا وہیں بیٹھی رہی۔

''آپ لوگ تشریف لے جایئے، میں یہیں انتظار کرتی ہوں۔''

سب لوگ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

بڑی دیر تک جنگل میں گھومتے رہے، اور کافی آگے نکل گئے۔ اب اندر کمار تھک چلا تھا۔ اس نے راہ نما سے پوچھا۔

''بھئی وہ تمہاری مچان کہاں ہے؟''

راہ نما نے عرض کیا:

''بس کوئی ایک میل اور چلنا پڑے گا۔ چند قدم کا تو فاصلہ ہے۔ ابھی پہنچ جاتے ہیں۔''

پھر یہ لوگ چلنے لگے، مشکل سے چند قدم گئے ہوں گے کہ دفعتہً راہ نما ٹھٹکا اور اُس

گھبرائے ہوئے لہجے میں لرزتی اور کانپتی آواز میں کہا:

''شیر......''

اور واقعی پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر ایک شیر کھڑا تھا اور اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

نرملا سب سے آگے تھی، اس نے راہ نما کی آواز سنی شیر کو دیکھا۔ پھر لرزتے ہوئے قدموں سے پیچھے ہٹی۔ لیکن نہ راہ نما تھا، نہ شاہ ہوا اور نہ اندر، سب ہی اس برق رفتاری سے بھاگے تھے کہ کسی کا نشانِ قدم بھی نظر نہ آتا تھا۔

نرملا جب پیچھے ہٹی تو وہ خوف زدہ تھی لیکن جب ساتھیوں میں سے کسی کو نہ پایا تو دہشت زدہ ہوگئی۔ پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ بھاگنا تو درکنار قدم اٹھانا مشکل ہوگیا۔ شیر نہایت اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اور ٹکٹکی لگائے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں نرملا کھڑی تھی۔ وہ اگر بھاگنے کی کوشش کرتی تو شاید بھاگ سکتی تھی۔ کیونکہ شیر کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور وہ حملہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ لیکن زمین نے اس کے پاؤں پکڑے لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ اس طرح کھڑی تھی جس طرح عامل کے سامنے معمول بے حس و حرکت کھڑا ہوتا ہے۔

کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر شیر خراماں خراماں اسی طرف آنے لگا جہاں نرملا تنہا کھڑی تھی۔ دونوں کا فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ نرملا کو یقین ہوگیا اب وہ نہیں بچ سکتی۔ اب بھگوان بھی اسے نہیں بچا سکتے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق سے باہر نہیں نکلی۔

اب زیادہ سے زیادہ دونوں کا فاصلہ دس قدم رہ گیا تھا۔ اب شیر کے تیور بھی بدل چکے تھے، معلوم ہوتا تھا اب وہ حملہ کیا ہی چاہتا ہے۔ دفعتہً ایک سپاہی سامنے کی جھاڑی سے نکلا، شیر اُسے دیکھ کر اور زیادہ بھڑک اٹھا۔ اب زور سے دھاڑا اور نرملا پر جست کیا ہی چاہتا تھا کہ سپاہی نے تلوار کا تلا ہوا ایسا ہاتھ مارا کہ گردن کٹ کر دُور جا گری۔

سپاہی آ کر نرملا کے پاس کھڑا ہوگیا، اس نے پوچھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی تھیں، ایسی خطرناک جگہ پر تنہا آنے کے کیا معنی؟''

نرملا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سپاہی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

سپاہی نے کہا:

''چلیے میں آپ کو جہاں آپ رہتی ہیں پہنچا دوں ......اوہ آپ کہیں ان لوگوں کے ساتھ تو نہیں تھیں، جو ابھی ابھی تھوڑی دیر ہوئی شیر شیر کہتے سر پر پاؤں رکھے بھاگے جا رہے تھے۔ میں انہی کی آواز سن کر اِدھر آیا تھا ورنہ میرا راستہ یہ نہیں تھا۔''

نرملا ابھی کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ بہت سے آدمی شور مچاتے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

سپاہی نے کہا۔

''لیجئے آپ کے آدمی آ رہے ہیں......اب آپ محفوظ ہیں، میں جاتا ہوں۔''

وہ تیزی سے اسی جھاڑی کے اندر داخل ہو گیا، جہاں سے آیا تھا۔ نرملا ابھی بھی اس طرح گم صُم کھڑی رہی۔

اندر اور شاہو بہت سے لوگوں کو جمع کر کے اپنے ساتھ لائے تھے، اب وہ بالکل نرملا کے پاس پہنچ گئے، نرملا بے سدھ کھڑی تھی۔ سامنے شیر کا جسم بے سر اور ذرا فاصلے پر کٹی ہوئی گردن پڑی تھی۔

آشا دوڑ کر نرملا سے لپٹ گئی۔

''نرملا......میری نرملا بھگوان نے تجھے بچا لیا۔''

اندر بھی پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''راجکماری بھگوان نے بڑی کرپا کی جو آپ بچ گئیں۔''

نرملا نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں آپ کی کرپا (مہربانی) کی شکر گزار ہوں۔ شاہو جی آپ کی بھی!''

دونوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا، کچھ نہ کہہ سکے۔ ندامت اور خجالت سے گردن جھکا لی۔

آشا نے پوچھا:

''اس شیر کو کس نے ہلاک کیا ہے؟''

نرملا بولی۔

''شاید فرشتہ تھا جسے بھگوان نے مجھے بچانے کے لیے بھیجا تھا۔''

اندر نے ذرا جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''کہاں گیا وہ؟''

نرملا نے حقارت کی ایک نظر اندر پر ڈالی:

پھر کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔

اندر نے جب سے نرملا کو دیکھا تھا اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ آج یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ شکار کے بعد یا شکار کے دوران میں یا شکار سے پہلے جب بھی موقع مِلا حرفِ محبت زبان پر لے آئے گا اسے اپنے حسن اپنے بانکپن، اپنی سپہ گری پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے یقین کرلیا تھا، نرملا اُسے نہیں ٹھکرا سکتی، اِدھر اس کے منہ سے حرفِ محبت نکلا، اِدھر نرملا نے جذباتی انداز میں لرزتی ہوئی آواز سے کہا:

''پریتم میں تمہاری ہوں......صرف تمہاری۔''

لیکن اس کمبخت شیر نے بیچ میں آ کر امیدوں اور آرزوؤں کا وہ قصرِ فلک فرسا آن کی آن میں ڈھا دیا۔

اب نرملا سے محبت نہیں مل سکتی، نفرت مل سکتی تھی۔ نفرت، صرف نفرت۔

اندر کو اپنی محرومیٔ قسمت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ شاہو بھی کم شرمندہ نہیں تھا۔ آشا نے نرملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور محبت بھرے لہجے میں کہا:

''آؤ نرملا چلیں؟''

(6)

وُہ کون تھا؟

نرملا قصر شاہی میں واپس آ گئی...... اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی، خاموش افسردہ گُم صم...... اب یہ محل اُسے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ یہاں سے، یہاں کی فضا سے یہاں کے لوگوں سے، خاص طور پر شاہو اور اندر سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔ یہ بزدل اسے موت کے منہ میں دھکیل کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جنگل میں پہنچنے سے پہلے تک ان سے بڑھ کر دلاور اور بہادر کوئی نہ تھا۔ لیکن شیر کا سامنا ہونے کے بعد اُن سے بڑھ کر بزدل اور نامرد بھی کوئی نہ تھا۔

پھر رات کو نرملا اپنے کمرے میں پہنچی تھی کہ آشا آ گئی، اس نے نرملا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، اور پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

''واقعی نرملا میں بہت شرمندہ ہوں...... تمہیں یاد ہوگا میں رتھ پر بیٹھی رہی تھی۔ تم لوگوں کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا جاتے ہوئے، لیکن جب یہ کائر (بزدل) لوگ ہانپتے کانپتے شیر شیر کی رٹ لگاتے واپس آئے تو میں نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ نرملا کہاں ہے؟ شاہو جی اور اندر کمار دونوں نے بیک آواز کہا: وہ تو وہیں رہ گئی بھول ہوگئی، اب کیا ہوگا؟ میں نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔ آپ لوگوں کو اپنی جان عزیز تھی بچ کر چلے آئے، ایک نرملا کی جان فالتو تھی، اسے شیر کے سامنے چھوڑ آئے۔ اتنے میں ہمارا راہ نما بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اور سب تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ اب میں رتھ میں بیٹھی نہ رہ سکی، میری بزدلی کافور ہوگئی، میں نے سوچ لیا تھا اگر تم مری ہوئی ملیں تو اپنے سینے میں کٹار بھونک لوں گی۔ اگر شیر سامنے ہوا تو اس کے منہ میں گردن دے دوں گی کہ مجھے بھی نرملا کی طرح چبا ڈال، لیکن بھگوان نے کرپا کی، اور تم بچ گئیں، سچ جانو میں نے تب سے نہ اندر کمار سے بات کی ہے، نہ شاہو جی سے، دونوں کی صورت زہر لگنے لگی ہے مجھے۔''

پھر اس نے رقت آمیز لہجے میں پوچھا:

''کیوں نرملا تم مجھ سے تو خفا نہیں ہوئیں۔''

نرملا نے اُسے گلے سے لگالیا اور بولی:

''پگلی کہیں کی، تجھ سے کیسے خفا ہوسکتی ہوں...... ان لوگوں کی طرح اگر تو بھاگ بھی کھڑی ہوئی تو بھی تجھ سے نہ خفا ہوتی۔ نہ تو نے بہادری کا دعویٰ کیا تھا، نہ تو نے اپنے دلاوری کے جھوٹے قصے بیان کیے تھے۔ نہ تجھے اپنی سپہ گری پر ناز تھا۔ نہ تو مرد تھی، اور پھر ان بزدلوں کو جس طرح تو نے پھٹکارا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جس طرح بھاگی بھاگی مجھ تک بیتاب اور بیقرار ہو کر چلی آئی، اس سے تو میرے دل میں تیری محبت دو چند ہوگئی ہے...... لیکن سچ کہتی ہوں ان دونوں سے نفرت ہوگئی ہے مجھے۔''

آشا بولی:

''مجھے بھی...... اب شاہو جی ہوا کھائیں، آشا ان کے ہاتھ نہیں آسکتی، وہ کسی بزدل کو اپنا پتی (شوہر) نہیں بنا سکتی۔''

نرملا نے ہلکے سے اس کے گال پر ایک چپت لگائی۔

''ایسی بات نہیں کرتے۔''

آشا نے ایک عزم مستقل کے ساتھ کہا:

''دیکھ لینا میں بھی بات کی دھنی ہوں، مرتے مرجاؤں گی مگر کائر کی صورت نہ دیکھوں گی۔''

نرملا نے کہا:

''آشا اب میرا جی یہاں نہیں لگتا۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی، ایک ایک پل میرے لیے بھاری ہو رہا ہے، میں کل ہی چلی جاؤں گی۔''

آشا اسے اس ارادہ سے باز نہ رکھنے کی کوشش نہ کر سکی، لیکن اس نے کہا:

''اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم مجھ سے خفا ہو۔''

نرملا نے پھر اسے ایک مرتبہ گلے سے لگالیا۔

''آشا مرتے دم تک میں تجھ سے خفا نہیں ہوسکتی، تجھے بالکل اندازہ نہیں ہے کہ میرے دل میں تیری کتنی محبت ہے۔''

یہ کہتے کہتے نرملا کی آنکھیں بھر آئیں...... آشا کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ اس نے پوچھا:

''پھر کیوں جا رہی ہو؟''

نرملا نے جواب دیا:

''دل نہیں لگتا، نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے، اگر یہاں رہی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔ مر جاؤں گی، آشا کیا تو میرا مر جانا گوارا کر لے گی؟''

آشا کانپ اُٹھی۔

''نہیں نہیں، ایسا نہ کہو، بے شک چلی جاؤ۔ اب تو رات بہت آ گئی، کل ضرور چلی جانا......''

یہ کہتے کہتے آشا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، ہچکیوں اور سسکیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، نرملا نے کہا۔

''اچھا آشا میں نہیں جاتی۔''

آشا بولی۔

''نہیں نرملا نہیں، تم کو جانا پڑے گا، تم کو جانا چاہیے۔''

نرملا نے آشا کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''اچھا جاؤں گی......لیکن ایک شرط ہے، تو بھی میرے ساتھ چل۔''

آشا خوش ہو گئی، اس کے آنسو خشک ہو گئے، وہ جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر کہنے لگی۔

''کیا سچ......مجھے لے چلو گی اپنے ساتھ۔''

نرملا نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

''ہاں کہہ تو رہی ہوں، تو میرے ساتھ چلے گی تو ذرا میرا دل بہل جائے گا......چلے گی نا!''

آشا نے سراپا نشاط بن کر کہا:

''ہاں چلوں گی......تمہارے ساتھ رہ کر تو زندگی گزار دینا بھی ایک نعمت ہے۔''

نرملا نے ایک سوگوار تبسم کے ساتھ کہا:

''اوفو! کتنی باتیں بنانا آ گئی ہیں تجھے۔''

دفعتہً آشا کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے پوچھا:

''نرملاتم نے یہ نہیں بتایا وہ آدمی کون تھا جس نے تمہیں نئی زندگی بخشی! جس نے شیر کے دوٹکڑے کردیئے، اور جو ہمارے آنے سے پہلے غائب ہوگیا۔ واقعی وہ کوئی فرشتہ تھا یا......؟''

''ہوں......آدمی ہوگا کوئی، بتاؤنا کون تھا؟''

''بتادوں ......کیا تو یقین کرے گی؟''

''کیوں نہ یقین کروں گی، تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''تو آشا سُن......وہ......''

''کہتے کہتے چپ ہوگئیں، کچھ آگے بھی تو کہو؟''

''وہ......وہی تھا۔ وہی جس کے بارے میں مجھ سے پوچھا کرتی تھی۔''

''یہ سُن کر آشا اچھل پڑی......''اس نے یقین نہ کرنے کے انداز سے نرملا کی طرف دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا:

''جھوٹ......''

نرملا نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا:

''سچ کہتی ہوں......وہی تھا؟''

''وہ مسلمان! وہ غزنی کا رہنے والا! وہی جو بڑے مہاراج کے پاس سفیر بن کر اجمیر آیا تھا۔ وہی جس نے میدان جنگ میں شہاب الدین غوری کی جان بچا کر وفاداری، بہادری اور دلیری کی مثال قائم کردی:

''ہاں وہی......جس سے محبت کرتی ہوں۔''

''بے شک وہ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے، لیکن وہ کیسے پہنچ گیا؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتی، مجھے خود حیرت ہے۔''

''پھر چلا کہاں گیا؟''

''یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔''

''کچھ باتیں بھی ہوئیں تم سے!''

''نہیں آشا میں تو ایک حرف بھی نہ کہہ سکی......میری زبان گنگ تھی، آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔''

''اور خود اس نے؟ کیا اُس نے بھی کوئی بات نہیں کی؟''

اس نے کہا، آپ یہاں کیا کر رہی تھیں، آپ شیر کے سامنے کیسے آ گئیں، ہاں یاد آ گیا کچھ لوگ شیر شیر کا نعرہ لگاتے سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہے تھے۔ شاید آپ انہی کے ساتھ آئی تھیں میں انہی کی آواز سن کر اپنا راستہ بدل کر اُدھر آ گیا کہ ذرا شیر کی مزاج پُرسی کرلوں، وہ لوگ بھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے چلیے آپ کو پہنچا دوں ان کے پاس...... لیجئے وہ لوگ اور بہت سے آدمیوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اب آپ بالکل محفوظ ہیں میں جا تا ہوں، میں ٹکر ٹکر اُسے دیکھتی اور اس کی مدبھری باتیں سنتی رہی...... وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تم لوگ آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ایک خواب تھا، لیکن کتنا شیریں۔ آہ یہ خواب بھی تھا تو اتنی جلدی کیوں ختم ہو گیا، یا تم لوگ کیوں اتنی جلدی آ گئے، شاید اس سے بات کرنے کی ہمت مجھ میں پیدا ہو جاتی ؟''

(7)

دل کی باتیں

نرملا کو نہ کھانڈے راؤ کی شفقتیں روک سکیں نہ آشا کی التجائیں۔اس کی ضد پوری ہوئی اور وہ ایک دستہ فوج کے ساتھ دہلی سے اجمیر روانہ ہوگئی۔آشا اس کے ساتھ تھی، اس کی وجہ سے نرملا کی اداسی گم ہوگئی تھی، آشا کی کوشش یہ تھی کہ نرملا ہنسے، خوش رہے، وہ اپنے ہی خیال میں کھوئی کھوئی سی رہتی، اس کی آنکھوں کے سامنے ایک تصویر پھرا کرتی۔اس جیالے غزنوی کی جس نے اس کا دل جیت لیا تھا، جس سے صرف ایک بار ذرا دیر کے لیے آمنا سامنا ہوا تھا۔جس نے اس کی جان بچائی تھی۔جو اس کی جان کا مالک تھا، آشا اس کا حال دل سمجھتی تھی اور اب اس سے ہمدردی کرنے لگی تھی۔لیکن اس سے نرملا کی اُداسی نہیں دیکھی جاتی تھی، اُسے خوش رکھنے کے لیے وہ دل سے گھڑ گھڑا کر نئے لطیفے سناتی، اچھی اچھی کہانیاں سناتی۔مدبھرے گیت سناتی اور کبھی کبھی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی، یعنی نرملا مسکرا دیتی، ہنس دیتی لیکن کبھی کبھی!

راستے میں ایک روز، آشا نے نرملا کو ہنسانے کی بہت کوشش کی، لیکن ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی۔اس نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

''آشا ،ہمیں نہ چھیڑو۔''

آشا نے حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور بولی:

''تم نے کیا حالت بنالی ہے اپنی!''

''نرملا نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا۔''

''دیکھ ہی رہی ہو۔''

آشا نے دُکھ بھرے انداز میں جواب دیا۔

''لیکن اس کا انجام کیا ہوگا؟''

نرملا نے ایک عزم کے ساتھ جواب میں کہا:

''موت......اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے؟''

آشا رونے لگی۔

''ایسا نہ کہو نرملا! تم جیو گی، زندہ رہو گی، یہ تمہارے مرنے کے دن نہیں۔ زندگی کی بہاریں تمہارے لیے وقف ہیں، انہیں نہ ٹھکراؤ۔''

نرملا ایک سوگوار تبسم کے ساتھ گویا ہوئی۔

''نہیں آشا یہ باتیں تم نے اپنے لئے کی ہیں۔ تم جیو گی، تم زندہ رہو گی، زندگی کی بہاریں تمہارے لیے وقف ہیں۔ اور وقف رہیں گی، مجھے زندگی سے مطلب ہے نہ اس کی بہاروں سے۔''

آشا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نرملا نے پیار سے اس کی طرف دیکھا، اور پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پگلی کہیں کی، روتی کیوں ہے؟''

''مر جاؤں گی تو کیا ہو جائے گا، کیا یہ دنیا محض میرے وجود سے قائم ہے؟''

آشا نے اشک آلود نظروں سے اسے دیکھا اور بھرآئی ہوئی آواز میں بولی:

''ہاں...... میری دُنیا تمہارے ہی دم سے قائم ہے۔''

نرملا کے ہونٹوں پر تبسم پیدا ہوا۔ اس نے دانتوں تلے انگلی داب لی اور کہنے لگی۔

''اری ایسی باتیں نہ کر، شاہو جی سنیں گے تو زہر کھا لیں گے۔''

بے پروائی سے آشا نے کہا۔

''کھالیں، اپنی جان سے جائیں گے میرا کیا بگاڑیں گے۔''

نرملا ہنس پڑی۔

''اری بڑی مورکھ ہے، یہ شاہو جی کے لیے کہہ رہی ہے، اپنے منگیتر کے لیے، اپنے من مندر کے دیوتا کے لیے، کچھ ہوش میں ہے؟''

آشا نے بے نیازی کے ساتھ کہا۔

''میں اس وقت تک ہوش میں نہیں آسکتی جب تک تمہیں خوش نہ دیکھ لوں۔''

نرملا نے اُسے تکتے ہوئے کہا۔

''یہ ناممکن سی آرزو ہے آشا۔''

آشا نے بڑے یقین کے ساتھ کہا:

''دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔''

نرملا نے پوچھا:

''کیا تو سمجھتی ہے میں اپنی مراد پا سکتی ہوں؟''

آشا نے ایک منجم کی طرح اس کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

''دنیا میں کیا نہیں ہوتا، کیا نہیں ہوسکتا؟''

نرملا ایک آہ سرد کے ساتھ گویا ہوئی:

''یہ صرف دل خوش کن اُمیدیں ہیں، کیوں آشا؟ کیا میں چاند کو اپنے دامن میں لے سکتی ہوں، کیا میں ستاروں کو آسمان کی چادر سے توڑ کر اپنی مٹھی میں پکڑ سکتی ہوں! نہیں یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ جس طرح یہ نہیں ہوسکتا اسی طرح میری آرزوئیں پوری نہیں ہوسکتی ہیں۔ میں اپنی مراد نہیں پاسکتی، مقدر کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔''

آشا نے دانت پیستے ہوئے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا:

''میرا بس چلے..... میرا بس چلے..... میرا بس چلے تو۔''

نرملا حیرت سے اُسے دیکھنے لگی، پھر بولی:

''کس بات میں اپنا بس چلانا چاہتی ہو..... مقصد کیا ہے، کیا کرنا چاہتی ہو، کچھ معلوم بھی تو ہو؟''

آشا نے اسی خفگی اور برہمی کے لہجے میں کہا:

''گلا گھونٹ دوں!''

نرملا کو آشا کی سلامتی حواس پر شبہہ ہونے لگا۔ اس نے پریشان نظروں سے اُسے دیکھا۔

آشا تجھے کیا ہوگیا ہے، تو کس کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے؟''

وہ چڑھے ہوئے تیوروں کے ساتھ گویا ہوئی۔

''تمہارے ان کا..... اسی غزنوی کا!''

نرملا کو ہنسی آگئی۔

''اس غریب نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

آشا کہنے لگی:

''میں اس کی آنکھیں پھوڑ دوں گی، اس کا منہ نوچ لوں گی۔ اس کی ناک کاٹ ڈالوں گی، اُسے لولا، لنگڑا کر دوں گی، میں اُسے بدصورت کر دوں گی۔''

نرملا نے اور زیادہ متوحش نظروں سے اُسے دیکھا اور بولی:

''کیوں...... آشا تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

آشا بولی:

''ہاں میں دیوانی ہوں، لیکن اگر وہ مجھے کبھی کہیں دکھائی دے گیا تو سچ کہتی ہوں اس کی خیر نہیں، میں اسے اتنا بدصورت بنا دوں گی کہ تم اپنا پیار، اپنی محبت واپس لینے کے لیے مجبور ہو جاؤں گی۔''

نرملا نے پیار بھری نگاہ آشا پر ڈالی:

''نہیں آشا تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو، کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنا پیار واپس لے لوں، اپنی محبت واپس لے لوں۔''

آشا نے بھولے پن سے سوال کیا:

''اگر وہ بدصورت ہو جائے پھر بھی اس سے محبت کرتی رہو گی؟''

نرملا نے کچھ سوچتے ہوئے (سنجیدگی کے ساتھ) کہا:

''آشا میں اس کی صورت سے کبھی محبت نہیں کرتی تھی۔ مردوں کو زیادہ خوبصورت ہونا بھی نہیں چاہیے۔ خوبصورتی صرف عورت کا حق ہے، میں تو اُن کی آن پر اس کے بانکپن پر، اس کی ہمتِ مردانہ پر جان دیتی تھی، اور اب اس کی سیرت اور کردار سے بھی پیار کرنے لگی ہوں...... آشا سوچو تو سہی، جو شخص تن تنہا شیر کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے اور جس عورت کو اس کے ساتھی، اس کے عزیز، اس کے چاہنے والے شیر کے منہ میں چھوڑ کر بھاگ جائیں، اسے وہ نئی زندگی عطا کر دے۔ کیا اس سے نفرت کی جا سکتی ہے! اب تو میں یہ کہتی ہوں کہ اگر وہ اندھا ہوتا، لنگڑا ہوتا، انتہائی بدصورت ہوتا تو بھی میں اس سے محبت کرتی۔ اتنی ہی جتنی اب کرتی ہوں۔''

لاجواب ہو کر آشا نے کہا:

''تمہارا تو دماغ چل گیا ہے، اس مالیخولیا کا بھی کوئی علاج ہے، یہ بات تو ہم نے آج ہی سنی کہ محبت صورت سے نہیں کی جاتی آن سے کی جاتی ہے، بانکپن سے کی جاتی ہے سیرت اور کردار سے کی جاتی ہے۔ ہاں بھئی دیوانوں کی باتیں کون سمجھ سکتا ہے۔''

نرملا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس نے آشا کو گلے سے لگالیا، پھر بولی:

''مان لی ہار تم نے؟''

سادگی اور معصومیت کے ساتھ آشا نے جواب دیا۔

''پھر کیا کروں۔تمہارے سامنے کس کا زور چل سکتا ہے۔اچھا بھئی کیے جاؤ محبت چاند تاروں سے، سچ ہی تو کہا تھا تم نے، بھلا کوئی چاند کو بھی پکڑ سکا ہے، کوئی تاروں پر بھی جال ڈال سکتا ہے؟''

نرملا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''میں جانتی ہوں آشا، میری قسمت میں نامرادی ہے، لیکن پگلی مقدر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟ سمجھ لے تیری ایک بہن جو تجھے بہت عزیز تھی، اپنی دیوانگی کی نذر ہوگئی۔''

آشا کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔

''بس تمہاری انہی باتوں سے تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے، کیا ساری زندگی اسی طرح گزار دو گی؟''

جیسے یہ کوئی بہت معمولی سا سوال ہو۔

''تو کیا ہوا؟''

آشا نے ایک اور چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔

''اور اگر بڑے مہاراج نے تمہاری شادی کسی سے کر دی تو کیا ہوگا؟''

نرملا نے اپنی انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''اس کا علاج میرے پاس موجود ہے۔''

آشا چیخ پڑی:

''زہر......!''

نرملا نے بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ جواب دیا:

''تو اتنی گھبرا کیوں گئی......اری نادان...... یہ تیرے لیے نہیں میرے لیے ہے۔نرملا کے لیے! تو خواہ مخواہ سہمی جا رہی ہے۔''

آشا نے ایک تڑپ کے ساتھ کہا:

''تو کیا تم سمجھتی ہو اس کے بعد میں زندہ رہ جاؤں گی..... اب تم میری تذلیل بھی کرنے لگیں، خود میری نظر میں مجھے رسوا کرنے کی ٹھان لی ہے تم نے۔''

یہ الفاظ آشا نے کچھ ایسے اثر انگیز لہجے میں کہے کہ نرملا بہت متاثر ہوئی اس نے بڑے ملائم اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''آشا.....!''

''اور اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی، جو دستۂ فوج ساتھ تھا اس میں عجیب طرح کی افراتفری پیدا ہوئی..... بھاگ، دوڑ، نعرے، غل، شور، ہنگامہ، تلواریں چمکنے لگیں، نیزے جنبش میں آ گئے، سر کٹ کٹ کر گرنے لگے تھے۔ فریاد و شیون اور آہ و فغاں کی دردناک آوازوں سے زمین ہلنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت برپا ہوگئی ہے؟''

(8)

ایک اور مصیبت

نرملا اور آشا سہمی ہوئی اپنی رتھ میں بیٹھی تھیں، آخر لرزتی ہوئی آواز میں نرملا نے ایک کہار سے، جو پالکی کے پاس کھڑا بید کی طرح کانپ رہا تھا، پوچھا:

''یہ کیا ہو رہا ہے! کس سے جنگ ہو رہی ہے، کیا کوئی دشمن چڑھ آیا ہے؟''

کہار نے سرگوشی کے انداز میں لیکن سخت دہشت زدگی کے عالم میں جواب دیا:

''راجکماری، یہ تو ڈاکو معلوم پڑتے ہیں؟''

بے ساختہ آشا کے منہ سے نکلا:

''ڈاکو......!''

کہار نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''ہاں راجکماری جی ڈاکو......اور کون ہو سکتا ہے......؟''

نرملا نے پوچھا:

''آخر وہ کتنے ہیں؟''

کہار نے جواب دیا:

''بہت سے۔''

آشا نے کہا:

''تو ہمارے آدمی کون سے کم ہیں!......وہ بھی بہت سے ہیں۔''

کہار نے جواب دیا:

''اب تو نہیں ہیں۔''

نرملا یہ سن کر چونک پڑی:

''کیا کہا تم نے؟''

کہار نے بتایا:

''ڈاکوؤں نے بالکل اچانک اس جھاڑی کی آڑ سے نکل کر حملہ کر دیا، ہمارے بہت سے آدمی کام آ گئے۔''

آشا کو انجام نظر آنے لگا۔

''ہمارے بہت سے آدمی کام آ گئے۔''

کہار نے تائید کی:

''جی سرکار......اور بہت سے زخمی پڑے سسک رہے ہیں، اور......''

نرملا نے ذرا غصے سے کہا:

''کہتے کیوں نہیں، اور کیا بات ہے؟''

کہار نے ڈرتے ڈرتے کہا:

''راجکماری جی باقی لوگ بھاگ گئے۔''

یہ سُن کر نرملا اور آشا کی جان سوکھ گئی، نرملا نے پوچھا:

''گویا اب ہم ڈاکوؤں کے قبضے میں ہیں۔''

کہار نے عرض کیا:

''جی سرکار!''

بے ساختہ آشا کے منہ سے نکلا:

''پھر اب کیا ہو گیا؟''

کہار نے بے بسی کے ساتھ کہا:

''جو ڈاکو چاہیں گے؟''

نرملا نے کہا:

''گھوڑا لاؤ، میں اس کی پر بیٹھ کر سفر جاری رکھوں گی، مجھے کوئی نہیں روک سکتا!''

کہار نے پہلے سے زیادہ بے بسی کے ساتھ کہا:

''راجکماری جی ہمارے چاروں طرف پہرہ قائم ہے ہم یہاں سے جنبش بھی نہیں کر سکتے، اگر ایک قدم بھی اٹھائیں تو ابھی ان کے نیزے ہمیں چھلنی کر دیں گے۔''

اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے اس نے کہا:

''ان کا ایک گروہ اسی طرف آ رہا ہے......ساتھ ان کا سردار بھی ہے۔''

یہ سن کر نرملا اور آشا دونوں بید لرزاں کی طرح کانپنے لگیں۔ آشا نے روتے ہوئے کہا:

''ہائے رام کس مصیبت میں پھنس گئے ہم لوگ؟''

نرملا نے استقلال کے ساتھ کہا:

''آشا مت گھبراؤ......ڈاکو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

آشا نے روتے روتے اس کی طرف دیکھا اور بولی:

''کیسے نہیں بگاڑ سکتے ہمارے سپاہی کام آئے یا بھاگ گئے، ہم ڈاکوؤں کے قبضے میں ہیں۔''

نرملا کی آواز آشا کے پردۂ گوش سے ٹکرائی:

''نہیں ہم اپنے قبضے میں ہیں......تم اس انگشتری کو بھول گئیں، یہ میری اور تمہاری دونوں کی مشکل کو حل کردے گی، بے عزت ہو کر نہ میں زندہ رہ سکتی ہوں نہ تمہیں زندہ رہنا چاہیے، کیوں آشا تیار ہو؟''

آشا نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ جواب دیا۔

''ہاں نرملا تیار ہوں......بس اب دیر نہ کرو......لاؤ پہلے مجھے دو......قبل اس کے کہ ڈاکو یہاں تک پہنچ سکیں۔''

آشا نے ہاتھ نرملا کی انگوٹھی کی طرف بڑھایا، نرملا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، پہلے میں پھر تم۔''

اتنا کہنے کے بعد نرملا انگوٹھی اتارنے لگی۔

یکا یک......یکا یک پھر شور وغوغا کی آوازیں آسمان سے ٹکرانے لگیں......پھر ہنگامہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوگیا، پھر تلواریں چمکنے لگیں۔ نیزے سینوں سے ٹکرانے لگے، گردنیں کٹنے لگیں۔ آہ وفریاد اور نالہ وفغاں کی دردناک آوازیں فضا میں گونجنے لگیں......افراتفری، بھاگ دوڑ، غل، شور ہنگامہ!''

آشا کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا، اس نے کہا:

''اب کیا ہو رہا ہے......؟ کیا کوئی نئی آفت؟''

نرملا نے سوال کیا:

''کیا ڈاکو آپس میں لڑنے لگے؟''

کہار نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''نہیں یہ بات تو نہیں ہے سرکار۔''

نرملا نے برہم ہو کر پوچھا:

''پھر کیا بات ہے؟ بتاتا کیوں نہیں؟''

کہار نے سراپا عجز بن کر عرض کیا:

''کیا بتاؤں سرکار؟''

نرملا نے پوچھا:

''یہ کیا ہو رہا ہے، اب کیسی لڑائی ہو رہی ہے؟''

آشا نے ایک سوال کر ڈالا،

''کیا ڈاکوؤں کا دوسرا گروہ آ گیا ہے؟''

کہار ٹکٹکی لگائے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا، اُس نے بالکل لاجواب ہو کر کہا:

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا سرکار، نہ جانے کس گھڑی ہم دلی سے چلے تھے۔''

پھر یکایک ایک جوش کے ساتھ کہار نے کہا:

''سرکار ڈاکو بھاگ رہے ہیں؟''

آشا نے حیرت سے پوچھا:

''ڈاکو بھاگ رہے ہیں...... سچ!''

''جی سرکار، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہیں، اپنے مُردوں اور زخمیوں تک کو چھوڑے جا رہے ہیں، لیکن نہیں وہ بھاگ نہیں سکتے۔''

یہ عجیب بات سن کر نرملا خاموش نہ رہ سکی۔

''کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے! کبھی کہتے ہو ڈاکو بھاگ رہے ہیں، کبھی کہتے ہو بھاگ ہی نہیں سکتے، کیا ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی ہیں کسی نے؟''

وہ اسی طرح سامنے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا، اور گویا ہوا:

''سرکار میں نے جھوٹ نہیں کہا، ڈاکو بری طرح بھاگ رہے ہیں، جس طرح ہمارے آدمیوں کو قتل اور زخمی کرنے کے بعد انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور ہم یہاں سے کسی طرح نہیں نکل سکتے، اسی طرح...... سرکار بالکل اسی طرح اب ڈاکو گھیرے میں آ گئے ہیں، کوئی

راستہ بھاگنے کا نہیں ہے، جدھر جاتے ہیں نیزہ سامنے نظر آتا ہے، تلوار سر پر چمکنے لگتی ہے، پھر گھوڑا کہیں اور لاش کہیں۔''

پھر اس طرح خوش ہو کر جیسے ڈاکوؤں کو یہ شکست فاش خود اسی نے دی ہوی، وہ بولا:

''اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔''

پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

''وہ مارا......''

نرملا نے خیال کیا، دہشت اور سراسیمگی سے اس شخص کا دماغ چل گیا ہے، یہ حواس کھو بیٹھا ہے، پاگل ہو گیا ہے، اس نے رحم آمیز لہجے میں کہا:

''اس قدر نہ گھبراؤ، مرد آدمی ہو، حوصلہ سے کام لو، ہماری فکر نہ کرو، ہمارے پاس زہر ہے۔ ہم تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، ہمارے بدن تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔

لیکن جیسے نرملا کی یہ باتیں اس نے سنی ہی نہیں، اسی خوشی کے لہجے میں سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''کیا بھرپور ہاتھ مارا ہے واہ وا......واہ......!''

آشا چپ چاپ تصویر حیرت بنی اُسے دیکھ رہی تھی، دفعتہً خوشی سے اُچھلتے ہوئے بولا:

''کس صفائی سے گردن لڑھکتی جا رہی ہے نالہ کی طرف، پھر اور زیادہ جوش مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا:

''گھوڑا جیسا وفادار ساتھی بھی دغا دے گیا۔''

آشا اور نرملا دونوں یہ ریسلنگ کمنٹری سن رہی تھیں اور وہ کہے جا رہا تھا۔

''ایسا بدکا کہ ٹاپوؤں سے روند ڈالا اپنے سوار کو، بھلا سرکار ایسا بھی ہوا ہے کبھی، کہیں گھوڑا بھی اپنے سوار کو روند سکتا ہے! لیکن میں دیکھ جو رہا ہوں بھگوان تمہارے نیائے (انصاف) کا کیا کہنا، پاپی کو اُس کے پاپ کی سزا مل گئی۔''

آشا میں زیادہ سننے کی تاب نہ رہی، اس نے برہم لہجے میں کہا:

''چرس تو نہیں پی لی ہے تو نے؟''

''کیا بکواس لگا رکھی ہے؟''

وہ اسی ترنگ کے عالم میں گویا ہوا:

''سرکار ڈاکوؤں کا سردار مارا گیا، اور اس کے بہت سے ساتھی بھی، مار ڈالے گئے!''

''اور بہت سے بھاگ گئے کیوں؟...... آشا نے پوچھا۔''

''جی نہیں سرکار...... شیروں کے سامنے سے بھاگ کون سکتا ہے، بہت سے مارے گئے، باقی پکڑے جا رہے ہیں، جو ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اس کی گردن لڑھکنے لگتی ہے، اب جا کر دل ٹھنڈا ہوا ہے سرکار!...... سچ ہے بھگوان کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں، بلکہ اب تو میں کہتا ہوں، بھگوان کے گھر میں نہ اندھیر ہے، نہ دیر، کتنی جلدی بدلا ملا ہے پاپیوں کو...... کہاں تو وہ زور شور تھا کہ معلوم ہوتا تھا، دھرتی ان کے بوجھ سے پھٹ جائے گی، کہاں یہ حال ہے کہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر جان کی امان مانگ رہے ہیں، کائر کہیں کے۔''

اب نرملا اور آشا کی بھی جان میں جان آ چکی تھی، ایک بہت بڑے خطرہ سے، ایک بہت بڑے دشمن سے نجات مل گئی تھی، دونوں کے چہرہ پر ابھی ذرا دیر پہلے دہشت، سراسیمگی اور خوف کی جو کیفیت نظر آ رہی تھی وہ اطمینان سے بدل گئی تھی، لیکن یکا یک نرملا کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا، اس نے پوچھا:

''کیوں جی...... یہ لوگ، جنہوں نے ان ڈاکوؤں کو مارا ہے، ہیں کون! کہیں یہ خود بھی تو ڈاکو نہیں ہیں؟''

وہ کچھ سوچنے لگا، گویا سوال کی سنجیدگی اور اہمیت کو وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا اس نے ذرا دیر تک کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اور زیادہ غور سے سامنے کی طرف دیکھا اور کہا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ کون لوگ ہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ اچھے لوگ ہیں، ایسے لوگ ڈاکو نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ ڈاکو ہوتے تو ضرور اب تک اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئے ہوتے...... دیکھئے نا سرکار یہ لوگ ڈاکو زخمیوں کو پانی پلا رہے ہیں، ان کی مرہم پٹی کر رہے ہیں، انہیں سہارا دے کر اُٹھا رہے ہیں، بھلا ڈاکو بھی کہیں ایسا کر سکتے ہیں! وہ مرتے ہوؤں کو ٹھوکر لگاتے ہیں۔ وہ تو زخمیوں کو چلتے چلتے ایک اور چرکا لگا دیتے ہیں، وہ تو مرے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتے، لاشوں کی تلاشی لیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کی جیب میں ہوتا ہے ہتھیا لیتے ہیں، اور اگر کچھ نہیں ہوتا تو لاش کے ہتھیار اور کپڑے تک اتار لیتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں نے ہمارے آدمیوں کے ساتھ یہی سب کچھ کیا تھا۔''

''مگر یہ لوگ......؟ آشا نے پوچھا۔''

''یہ لوگ......ارے سرکار یہ لوگ ایسے نہیں ہیں...... بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔''

نرملا بولی:

''اگر بہت اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں تو یہاں کھڑے باتیں کیوں بنا رہے ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟''

آشا نے لقمہ دیا:

''ہاں جاؤ، اور خبر تو لاؤ یہ کون لوگ ہیں، ہمارے ساتھ ان کا سلوک کیا ہوگا؟''

وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھتا ہوا بولا:

''اب ڈر کی بات نہیں، میں جاتا ہوں راجکماری جی؟''

(9)

وہی بانکا سوار

نرملا اور آشا امید وبیم کے عالم میں بیٹھی انتظار کر رہی تھیں کہ دیکھئے کہار کیا خبر لاتا ہے کہ اتنے میں آشا نے کہا:

''نہ جانے کیوں مجھے تو ڈر لگ رہا ہے؟''

نرملا نے حواس قائم رکھتے ہوئے کہا:

''یہ بیٹھے بیٹھے ایک دم سے ڈر کیوں لگنے لگا؟ کوئی سبب بھی؟''

آشا پہلو بدلتی ہوئی بولی:

''سبب تو کوئی خاص نہیں...... لیکن یہ کون لوگ ہیں؟''

نرملا نے اطمینان دلایا: ''یہی معلوم کرنے تو بھیجا ہے آدمی کو، ابھی معلوم ہو جائے گا ذرا دیر میں۔''

آشا نے اٹھ کر باہر کی طرف جھانکتے ہوئے کہا:

''نہ جانے کہاں مر گیا کمبخت۔''

پھر اپنا منہ اندر کر لیا۔

''اس کا تو پتہ نہیں مگر کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں، لیکن عجب بے ڈھنگے سے نظر آتے ہیں، میں نے تو ایسے لوگ کبھی دیکھے نہیں۔''

اتنے میں چند لوگ رتھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے، ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے اس رتھ میں؟''

آشا نرملا سے لپٹ گئی، لیکن نرملا نے اپنے حواس قائم رکھے، وہ پالکی سے باہر نکل آئی، اس نے کہا:

''میں......!''

دفعتہً اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو اُن سب میں ممتاز نظر آ رہا تھا۔

اس پر حیرت اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آ......آپ......''

وہ آدمی مسکراتا ہوا بڑھا، اس نے بھی حیرت اور اشتیاق کے ساتھ کہا:

''اوہو آپ ہیں!''

پھر وہ مسکراتا ہوا گویا ہوا:

''عجیب اتفاق ہے، پہلی مرتبہ جب ملاقات ہوئی تو آپ شیر کے سامنے کھڑی تھیں، اور آج اس طرح ملنا ہوا کہ ڈاکوؤں نے نرغے میں گھیر رکھا تھا۔''

نرملا نے مرتعش لہجے میں کہا:

''اور دونوں مرتبہ آپ ہی نے میری جان بچائی۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بختیار خلجی تھا جو ایک دستۂ فوج کے ساتھ ایک مرتبہ پھر پرتھوی راج کو سلطان شہاب الدین غوری کا پیغام پہنچانے لے جارہا تھا۔

نرملا کے اس اظہار سپاس کے جواب میں اس نے کہا:

''وہ تو میرا ایک انسانی فرض تھا، لیکن اگر آپ کی نظر میں اس کی کچھ وقعت ہے تو مجھے فخر ہے!''

یک دم نرملا کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی، کان کی لویں تپنے لگیں، لیکن جلد ہی اپنی اس کیفیت پر وہ غالب آگئی۔

''لیکن آپ وہاں بھی پہنچ گئے، یہاں بھی آگئے، آخر کس طرح؟''

''بختیار ہنسنے لگا۔''

کیا آپ مجھے جن یا بھوت سمجھتی ہیں کہ جہاں چاہوں پہنچ جاؤں۔''

نرملا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ آشا بھی رتھ سے اتر کر نرملا کے پاس آکر کھڑی ہوگئی، بختیار نے سوال کیا:

''میں یہ پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ آپ کون ہیں، کہاں جارہی ہیں، کہاں سے آرہی ہیں! میرا مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیے پہنچادوں؟''

نرملا کے بجائے آشا نے جواب دیا:

''یہ راجکماری نرملا ہیں، بڑے مہاراج یعنی پرتھوی راج کی محبوب بھانجی، اور چھوٹے

مہاراج یعنی کھانڈے راؤ کی بھی محبوب بھانجی، اور میری یعنی چھوٹے مہاراج کھانڈے راؤ کی لڑکی آشا کی محبوب بہن۔''

بختیار نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

''بہت خوب...... بہت خوب......''

آشا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''ہم لوگ دلی سے اجمیر جا رہے تھے، میں نے بہت روکا انہیں، لیکن نہ جانے ان پر کیا دیوانگی طاری تھی کہ ایک نہ سنی، فوراً چل کھڑی ہوئیں، جیسے کوئی انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

نرملا نے آہستہ سے چٹکی لی، لیکن آشا کی تقریر جاری تھی۔

''اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہوگی کہ آپ جیسا بہادر اور شریف شخص ہمارا محسن ہے، میں اپنی بہن نرملا سے آپ کی تعریف سن چکی ہوں، آپ ہی نے تو اسے شیر کے منہ سے نکالا تھا۔ اور اس وقت بھیڑیوں کے پنجہ سے چھڑایا۔''

بختیار ہنسنے لگا۔

''آپ تقریر بڑی اچھی کر لیتی ہیں، اب یہ بتائیے کہ دہلی واپس جانے کا ارادہ ہے یا اجمیر جانے کا؟...... میں ہر طرح خدمت کو حاضر ہوں، اگر آپ دہلی جانا چاہیں تو وہاں پہنچا آؤں، اجمیر کا ارادہ ہو تو وہاں جا ہی رہا ہوں۔''

آشا نے نرملا سے پوچھا:

''بتاؤ......''

وہ بولی:

''اجمیر......!''

بختیار نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا:

''بہت بہتر۔''

اب رات ہو چلی تھی، اس نے رائے پیش کی:

''میرے سپاہی اس جنگ میں کافی تھک گئے ہیں، کچھ لوگ ہلاک اور زخمی بھی ہوئے ہیں، ان کا انتظام بھی کرنا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ رات کو یہیں پڑاؤ کریں اور صبح کوچ کریں۔''

نرملا کو کچھ متامل دیکھ کر اس نے کہا:

''لیکن اگر آپ کہیں تو اسی وقت کوچ کرنے کو تیار ہوں۔''

نرملا نے شیریں لب ولہجہ میں کہا:

''صبح ہی کوچ کرنا بہتر ہوگا۔''

یہ سنتے ہی بختیار نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، وہ تیزی سے روانہ ہو گئے۔ پھر اُس نے نرملا اور آشا سے کہا:

''آیئے تشریف لایئے۔''

جب تک یہ لوگ پہنچے خیمے نصب ہو چکے تھے، چھولداریاں لگ چکی تھیں، ایک شاندار خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بختیار نے کہا:

''آپ یہاں آرام کریں گی۔''

پھر اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا:

راجکماری کے جتنے ساتھی زندہ بچے ہوں انہیں بھی تلاش کر کے آرام سے رکھو، اور ہاں راجکماری اور ان کے آدمیوں کے لیے کھانے کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔''

نرملا نے تکلف کرتے ہوئے کہا:

''نہیں یہ زحمت نہ گوارا کیجئے، ہمیں بھوک نہیں ہے۔''

آشا نے بھی تائید کی۔

''تھی تو مگر مر گئی!''

بختیار نے ہنستے ہوئے کہا:

''میرا خیال ہے کہ مُردہ دل کو زندہ کرنے کی بھی طاقت رکھتی ہیں آپ؟''

نرملا ہنسنے لگی، آشا جھینپ گئی، بختیار نے کہا۔

''میں جانتا ہوں آپ ہم مسلمانوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتیں۔ یہ آپ کا مذہبی مسئلہ ہے، اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ غالباً آپ کے آدمیوں میں سے کچھ لوگ پکانا ضرور جانتے ہوں گے، یہ خدمت انہی سے لی جائے گی؟''

انکار کرتے وقت نرملا کے ذہن میں چھوت چھات کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے یونہی از راہ تکلف انکار کیا تھا۔ بختیار کی یہ باتیں سن کر وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا، ایسے اونچے اور بلند کردار لوگوں سے چھوت چھات کا برتاؤ کرنا انسانیت کی

توہین ہے۔ اگر دھرم اسی کا نام ہے تو پھر ادھر......! نہیں یہ دھرم نہیں ہو سکتا، کم از کم میں اسے نہیں مانتی، یہ سوچ کر اس کا حوصلہ بلند ہو گیا، اس نے کہا۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا میرے نزدیک اتنا ہی پوتر ہے جتنا کسی ہندو رسوئیے کے ہاتھ کا پکایا ہوا...... میں نے تو اس لیے انکار کیا تھا کہ بھوک نہیں تھی، لیکن آپ کی غلط فہمی رفع کرنے کیلئے دکھاؤں گی۔ میں آپ سے اصرار کرتی ہوں کہ کھانا کسی مسلمان ہی سے پکوایئے۔''

یہ باتیں سُن کر آشا جل گئی۔ اس نے ایک زور کی چٹکی لی، اسی اثنا میں بختیار نے کہا:

''یہ آپ کی انسانیت دوستی اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے، میری نظر میں آپ کی عزت کئی گناہ زیادہ ہو گئی، لیکن کھانا کوئی ہندو ہی پکائے گا، اور یقین کیجئے میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤں گا!''

...... ◈ ◈ ......

(10)

دَھرم کا سوال

بختیار کے جانے کے بعد آشا پنجے جھاڑ کر نرملا کے پیچھے پڑ گئی۔

''میں کہتی ہوں تمہیں ہو کیا گیا ہے، کچھ ہوش میں ہو؟''

نرملا مسکراتے ہوئے بولی:

''ویسے تمہیں دیکھ کر تمہارے پاس بیٹھ کر ہوش میں کم ہی رہتی ہوں، لیکن ہوا کیا کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''تمہارا سَر۔'' آشا نے جل کر کہا۔

''مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی تناول کرنے پر تیار ہو گئیں۔''

''تو کیا ہوا؟'' نرملا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، ہوتا کیا؟'' آشا اور جل کر بولی۔

''کل کو مسلمان بھی ہو جانا، اور جب کوئی پوچھے کہ یہ کیا کیا، تو اسی بھولپن سے کہنا، تو کیا ہوا؟''

نرملا ہنسنے لگی۔

''پنڈت جی مہاراج غصہ تھوک دیجئے، ورنہ واقعی بھوک مر جائے گی اور مجھے بڑا افسوس ہوگا میں تو کھاؤں اور آپ صرف میرے لقمے گنیں!''

آشا کا موڈ واقعی خراب ہو گیا تھا، اس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

''اپنا دھرم اپنا دھرم ہے!''

نرملا بولی:

''یہ تو میں بھی کہتی ہوں۔''

آشا نے اعتراض کیا:

''مگر تم بھی یہی کہتی ہو تو پھر مسلمان کا پکایا ہوا کھانا کھانے پر کیوں رضامند ہو گئی تھیں۔''

نرملا نے جواب دیا:

''اس لیے کہ میرا دھرم انسان انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا، جس طرح ہم آدمی ہیں مسلمان بھی اسی طرح آدمی ہیں۔ جس طرح ہم میں اچھے اور برے سب طرح کے لوگ ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہیں۔''

آشا زیادہ نہ سُن سکی۔

''آخر اس تقریر سے تمہارا مطلب کیا ہے؟''

نرملا نے بتایا:

''صرف یہ کہ انسان پاک ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، کسی انسان کا کسی دوسرے آدمی کو ناپاک سمجھنا اچھوت، حقیر اور ذلیل سمجھنا خود اسی کی گراوٹ کی دلیل ہے۔''

آشا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''بس معلوم ہو گیا، تمہاری حقیقت معلوم ہو گئی۔''

نرملا نے سوال کیا:

''یعنی......کیا معلوم ہوا؟......ذرا صاف صاف کہو۔''

آشا نے چڑھی چتون کے ساتھ جواب دیا:

''تم ہاتھ سے گئیں۔''

''کہاں، کہاں بھیج رہی ہو مجھے؟''

''تم ضرور دل میں مسلمان ہو چکی ہو۔''

''(ہنستے ہوئے) چل پگلی کہیں کی، میں کیوں مسلمان ہوتی، تو نہ ہو جا، مجھے اپنا دھرم اتنا ہی عزیز ہے جتنا ہونا چاہیے۔''

''جب ہی تو مسلمان کا پکایا ہوا کھانا تک نوش جان کرنے کو تیار ہو گئیں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے...... جو مذہب نفرت کی تعلیم دیتا ہو وہ مذہب ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے ہمارا مذہب ایسی تعلیم نہیں دیتا۔''

''نہیں دیتا...... پھر یہ کروڑوں اچھوت کہاں سے پیدا ہو گئے؟''

''بھگوان نے تو انہیں اسی طرح پیدا کیا تھا جس طرح ہمیں پیدا کیا ہے۔ مگر ہم نے اپنی غرض، اپنی ضرورت اور اپنی حماقت سے آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد کو اچھوت بنا دیا۔''

''نرملا تم ضرور پاگل ہو گئی ہو ایسی باتیں نہ کرو...... ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گی۔''

''پاگل ہوں تمہارے دشمن بھلا جو دوسروں کو دیوانہ بنا سکتا ہو، وہ خود کیسے پاگل ہو جائے گا؟''

''تمہاری انہی باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ ہر بات کو مذاق میں اڑا دینا کون سی ادا ہے۔''

''وہی جس پر تم جان دیتی ہو...... کیا نہیں؟''

''(ہنستے ہوئے) ہٹو بھی!''

''اب خود ادائیں دکھانے لگیں۔''

''میں پوچھتی ہوں آخر کھانا کب آئے گا! کیا ساری رات انتظار کرنا پڑے گا؟''

نرملا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہی کہار جس سے نرملا اور آشا کی باتیں ہو رہی تھیں گرما گرم کھانے کے دو تھال لے کر حاضر ہوا، نرملا نے آشا کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''لو بھئی مبارک...... اس وقت جو مانگتیں مل جاتا۔''

آشا نے طنز کرتے ہوئے کہا:

''تمہیں تو بن مانگے دل کی مراد مل گئی؟''

''تمہاری دشمن جو ہوں۔''

''اب اتنا سفید جھوٹ بھی نہ بولو...... تم اور نرملا کی دشمن! یہ بات تو اگر بھگوان بھی کہیں تو نہ مانوں؟''

(ہنستے ہوئے) اچھا بابا میں ہاری تم جیتیں۔ اب کھانا تو کھا لینے دو پھر جی بھر کے ستا لینا کیونکہ تو تار تپار ہوئی جا رہی ہوں مارے بھوک کے۔

نرملا نے ایک تھال اپنے آگے رکھ لیا، ایک آشا کی طرف بڑھائی اور دونوں مزے لے لے کر کھانے لگیں۔ دو تین لقمے کھانے کے بعد آشا بولی۔

''ہے تو مزے کا!''

نرملا نے پانی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارا اور بولی:

''ہاں...... لیکن زیادہ نہ کھا جانا، سفر کا معاملہ ہے، اگر کہیں دست شروع ہو گئے تو کیا کرو گی؟''

آشا نے کوئی جواب نہیں دیا، پورے انہاک اور یکسوئی کے ساتھ کھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

(11)

آپس کی چہلیں

کھانے سے فراغت کے بعد دونوں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئیں، آشا نے کہا۔

''سو جاؤ، تاکہ صبح ٹھیک وقت پر آنکھ کھل جائے۔''

نرملا نے چادر اوڑھ لی۔

''نیند بھی آ رہی ہے۔''

ذرا دیر کے بعد آشا نے کہا۔

''نرملا......نرملا......کیا سو گئیں؟''

نرملا نے جواب دیا:

''سوئی تو نہیں، ذرا جھپکی آ گئی تھی، کیا بات ہے؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''آ جائے گی، آنکھیں بند کر لو۔''

''اتنی دیر سے یہی تو کر رہی ہوں، مگر وہ تو غائب ہے۔''

''لیکن بول جو رہی ہو، نیند اس وقت آتی ہے جب آنکھ کی طرح زبان بھی بند ہو؟''

''نرملا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

''تو بھاگ جاؤ۔''

''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟''

''پھر اور کیا کروں......اتنے بہادر لوگ تمہارے ساتھ ہیں جنھوں نے ابھی تھوڑی دیر ہوئی اتنے سارے ڈاکوؤں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر ڈال دیا۔ ہمارے چاروں طرف خیمے ہی خیمے۔ بیچ میں ہمارا خیمہ ہے۔ پہرے دار پہرا دے رہے ہیں، طلایہ گشت کر رہا ہے، پھر بھی اگر ڈر رہی ہو تو مذاق نہ اُڑاؤں تو کیا خود بھی ڈرنے لگوں؟''

''لیکن مجھے تو ڈر انہی لوگوں سے لگ رہا ہے!''

''کن لوگوں سے بے وقوف؟''

''یہی ہمارے چاروں طرف جن کے خیمے نصب ہیں، جن کے خیمے میں ہم لیٹے ہیں!''

نرملا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا کہا تم نے؟''

اس نے اپنے الفاظ دُہرا دیے:

''ڈر لگ رہا ہے مجھے۔''

''کس سے؟''

''مسلمانوں سے...... ان کے بارے میں طرح طرح کے واقعات سنے ہیں۔ ان پر اعتماد نہیں ہوتا۔ جی نہیں نکلتا، نہ جانے کب نیت بدل جائے۔ نہ جانے کب ارادہ بدل دیں۔ ہم ان کا کیا کر سکتے ہیں۔ ان کے بس میں ہیں جو چاہیں کریں۔ مالک ومختار ہیں۔''

''واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے آشا! تم اتنی بڑی احسان فراموش ہو، یہ تو میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ جن لوگوں نے اپنے کئی آدمیوں کو زخمی کرا کے تمہیں بچایا، جن کو تمہارے مذہب کا اتنا پاس ہے کہ ہندو رسوئیا پیدا کیا، اس سے کھانا پکوا کر کھلایا، اس کے بارے میں تمہارے ایسے ناپاک خیالات! چھی چھی!''

''نہیں، نہیں نرملا...... مجھے الزام نہ دو، میرا دل بہت کمزور ہے۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے، کیا کمزور دل والے احسان فراموش ہوتے ہیں؟ اپنے محسنوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، وہ آدمی جس سے تم اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں یاد کرو کیا اس نے نظر بھر کر تمہیں دیکھا، یا تم پر گستاخ نگاہ ڈالی! جو اتنا پاکباز ہو، اتنے اونچے کردار کا ہو، اسے تم شیطان سمجھ رہی ہو کیوں؟ اس لیے کہ دل کمزور ہے آشا رانی کا ایسے دل کو سینے سے نکال کر پھینک دو۔''

ہاں مجھے تو اس نے نہیں دیکھا۔

''اور اگر چہ تم نے اپنی طرف سے کوشش بہت کی!''

''چلو یہی سہی، بہر حال اُس نے مجھے تو بے شک نہیں دیکھا۔''

''پھر کسے دیکھا...... کیا مجھے؟''

''ہاں، کیا انکار کر سکتی ہو نرملا؟''

''انکار کی کیا ضرورت ہے، کیا وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا؟''

''پھر اُس نے مجھے کیوں نہیں دیکھا؟''

''(ہنستے ہوئے) اب تم کچھ لوگی!''

''تو آخر مسلمانوں کے خلاف کچھ سُن کر جل کیوں جاتی ہو؟''

''میں مسلمانوں کے خلاف کچھ سُن کر نہیں جلتی۔ ہاں جھوٹ سے ضرور جلتی ہوں۔''

''اچھا اب چلو...... رات بھر اطمینان سے، مجھے تو اب نیند آنے لگی ہے، تم جتنی چاہو بک بک کرو، میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا؟''

یہ کہہ کر آشا جھوٹ موٹ خرخرانے لگی، جیسے سو گئی ہو۔ نرملا نے اس کے دو ہتڑ لگایا۔

''واہ ری آشا رانی...... ہماری نیند اچاٹ کر سونے چلی ہیں، کیا مجال جو تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی سونے دیا ہو...... سچ کہتی ہوں ٹھنڈے پانی کی پوری صراحی انڈیل دوں گی...... ہاں!''

آشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نرملا اُٹھ بیٹھی۔ اس نے زور سے ایک چٹکی لی، آشا بلبلا گئی......

ارے میں مری۔

''تو وعدہ کرو جب تک میں نہیں سو جاؤں گی تم بھی نہیں سوؤ گی...... کرو وعدہ!''

''اچھا بابا کرتی ہوں وعدہ۔''

دو تین منٹ تک خاموشی رہی پھر نرملا نے کہا:

''چپ کیوں ہو؟''

آشا نے پوچھا:

''پھر کیا کروں؟...... جو باتیں مجھے آتی ہیں ان سے تم خفا ہوتی ہو، جو نہیں آتیں اُن سے کس طرح خوش کر لوں تمہیں؟''

''تو گویا ٹھنڈے پانی سے نہانے کو جی چاہا ہے تمہارا؟''

''نہیں نہیں...... واقعی یہ آدمی ہے بڑا بانکا جوان!''

''کون آدمی ہے! کس آدمی کا ذکر کر رہی ہو؟''

''ارے وہی جس نے تمہیں شیر سے بچایا تھا، جس نے آج ڈاکوؤں سے چھین لیا تمہیں۔ جو تمہیں اپنے ساتھ لے کر اجمیر جا رہا ہے، سچ ایسا جیالا آدمی میری نظر سے تو گزرا نہیں۔ ایک طرف دشمن، ایک طرف دوست!''

''کس کا دشمن، کس کا دوست؟''

''تمہارا دوست، تمہارے خاندان کا دشمن۔''

''پھر آ گئیں اپنی اوقات پر!''

''تو یہ خود ہی تو باتیں کرنے کا حکم دیا۔ میں نے باتیں شروع کیں تو اعتراض جڑ دیا، نہ چپ رہتے بنتی ہے نہ بولتے، آخر کروں کیا میں بے چاری؟''

نرملا ہنسنے لگی۔

''سو جاؤ......اب مجھے بھی نیند آ رہی ہے!''

''لیکن مجھے تو نہیں آ رہی۔''

''آ جائے گی۔''

''تب ہی سونا۔''

''تو کیا ساری رات اسی طرح گزار دو گی؟''

''اب کروں گی بھی کیا سو کر، آدھی سے زیادہ رات تو بیت چکی، یہ بھی ذرا دیر میں کٹ جائے گی، پھر اطمینان سے پالکی میں سوئیں گے، راستے کی تکان بھی نہیں ہو گی۔'' نرملا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ سو چکی تھی۔

(12)

قافلے کا کوچ

صبح ہوئی!

نرملا نے آشا کو جگایا:

''کیا رات بھر سوتی رہو گی؟''

''وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔''

''واہ بڑی کہیں کی آئیں، اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی، خواہ مخواہ جگا دیا، لیکن میرا کیا گیا، تمہارا ہی نقصان ہوا!''

نرملا نے حیرت سے آشا کی طرف دیکھا پھر بولی:

''میں کہتی ہوں کیا اب کیوں سو رہی ہو؟ کیسا خواب، کس کا فائدہ، کس کا نقصان؟''

آشا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور نرملا کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا:

''میں خواب دیکھ رہی تھی کہ یہ غزنوی نوجوان تم سے محبت کر رہا ہے، پھر اس نے تم سے شادی کی درخواست کی، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! تم نے فوراً ہی ذرا بھی شرمائے یا تکلف کیے بغیر منظور کر لی اور عین اس وقت جب شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ یہ غزنوی نوجوان دولہا بن کر کرشن کی طرح اپنی چھب دکھاتا نمودار ہوا، اور تم دلہن بن کر رادھا کی طرح اپنی سندرتا کی جھلک دکھاتی جلوہ آرا ہوئیں...... کسی اور نے نہیں، کسی دشمن نے نہیں، تم نے نرملا تم نے مجھے جگا دیا! اب بتاؤ کیا ہو گا؟''

''یہ......''

یہ کہہ کر تڑاخ سے ایک طمانچہ آشا کے گال پر لگایا اور ہنسنے لگی۔ آشا نے گال سہلاتے ہوئے کہا:

''اچھا سمجھ لوں گی، میرا وقت بھی کبھی آئے گا۔''

اتنے میں بختیار خلجی آ کر خیمے کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا، اس نے نہایت شائستگی کے

ساتھ کہا:

''کیا میں آ سکتا ہوں؟''

قبل اس کے کہ نرملا کچھ کہے آشا نے جواب دیا:

''نہیں......!''

پھر آگے بڑھ کر اس نے خیمہ کے دروازہ سے گردن نکالی، اور اس طرح کہ گویا اس نے بختیار کی آواز نہیں پہچانی تھی۔ شرارت بھرے لیکن سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ارے آپ ہیں...... بھلا کوئی اپنے گھر میں پوچھ کر آتا ہے، آیئے، آجایئے!''

بختیار مسکراتا ہوا اندر آ گیا، اس نے نرملا سے پوچھا:

''کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ کو؟''

نرملا نے سپاس گزار نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولی:

''بالکل نہیں۔''

''آشا نے کہا:

''بلکہ ایسا آرام ملا جیسے ہم گھر میں ہیں۔''

بختیار نے کہا:

''کھانا تو آپ کو یقیناً ناپسند ہوا ہوگا۔ گوشت آپ لوگ کھاتیں نہیں، ترکاری سے ہم لوگوں کو شوق نہیں، ہمارے اسٹاک میں سب کچھ تھا مگر یہی چیز نہ تھی۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ آلو ملے؟ ان کی زبردستی ترکاری میں نے اپنے سامنے کھڑے رسوئیا سے بنوائی، پھر پوریاں پکوا کر آپ کو بھیج دیں۔''

آشا نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

''اور اتنے مزے سے کھایا ہے، ہم نے کہ اگر آپ نہ آتے تو کسی آدمی کو بھیج کر ہم چورن منگاتے، کھاتو بڑے شوق سے لیا لیکن اتنا زیادہ ہضم اب تک نہیں ہو سکتا۔''

بختیار ہنسنے لگا:

''بہت دلچسپ ہیں آپ۔''

آشا نے انکسار کرتے ہوئے کہا:

''صرف میں...... نرملا نہیں۔''

بختیار سٹ پٹا سا گیا۔ نرملا جھینپ گئی، وہ بولا۔

''ان کے بارے میں تو آپ ہی رائے قائم کرسکتی ہیں، میرا اب تک کا تجربہ تو یہی ہے کہ انتہائی کم سخن ہیں۔''

آشا نے چھیڑا:

''جی ہاں...... بیچاری کو بات کرنی ہی نہیں آتی۔''

نرملا نے مداخلت کی:

''کیا بکواس لگا رکھی ہے؟''

آشا نے بختیار سے پوچھا:

''دیکھ لیا آپ نے کم سخن کا بادل کی طرح گرجنا۔''

بختیار بھی ہنس پڑا اور نرملا بھی۔

پھر بختیار نے کہا:

''تیار ہو جائیے، اب کوچ کرتا ہے ہمارا قافلہ!''

آشا بولی۔

''ہمیں تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے تیار ہیں ہم۔ رتھ بھیج دیجئے بیٹھ جائیں گے۔''

بختیار مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ذرا دیر میں رتھ آ کر خیمے کے دروازے سے لگ گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر میں یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔

نرملا اور آشا کی رتھ سواروں کے بیچ میں تھی، اور بختیار اپنے گھوڑے پر سوار پالکی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جیسے محافظ اور نگہبان چلتا ہے۔ آشا سے ضبط نہ ہو سکا اُس نے پھر نرملا کو چھیڑا۔

''آخر یہ ہمارے ساتھ ساتھ کیوں چل رہا ہے۔''

نرملا نے تلخ لہجے میں کہا:

''تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟''

آشا نے منہ بنا کر کہا۔

''یہ ہماری توہین ہے، ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر اپنی توہین کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتے...... یہ اس طرح ساتھ ساتھ چل رہا ہے جیسے ہم چور ہیں کچھ لے کر بھاگ نہ

جائیں، جیسے ہم قیدی ہیں کہ اس کی نظر بچا کر راہ فرار اختیار کریں گے۔ جیسے ہم اس کی ملکیت ہیں۔''

نرملا نے ایک زوردار بکوٹا لیا۔

''چپ رہو، میں کہتی ہوں چپ رہو، خبردار جو ایک لفظ بھی اب منہ سے نکالا۔''

آشا تلملا گئی۔

''میری توبہ......راستہ بھر اگر ایک لفظ بھی نکل جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ حالانکہ چور شاہ بنا گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے مگر کس کے مُنہ میں دانت ہیں کہ کچھ پوچھ سکے۔''

نرملا ہنسنے لگی، پھر اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا:

''اری مورکھ تو مذاق کر رہی ہے، لیکن اگر تیرے بول ان کے کان میں پڑ گئے تو وہ کیا رائے قائم کریں گے ہمارے متعلق؟''

بڑی معصومیت سے آشا نے پوچھا۔

''کیا روٹھ جائیں گے؟''

نرملا نے جل کر کہا۔

''تمہاری ایسی تیسی!''

(13)

خدا حافظ

قافلہ چلتا رہا۔

بختیار زیادہ تر نرملا اور آشا کی رتھ کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے پر چلتا رہا کبھی کسی کام سے ذرا دیر کے لیے اپنے ساتھیوں کی طرف چلا جاتا اور پھر اپنی ''ڈیوٹی'' پر واپس آجاتا اور ساتھ ساتھ چلنے لگتا۔ اس مدت میں بار ہا نرملا اور بختیار کی آنکھیں چار ہوئیں۔ بختیار اور آشا کی نظریں ملیں، جہاں کہیں پڑاؤ ہوتا، کچھ نہ کچھ وقت باتوں میں بھی صرف ہوتا۔ آشا بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہکتی۔ نرملا بھی کچھ رکتی ہوئی، جھجکتی ہوئی، شرماتی ہوئی شریکِ تکلم ہوتی۔ بختیار ہنس ہنس کر مُسکرا مُسکرا کر باتیں کرتا۔ رزم و بزم کے واقعات سناتا۔ ایک مرتبہ تو اُس نے آشا کی فرمائش پر فارسی اشعار بھی سنائے جنہیں نہ آشا سمجھ سکی، نہ نرملا، لیکن لطف دونوں نے لیا۔

اسی طرح رواں دواں یہ قافلہ پڑاؤ کرتا اور کوچ کرتا اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ایک روز آشا نے نرملا سے کہا:

''کچھ سمجھ نہیں آتا یہ شخص بختیار کس قسم کا آدمی ہے!''

نرملا نے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا:

''کیا سمجھنا چاہتی ہو۔''

وہ بولی:

''یہ شخص انتہائی بہادر، اتنا بہادر کہ دوسروں کے لیے، اپنی جان تک خطرہ میں ڈال سکتا ہے۔ بے انتہا روادار ہے، اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ ہمیں ڈاکوؤں سے بچایا اور اب بھیگی بلی بنا ہمارے ساتھ ساتھ جو ظاہر ہے کہ دشمن ہیں، اسی طرح چل رہا ہے جیسے یہ ہمارا باڈی گارڈ ہو۔ حد درجہ شریف بھی ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر رسوئیا پیدا کیا اور ہمارے لیے ہندوانہ طرز کا کھانا پکوایا۔ خوش اخلاق اتنا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ محض ہمارا دل بہلانے کے لئے اپنا وقار، اپنی شان، اپنی شخصیت کو بالائے طاق رکھ کر ہمیں کہانیاں سناتا ہے۔ رزم بزم کی داستانیں سناتا ہے۔ اپنی زبان

کے اشعار سناتا ہے۔ جو گو سمجھ میں نہیں آتے لیکن ان کی ہر تان دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

نرملا اس طویل تقریر سے گھبرا گئی۔

''یہ سب جو تم نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ کہنا کیا چاہتی ہو! مدعا کیا ہے اس طویل تقریر کا؟''

آشا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

''مدعا صرف اتنا ہے کہ یہ شخص چاہے جو کچھ بھی ہو آدمی نہیں ہے۔''

نرملا ہنسنے لگی:

''واہ ری پگلی...... پھر کیا ہے؟''

آشا نے جواب دیا:

''یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن یہ تم نے کیسے فیصلہ کر لیا کہ یہ آدمی نہیں ہے۔''

''اس طرح کہ یہ محبت کرنا نہیں جانتا، نہ اس کی آنکھوں میں محبت رقص کرتی دکھائی دیتی ہے نہ اس کی باتوں سے محبت کا چشمہ ابلتا ہے۔''

نرملا نے مسکراتے ہوئے کہا:

''یہ شکایت ہے آپ کو...... دل تھوڑا نہ کرو، میں سفارش کر دوں گی، لیکن یہ سوچ لو پھر شاہو جی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''وہی جو تم اندر کمار کو دکھاؤ گی۔''

''(تیوری چڑھا کر) کچھ جوش میں ہو، اندر کمار سے میرا کیا تعلق۔''

''یہ لو جیسے انہیں کچھ خبر نہیں...... نرملا رانی وہ ہزار جان سے تم پر فدا ہے۔''

''(ہنستے ہوئے) شکریہ ادا کر دینا میری طرف سے اس عزت افزائی کا۔''

''مجھے کیا پڑی ہے، خود ہی ادا کر لینا۔''

''لیکن میں انہیں پاؤں گی کہاں؟''

''وہ اجمیر جلد ہی آنے والے ہیں۔''

''یہ کس لیے؟''

''تمہیں حاصل کرنے کے لیے۔''

''پھر تو واقعی میں ان کا مکرر شکریہ ادا کروں گی۔''

''مکرر کس لیے بھائی؟''

''ایک تو اس لیے کہ عاشق ہونے کے باوجود مجھے شیر کے پاس کھڑا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور دوسرے اس لیے کہ مجھ سے عشق کرتے ہیں، اگر وہ توجہ نہ کرتے نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا؟''

''شاید تم مذاق سمجھ رہی ہو میری باتوں کو۔''

''تو اور کیا سمجھوں؟...... مذاق اور وہ بھی حد درجہ بھونڈا، خبردار جو آئندہ ایسا مذاق کیا ہو گا ورنہ زبان کھینچ لوں گی۔''

''نرملا میں مذاق نہیں کرتی، میں نے خود اپنی آنکھوں سے سنا اور کانوں سے دیکھا ہے!''

''(ہنستے ہوئے) واقعی وہ بڑی عجیب چیز ہو گی جو آنکھوں سے سنی اور کانوں سے دیکھی جاتی ہے۔ اچھا بھئی تو تمہاری آنکھوں نے کیا سُنا اور کانوں نے کیا دیکھا؟''

''(روٹھتے ہوئے) جاؤ ہم نہیں بتاتے، مذاق اڑانے لگیں ہمارا؟''

''معاف کر دو اچھی آشا بہن۔''

''بھئی ہوا یہ کہ شاہو جی کے کائر پن (بزدلی) سے میں اتنی چڑ گئی ہوں کہ آتے وقت بھی ان سے نہیں ملی، لیکن روانگی سے ذرا دیر پہلے میں نے ان کی اور راندر کمار کی باتوں کی بھنک سنی، کئی دفعہ تمہارا نام بھی کانوں میں پڑا۔ پھر تو میرے کان کھڑے ہوئے اور میں اوٹ میں ہو کر سننے لگی۔ انہی کی رائے سے تو وہ اجمیر آنے والے ہیں...... کیوں نرملا پھر کیا ہو گا؟''

''ایک بات بار بار کیوں پوچھ کر اپنا اور میرا وقت ضائع کرتی ہو۔''

اتنے میں بختیار نے نرملا کو مخاطب کیا۔

''راجکماری......''

راجکماری نے ہاتھ کے اشارہ سے آشا کو روکا، پھر بولی:

''جی کہیے...... کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

بختیار نے کچھ تامل کرتے ہوئے کہا:

''جی ہاں اگر آپ سنیں۔''

نرملا آمادگی کے ساتھ بولی:

''کیسے نہیں سنوں گی...... پوچھ کر دیکھئے۔''

بختیار نے کہا:

''پوچھنا کچھ نہیں ہے، عرض کرنا ہے۔''

آشا نے ہاتھ کے اشارے سے نرملا کی بلائیں لیں، پھر شکر گزار نظروں سے رتھ کی چھت کو آسمان سمجھ کر دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے سرگوشی کرتی ہوئی بولی۔

''میرا خیال غلط تھا، یہ تو آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آ گیا جال میں...... ہوشیار!''

نرملا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بختیار سے کہا:

''جی......''

بختیار نے کہا:

''اب ہم اجمیر سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ بس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت باقی ہے۔''

''جی ہاں!...... میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''میں اب رخصت چاہتا ہوں، آپ کے ساتھ تیس چالیس بچے کھچے آدمی موجود ہیں ہی، اور اب کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن کیا آپ نے ارادہ بدل دیا، اجمیر نہیں جائیں گے؟''

آشا نے ٹوکا۔

''کیا ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے کہ آپ خفا ہو گئے؟''

بختیار نے ہنستے ہوئے کہا:

''ایک نہیں ہزار خطائیں کر کے دیکھ لیجئے۔ میں خفا نہیں ہو سکتا ہرگز......''

آشا نے نرملا کو چھیڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''یہ مردوا تو مجھ پر ڈورے ڈال رہا ہے، کچھ ہوش میں ہے۔ ایسا سیدھا کروں گی کہ دن میں تارے نظر آنے لگیں گے، میں کوئی نرملا ہوں؟''

پھر بختیار سے مخاطب ہوئی۔

''اگر آپ خفا نہیں ہیں تو پھر ساتھ چھوڑنے کا مطلب؟''

''ساتھ تو نہیں چھوڑتا، آپ آگے آگے جائیے، میں اپنے آدمیوں کے ساتھ پیچھے پیچھے آتا ہوں۔لیکن آہستہ آہستہ۔''

نرملا نے سوال کیا: ''لیکن اس کا کوئی سبب بھی تو ہوگا؟''

بختیار نے جواب دیا:

''میرے خیال میں میرا آپ کے ساتھ یا آپکا میرے ساتھ اجمیر میں داخل ہونا مناسب نہیں ہے۔''

آشا نے چمک کر پوچھا:

''لیکن اس کی وجہ بھی تو ہم بیوقوفوں کو بتا دیجئے، بڑا کرم ہوگا۔''

بختیار نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''سبب یہ ہے کہ رائے پتھورا کی طبع نازک پر یہ بات گراں گزرے گی۔''

آشا نے سوال کیا: ''یہ آپ نے کیسے جانا؟''

بختیار نے بتایا:

''بات یہ ہے کہ میں سلطان شہاب الدین کا ایلچی بن کر اس سے پہلے بھی ایک دفعہ آچکا ہوں اور جب میں یہاں سے رخصت ہوا تو مہاراج مجھ سے سخت ناخوش تھے۔اب پھر میں اپنے سلطان کا ایلچی بن کر ان کے پاس جارہا ہوں، اور شاید اس مرتبہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ناخوش ہوں گے۔میں صلح کا پیام لایا تھا اب جنگ کا پیام لے آیا ہوں، جب پہلے وہ ناخوش تھے تو اب ان کی ناخوشی کی کوئی حد نہ ہوگی۔''

پھر ذرا دم لے کر اس نے کہا:

''جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ میں نے آپ کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا، پھر میں اپنی حفاظت میں آپ کو لے کر یہاں آیا تو وہ ضرور شرمندگی محسوس کریں گے۔لہٰذا میری ایک گزارش یہ ہے کہ مجھے پیچھے آنے دیجئے آپ آگے جائیے۔''

آشا نے پوچھا:

''کیا اس کے علاوہ کوئی دوسری گزارش بھی ہے؟''

بختیار نے جواب دیا: ''جی ہاں...... وہ یہ کہ مہاراج سے میرا ذکر بھی نہ کیجئے یعنی انہیں یہ نہ بتائیے کہ آپ کے بچانے میں میرا ہاتھ ہے۔''

نرملا نے بھی قفلِ سکوت توڑا۔

''یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟''

آشا نے تائید کی۔

''ہاں یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟''

''بھلا یہ خبر کہیں چھپ سکتی ہے کس طرح؟''

نرملا نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''فرض کیجئے، ہم خاموش رہتے ہیں۔ آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔''

بختیار نے خوش ہوکر کہا: ''جی ہاں...... بس میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں۔''

نرملا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''لیکن سنیئے تو سہی۔ کیا ہمارے آدمی سب کچھ نہیں کہہ دیں گے؟ کیا جو لوگ بھاگ کر دہلی گئے ہیں ان سے چھوٹے مہاراج کو سب کچھ معلوم نہیں ہوجائے گا؟''

''اُن سے تو صرف ڈاکو کا واقعہ معلوم ہوگا، میرے بارے میں تو وہ کچھ نہیں جانتے!''

''لیکن جو آدمی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں یہ تو جانتے ہیں انہیں کس طرح خاموش رکھا جاسکتا ہے۔''

آشا نے نرملا کی اس دلیل کو بہت وزنی سمجھتے ہوئے کہا:

''اس مشکل کا حل اگر آپ بتادیں تو ہمیں تعمیلِ ارشاد میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔''

بختیار نے اس مشکل کا حل پیش کرتے ہوئے کہا:

''اس کا حل آپ کے اور راجکماری نرملا کے پاس ہے۔''

آشا کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی:

''نہیں صاحب ہمیں کانٹوں میں نہ گھسیٹیے۔ بیچاری نرملا تو ایک ہی سیدھی سادی، سادہ لوح، بلکہ بیوقوف لڑکی ہے۔ میں، جسے اپنی عقلِ رسا پر ناز ہے اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی ہوں۔ ہرگز کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا: ''میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔''

آشا نے فوراً جواب دیا: ''نیکی اور پوچھ پوچھ...... فرمایئے!''

بختیار نے آشا کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''دیکھئے آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنے آدمیوں کو ڈرایئے اور لالچ دیجئے۔''

آشا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''ڈراؤں بھی اور لالچ بھی دوں؟ اگر ڈراؤں تو لالچ کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر لالچ دوں تو پھر ڈرانے کا سوال کیوں پیدا ہوگا؟''

بختیار نے اس طرح جیسے کوئی استاد شاگرد کو سمجھاتا ہے آشا سے کہا:

''دونوں چیزوں کی ضرورت ہے ذرا سوچئے تو سہی۔''

آشا نے جواب دیا: ''میرے سوچنے کی قوت کے بارے میں زیادہ حسن ظن سے کام نہ لیجئے۔ انکسار نہیں، واقعی عرض کرتی ہوں کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

نرملا نے پھر طلسمِ سکوت توڑا، اور کہنے لگی:

''واقعی آپ تو عجیب بات کر رہے ہیں۔''

''ڈر ہے کہ اگر مہاراج کو معلوم ہوا کہ تم نے ایک مسلمان کی، ایک دشمن کی حفاظت میں سفر جاری رکھا تو وہ سب کو بے تامل کولھو میں پلوا دیں گے، یہ اُن کی توہین ہے۔''

آشا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''اچھا آگے......''

بختیار نے بتایا:

''جب وہ اچھی طرح ڈر جائیں تو لالچ دیجئے کہ اگر تم نے مہاراج کو یہ بتایا کہ ڈاکوؤں کو شکست دینے والے اور راجکماری کو بچانے والے تم ہی ہو، تو وہ تم سب کو نہال کر دیں گے، مالا مال کر دیں گے، سونے اور چاندی سے تمہاری جھولیاں بھر دیں گے اور یقیناً وہ ایسا ہی کریں گے۔ اس لالچ میں آ کر وہ اپنی زبان میں تالا لگائیں گے۔

پھر وہ نرملا سے مخاطب ہوا:

''امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی چلتے چلتے ایک بات عرض کر دوں کہ آپ کے اخلاق، شرافت، خوش طبعی کا جو نقش میرے دل پر قائم ہوا ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گا، خدا حافظ!''

بختیار چلا گیا، اور نرملا اور آشا یہ سوچے بغیر نہ رہ سکیں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نیکی کرتے ہیں مگر اس کا کوئی صلہ نہیں لیتے، جو نازک موقع پر دستگیری کرتے ہیں مگر انعام کے طالب نہیں ہوتے، جو غیر بلکہ دشمن خاندان کے لوگوں کی جان بچاتے ہیں مگر یہ سوچتے بھی

نہیں کہ انہوں نے کوئی بڑا کام کیا ہے۔ سچ ہے دُنیا ایسے لوگوں پر قائم ہے، یہ نہ ہوتے تو اس دنیا کو قائم رہنے کا، باقی رہنے کا حق نہ تھا۔

بختیار چلا گیا، نہ جانے کس طرف نکل گیا، لیکن دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو گرد اُڑ رہی تھی، نرملا اس میں بختیار کا چہرہ صاف طور پر دیکھ رہی تھی، دل آویز، دل فریب......!''

اتمامِ حُجّت

(1)

دُشمن اور اتنا شریف

خدا حافظ کہہ کر بختیار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چشم زون میں اپنے ساتھیوں تک پہنچ گیا، پھر اس نے نرملا اور آشا کے آدمیوں سے کہا۔

''دوستو! یہاں سے ہمارا راستہ جُدا ہوتا ہے۔ تم سیدھے بڑھتے چلے جاؤ، ہمیں دوسرے راستے سے اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔ یہ چند دن تمہارے ساتھ بڑی اچھی طرح گزرے اور ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ہم نے تمہیں آرام پہنچانے کی ہر کوشش کی، لیکن اگر نادانستہ کوئی تکلیف پہنچ گئی ہو تو معاف کرنا!''

نرملا کے آدمی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے، بختیار کی اچانک جدائی سے انہوں نے بڑی تکلیف محسوس کی، ایک آدمی نے کہا:

''ہمیں تو معلوم ہوا تھا کہ آپ اجمیر چل رہے ہیں۔''

بختیار نے جواب دیا:

''تمہیں ٹھیک معلوم ہوا تھا، مجھے اجمیر ضرور جانا ہے لیکن تمہارے ساتھ نہیں، تمہارا راستہ اور ہے میرا راستہ اور؟''

یہ عجیب وغریب بلکہ پراسرار اور پیچیدہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن انہیں اصرار کرنے کا بھی کیا حق تھا۔ چپ ہو رہے۔ بختیار نے کہا:

''دوستو! جس بہادری سے تم نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا ہے وہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جو تمہاری ہی ہمت وجرأت تھی کہ ان کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میں مسافر ہوں میرے پاس کیا ہے جو نذر کروں۔ پھر بھی یہ ایک ہزار روپیہ نذر کرتا ہوں۔ اسے قبول

کرو، ورنہ اصل انعام تو تمہیں مہاراجہ دیں گے۔''

اپنی یہ تعریف اور ہجو ملیح سن کر یہ لوگ اور زیادہ پریشان ہوئے، گیان سنگھ نے کہا:

''شرمندہ نہ کیجئے جو کچھ کیا ہے آپ نے کیا ہے۔ اپنا کارنامہ ہمارے کھاتہ میں نہ لکھیئے یہ آپ کی شرافت ہے کہ اپنا کیا دھرا ہمیں عطا کیے جا رہے ہیں، لیکن ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہیں کہ جھوٹ موٹ کا تمغہ لگائیں۔''

ایک اور بھگوان داس نے کہا: ''ہم آپ کو روک نہیں سکتے، آپ جاتے ہیں تو جایئے لیکن ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ زندگی میں ہم نے آپ سے بڑھ کر بہادر، شریف اور نیک انسان آج تک نہیں دیکھا۔ نہ جانے اب کبھی آپ سے ملاقات ہوگی یا نہیں، لیکن آپکی یاد ہمارے دل میں ہمیشہ بسی رہے گی۔ یہ ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو ہمیشہ ہمارے پاس رہے گا۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ٹپکنے لگے۔ بختیار نے اسے گلے لگایا۔ اس نے کہا: ''تم میرے بھائی ہو۔ بھائی ہمیشہ بھائی کے کام آتا ہے، جب بھی میری ضرورت محسوس کرو گے مجھے حاضر پاؤ گے۔''

بختیار کی ان باتوں سے نہ صرف بھگوان داس بہت زیادہ متاثر ہوا، بلکہ اس کے دوسرے ساتھی بھی بہت زیادہ متاثر نظر آرہے تھے۔

اس گفتگو کے بعد بختیار اپنے ساتھیوں سمیت ایک دوسری سمت چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک یہ لوگ ہکا بکا کھڑے اس راستے کو تکتے رہے جدھر وہ گیا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گیان سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

''دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔''

بھگوان داس نے تائید کی۔

''ہاں نیکی کر اور دریا میں ڈال، سنا تو ہزاروں دفعہ تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کوئی اور ہوتا تو سیدھا مہاراج کے حضور میں پہنچتا۔ اور اپنی جھولی سونے چاندی سے بھر لیتا۔ مگر اس شخص کو دیکھو، خود پیچھے ہٹ گیا، ہمیں آگے بڑھا دیا۔ گویا یہ کچھ نہ تھا ہم ہی سب کچھ ہیں۔''

گیان سنگھ نے کہا:

''اگر مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں تو بڑے اچھے ہوتے ہیں۔''

بھگوان داس نے آسمان کی طرف دیکھا اور گویا ہوا!

''ہاں گیان سنگھ مسلمان ایسے نہ ہوتے تو وہ نہ ہوتے جو ہیں۔''

(2)

ٹیڑھا سوال

بختیار کے چلے جانے کے بعد آشا نے جیسے خود اپنے سے کہا:

''یہ کیا ہو گیا، کچھ سمجھ نہیں آتا۔''

پھر خود ہی جواب دیا:

''اگر مسلمان اسی طرح کے ہوتے ہیں تو کون ان سے نفرت کر سکتا ہے؟''

پھر اس نے نظر اٹھا کر نرملا کی طرف دیکھا تو وہ خاموش، افسردہ، یاس وحسرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تیر رہے تھے۔ آشا نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''نرملا تم نے بھی کس شخص سے محبت کی...... جو کسی طرح تمہارا نہیں ہو سکتا۔''

نرملا نے ایک افسردہ تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

''ہاں...... وہ میرا نہیں ہو سکتا، لیکن میں تو اس کی ہو گئی۔ آشا تم نے ابھی کہا تھا اگر مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو کون ان سے نفرت کر سکتا ہے۔ پھر مجھے نفرت کی تلقین کیوں کر رہی ہو، کیا میں ایسے شخص سے نفرت کر سکتی ہوں، کیا ایسے شخص سے مجھے نفرت کرنی چاہیے؟ کیا دُنیا میں کوئی اور بھی ایسا ہے جو اس سے زیادہ محبت کیے جانے کا مستحق ہے؟''

آشا رحم اور حسرت بھری نظروں سے نرملا کو تک رہی تھی اور وہ کہہ رہی تھی:

''آشا! محبت واقعی اندھی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ دل میں دبے پاؤں آ کر جو بیٹھ گیا ہے وہ کون ہے؟ دل کے دروازے جب کھل جاتے ہیں تو بند نہیں ہوتے میں نے بختیار سے محبت کی اور زندگی کی آخری سانس تک کرتی رہوں گی۔''

آشا نے گردن کو تائید میں جنبش دیتے ہوئے کہا:

''ہاں نرملا تم سچ کہتی ہو، یہ میری بھول تھی جو میں نے تمہیں اس راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، واقعی یہ آدمی اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کی جائے۔ دُنیا میں ایسے اُونچے آدمی بھی ہو سکتے ہیں، یہ مجھے آج معلوم ہوا...... کس آسانی سے خود اپنے کیے کرائے پر پانی پھیر کر چلا گیا۔''

نرملا خاموش تھی......دفعتہً آشا کو جیسے کچھ یاد آ گیا، اس نے کہا:

''لیکن نرملا یہ بختیار ہمیں بڑی مصیبت میں ڈال گیا ہے، بھلا کس طرح ممکن ہے کہ اپنے آدمیوں کو ڈرا دھمکا کر اور کچھ لالچ دے کر اپنی بڑی بات چھپانے پر ہم آمادہ کریں۔ ضرور اس جھوٹ کا پردہ جلد یا بہ دیر چاک ہوگا۔ پھر مہاراج کے غصے کی کوئی حد ہوگی؟''

بے بسی کے ساتھ آشا بولی:

''تو پھر بتاؤ کیا کریں؟''

نرملا نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔

''کچھ نہیں......اگر جھوٹ بولنا پڑا ہے تو ہم ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے اور یہ بات ایک بچہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ نہ بولنا چاہیے۔''

نرملا کی باتیں آشا کے دل کو لگ رہی تھیں، لیکن اندیشہ ہائے دور دراز نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ اُس نے کہا۔

''لیکن سچ بولنے سے بھی تو کام بنتا نظر نہیں آتا۔''

نرملا نے تیوری چڑھا کر سوال کیا:

''یہ کیوں؟''

''مہاراج اگر خفا ہوئے تو؟''

''کس بات پر خفا ہوں گے؟......کیا اِس پر کہ ہم نے اپنے بہادر محافظوں کو کیوں بھاگنے دیا، کیا اس پر کہ جس آدمی نے ہمیں رہزنوں کے پنجے سے بچایا، اُسے ہم نے قتل کیوں نہیں کر دیا، کیا اس پر کہ اس حفاظت میں یہاں تک آنے کے بجائے ہم پھر رہزنوں کے پاس کیوں نہیں پہنچ گئے۔ اور ان سے کیوں نہیں عرض کیا کہ بھائیو، اور دوستوں گو تم نے ہمیں لوٹا، ہمارے آدمیوں کو ہلاک اور زخمی کیا، لیکن تم اتنے اچھے آدمی ہو کہ ہم تمہاری پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ لو ہمارے یہ زیور حاضر ہیں، ہم خود بھی حاضر ہیں، چاہے ہمیں باندی بنا کر فروخت کر ڈالو، چاہے ہمیں لونڈی بنا کر گھر میں رکھ لو۔''

یہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے نرملا رکی، پھر اُس نے آشا سے کہا۔

''کیوں آشا کیا مہاراج یہ چاہتے ہیں؟''

وہ دل گرفتہ لہجے میں گویا ہوئی:

''توبہ کرو......وہ بھلا ایسا چاہ سکتے ہیں؟''

نرملا نے پوچھا:

''پھر ہمارے سچ کہنے پر خفا کیوں ہوں گے۔''

''کچھ سوچتے ہوئے، ہونا تو نہیں چاہیے۔''

''ہرگز نہیں ہوں گے، اور اگر ہوں تو ہوا کریں۔''

''لیکن ایک سوال اور بھی تو ہے۔''

''وہ کیا...... کس سوال کا تذکرہ کر رہی ہو تم؟''

''بختیار کو اپنے اوپر اختیار ہے، چاہے وہ جھوٹ بولے یا سچ، لیکن ہم اس کے کہنے سے کیوں جھوٹ بولنے پر اُتر آئیں؟''

''تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ......''

''ہاں میرا مطلب یہ ہے کہ مہاراجہ سے صاف اور واضح الفاظ میں پورا ماجرا بیان کر دینا چاہیے، چاہے وہ خوش ہوں یا خفا؟''

''سوچ لو بھئی...... میں تو ہر طرح تیار ہوں۔''

''اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں بڑے مہاراج کو پوری کہانی سنانی چاہئے۔''

''تم ہی سنانا پھر۔''

''واہ...... پھر تم کس عرض کی دوا ہو؟''

''نا بابا، یہ میرے بس کا روگ نہیں، نہ جانے کیا، الٹی سیدھی پڑے تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں، مہاراج کے مزاج کا کچھ ٹھیک پتہ تو ہے نہیں۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ!''

''اچھا خیر ابھی اس موضوع پر بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے، راج بھون میں پہنچنے کے بعد عرض حال اور بیان واقعہ کی خود بخود کوئی صورت نکل آئے گی!''

''میں صرف ایک بات سے ڈرتی ہوں۔''

''کس بات سے آشا؟''

''بختیار سچ ہی تو کہتا تھا بڑے مہاراج ہیں بڑے نازک طبع۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوا کہ بختیار نے ہم لوگوں کی جان بچائی ہے اور پھر وہ سلطان کا ایلچی بن کر ان کے سامنے پہنچا تو وہ ضرور

خیال کریں گے کہ یہ احسان رکھ کر مجھ سے اپنی باتیں منوانے آیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے قتل کا حکم صادر کر دیں۔''

نرملا ہنسنے لگی، اسے ہنستا دیکھ کر آشا چڑ گئی۔

''اس میں کھلکھلا کر ہنس پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

نرملا نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''کیوں نہیں تھی! بختیار کو تم نے سمجھا کیا ہے! وہ ایک بہت بڑے بادشاہ کا ایلچی ہے، اُسے قتل کر دینا کیا ہنسی کھیل ہے؟ اور پھر وہ اتنا دبو بھی نہیں کہ اتنی آسانی سے قتل ہو جائے گا، اس کی بہادری کے گن تو چھوٹے مہاراج تک گاتے ہیں...... نہیں آشا ایسا نہیں ہوگا، اطمینان رکھو، بے فکر رہو!''

(3)

کھانڈے راؤ اجمیر میں!

نرملا اور آشا خیر و عافیت کے ساتھ راج بھون میں پہنچ گئیں۔ سارے محل میں ان شہزادیوں کے آنے اور ڈاکوؤں کے پنجہ سے بچ نکلنے کی دھوم مچ گئی۔ صدقے اُترنے لگے، بلائیں لی جانے لگیں، خیرات ہونے لگی۔ زر و جواہران دونوں پر سے نچھاور کر کر کے غریبوں میں تقسیم کئے جانے لگے۔ پشکر کے تالاب پر سنیاسیوں، بردگیوں، مہنتوں اور سادھوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت کو بھوجن کرایا گیا، اور ان کی طرح طرح تواضع کی گئی۔

نرملا اور آشا جب راج بھون میں پہنچیں تو رائے پتھورا موجود نہیں تھا۔ وہ شکار کو گیا ہوا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں یہاں خوب جلسے اور چہچہے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ایک جشن کی سی کیفیت طاری ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نرملا اپنے سبھاؤ۔ رکھ رکھاؤ، شرافتِ نفس، غریبوں اور محتاجوں کی دستگیری، مظلوموں اور آشفتہ حالوں کی دادرسی کی بنا پر اجمیر کے ہر حلقہ ہر طبقے میں خاص عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ وہ اگر راجکماری نہ ہوتی تو بھی اس کی یہ خوبیاں عوام کا دل موہ لینے کے لیے کافی تھیں۔ غرور و تکبر کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ سب سے اچھی طرح ملتی، سب سے حسن سلوک کا برتاؤ کرتی۔ اس کی باندیوں اور خواصیں اس پر ہزار جان فریفتہ تھیں۔ اس کے غلام اور نوکر اس کے پسینے پر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے، ریاست کے وزراء، امراء اور احکام اس کے اشارۂ چشم کو فرمان کی حیثیت دیتے تھے۔ راج بھون کے چھوٹے بڑے سب اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ حد یہ ہے کہ رائے پتھورا تک انہی خوبیوں کے باعث اسے نور چشم اور لختِ جگر بنا چکا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ بھگوان نے عزت، آبرو اور جان و مال کے ایک بہت بڑے خطرے سے اسے بچالیا۔ سب کے دل جوشِ مسرت سے بے قابو ہو گئے اور پتھورا کا انتظار کئے بغیر جشن مسرت بنانے میں پورے ولولے اور امنگ کے ساتھ حصہ لینے لگے۔

بختیار نے جس طرح راجکماری کی مدد کی تھی یہ بات بھی ڈھکی، چھپی نہ رہ سکی۔ حلق سے نکلی اور حلق تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کے متعلق، سلطان شہاب الدین غوری کے متعلق اور خود اس

ایلچی بختیار کے متعلق یہاں کے لوگوں کی رائے نہ صرف اچھی نہیں تھی، بلکہ دشمنی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ کھانڈے راؤ اور غوری کی جنگ کا حال سب کو معلوم تھا، اور دل ہی دل میں ہر کوئی سمجھتا تھا کہ ترادڑی کے میدان میں جو جنگ لڑی گئی تھی در حقیقت ایک نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب کوئی نہ تھا کہ اس ایلچی...... بختیار...... کی شرافت کے گن نہ گاتا ہو۔ اس نے عین اس وقت جب راجکماری کے ساتھی قتل ہو رہے تھے یا بھاگ رہے تھے۔ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر شہزادی کا ناموس بچایا۔ اس کی جان بچائی اور یہ کام اتنی بے نفسی اور بے لوثی کے ساتھ کیا کہ شہر کے قریب پہنچ کر شہزادی کے قافلے سے کٹ گیا کہ یہ سہرا اس کے سر نہ باندھا جائے، ایسی حوصلگی، عالی ظرفی اور بے نفسی کی مثال کا ہے کو کبھی دیکھنے میں آئی ہوگی۔

عوام وخواص کے ان تاثرات کا نتیجہ یہ تھا کہ بختیار اجمیر میں جدھر سے نکل جاتا لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کے دیدار کے لیے جمع ہو جاتے۔ عوام کا یہ مجمع دلی جوش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دشمن ملک کی سرزمین پر نہیں اپنے ہی ملک کی گلیوں اور کوچوں میں گھوم رہا ہے۔ چونکہ پرتھوی راج اب تک شکار سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس لیے تقریباً ہر روز بختیار وقت گزاری، سیر وتفریح یا شکار کے ارادہ سے باہر ضرور نکلتا تھا۔ کبھی شہر کے اندر ہی گھوم پھر کر واپس آ جاتا۔ کبھی شہر سے دور باہر چلا جاتا اور شکار کر کے واپس لوٹتا۔ وہ شہر میں یا شہر سے باہر جدھر بھی نکل جاتا ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ سب ہی کے دل اس کی عزت اور احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔

بختیار کی اس ہر دل عزیزی نے حکومت کے بعض عمال وحکام کو وقفِ اضطراب کر دیا تھا۔ وہ ایک دشمن بادشاہ کے ایلچی کی اپنے عوام میں ہر دل عزیزی سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ قابلِ اعتراض اور ناقابلِ برداشت سمجھتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مصیبت کا توڑ کس طرح کریں۔

اتفاق کی بات چند روز بعد کھانڈے راؤ اپنی فوج کے ساتھ نرملا اور آشا کی خیریت معلوم کرنے بہ نفس نفیس اجمیر آ گیا۔ دہلی میں جب بھاگے ہوئے لوگوں نے اس حادثہ کی اطلاع دی تو کھانڈے راؤ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دُنیا اس نظر میں ہوگئی، ایک طرف نوجوان اور خوبصورت بیٹی کا غم، دوسری طرف نرملا کی فکر، گو وہ پرتھوی راج کا بھائی تھا اور پرتھوی راج اس سے حد سے زیادہ محبت کرتا تھا، لیکن یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا، کہ اگر نرملا پر کچھ افتاد پڑ چکی ہے تو پرتھوی

راج کو کیا منہ دکھائے گا...... وہ پرتھوی راج کے مزاج سے بھی واقف تھا، اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں خفا ہو کر وہ خود اس کی جان کے درپے اور خون کا پیاسا نہ ہو جائے۔ یہ سب سوچ کر اُس نے چند منتخب سپاہیوں کی ایک فوج ساتھ لی۔ اور بڑی بڑی منزلیں طے کرتا روانہ ہوا کہ اگر ڈاکو راستے میں مل جائیں تو ان کا قلع قمع کر کے نرملا اور آشا کو ان سے چھین لے، اور اگر نہ ملیں تو خود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں روپوش ہو جائے، لیکن جب اس مقام کی نشان دہی ایک بھاگے ہوئے سپاہی نے کی، جہاں ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا تو کھانڈے راؤ نے اپنے سواروں کو بھیج کر تحقیق احوال کی کہ آخر میں کیا واقعہ گزرا۔ ان لوگوں نے آس پاس کے علاقوں میں گھوم کر معلومات حاصل کیں۔ اور کھانڈے راؤ کو آ کر بتایا کہ عین اس وقت جب ڈاکوؤں نے راجکماری کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا مسلمان سواروں کا ایک دستہ ادھر سے گزرا۔ اس نے ڈاکوؤں کو قتل کیا اور مار بھگایا، اور چونکہ یہ لوگ خود بھی رائے پتھورا کے پاس اجمیر جا رہے تھے، لہٰذا راجکماریوں کو بھی پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنی معیت میں لے گئے۔

یہ سن کر کھانڈے راؤ کو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن یہ دبدبہ بھی پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا بھروسہ کیا۔ نہ جانے کون سے مسلمان تھے اور ادھر سے کیوں گزر رہے تھے۔ اور اجمیر کس لیے جانا چاہتے تھے۔ کہیں یہ سب فریب تو نہ تھا۔ اور وہ دھوکہ دے کر راجکماریوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ پھر ان بیچاریوں کی قسمت میں سوا باندی لے کر بسر کرنے کے کیا ہوگا؟ پھر یہ خیال آیا کہ یہ لوگ اتنی بڑی جرأت نہیں کر سکتے کہ ہماری راجکماریوں کو اغوا کر کے لے جائیں۔ ڈاکوؤں کی بات اور تھی، وہ بہر حال اس دیس کے رہنے والے اور یہاں کے چپے چپے سے واقف تھے، وہ تو اغوا کر کے جہاں چاہتے لیجا سکتے تھے لیکن یہ اجنبی ایک غیر دیس میں کہاں چھپتے پھریں گے۔ لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ انعام کے لالچ میں یہ لوگ اجمیر ہی گئے ہوں گے اور کوئی شبہ نہیں یہ لوگ منہ مانگے انعام کے متمنی بھی ہیں۔ اگر یہ اجمیر پہنچ گئے ہیں تو پھر پرتھوی راج بھی انہیں نوازے گا۔ اور میں بھی انہیں مالا مال کر دوں گا۔

یہی سب سوچتا ہوا کھانڈے راؤ اجمیر میں داخل ہوا، اس کے ساتھ اندر کمار اور شاہو جی بھی تھے۔

کھانڈے راؤ نرملا اور آشا کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ یہ رونا خوشی کا تھا۔ اب تک اس کے دل میں کیسے کیسے لرزہ خیز اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اب ان شہزادیوں کو ہر طرح سے محفوظ اور

سلامت پا کر وہ جوشِ مسرت کو ضبط نہ کر سکا۔ جو ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔

آشا نے جب ساری کہانی کہہ ڈالی تو کھانڈے راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے اور دور اُفق میں گھورتے ہوئے تشویش اور پریشانی کے لہجے میں کہا۔

''تو تم لوگوں کی جان اس ایلچی نے بچائی ہے جو اس سے پہلے یہاں آ چکا ہے۔اور جو تراوڑی کے میدان میں اپنے بادشاہ کو میدانِ جنگ سے بچا کر لے گیا تھا۔''

قبل اس کے کہ آشا کچھ جواب دے کھانڈے راؤ نے کہا:

آدمی واقعی غضب کا جیالا ہے،اس سے سب کچھ ممکن ہے۔

اس کے بعد خود ہی بڑبڑایا۔

'' کتنے شرم کی بات ہے کہ جن لوگوں نے ہمارا نمک کھایا تھا، ہمارے ملازم تھے جن کی وفاداری اور جاں نثاری کا ڈنکا بجتا رہتا تھا وہ تمہیں یکتا و تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔اور ایک ایسا شخص جو دشمن ملک کا رہنے والا، دشمن بادشاہ کا ایلچی اور خود بھی بہت بڑا دشمن ہے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر سینہ سپر ہو کر تمہیں بچا لایا...... کس طرح ہمارے دلوں میں اس کی عزت پیدا نہ ہو؟...... کس طرح ہم اس کے شکر گزار نہ ہوں......؟''

کھانڈے راؤ کے ان تاثرات سے آشا کو خوشی ہوئی اور نرملا تو پھول کی طرح کھل گئی۔

ان لڑکیوں سے مل کر کھانڈے راؤ محل کے مردانہ حصے میں آیا۔اور درباریوں نیز حکام وعمال سے گفتگو کے دوران میں بھی بختیار کے ذکر پر اس نے انہی خیالات و تاثرات کا اظہار کیا جن کا ابھی راج بھون میں اس نے نرملا اور آشا کے سامنے اظہار کیا تھا۔

(4)

احسان فراموشی

اسی گفتگو کے دوران میں پرتھوی راج کے ایک منہ چڑھے مصاحب اور کھانڈے راؤ کے بے تکلف دوست دھیان چند نے جو اجمیر کا ایک بہت بڑا جاگیر دار تھا، کہا:

''یہ تو ٹھیک ہے، اس مسلمان نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے شکرگزار ہونے پر مجبور، لیکن......''

کھانڈے راؤ نے حیرت سے دھیان چند کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''لیکن کیا...... کسی خاص بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہو؟''

دھیان چند نے جواب میں عرض کیا:

''جی ہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اتنا بڑا احسان کر کے اس شخص نے ہمیں نقصان بھی اتنا بڑا پہنچایا ہے کہ جس کی ہرگز تلافی نہیں ہو سکتی، کسی طرح نہیں ہو سکتی!''

کھانڈے راؤ کے چہرے پر حیرت اور استعجاب کے آثار طاری ہوئے اس نے کہا:

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو دھیان چند؟''

دھیان چند نے عرض کیا:

''مہاراج میں غلط نہیں کہتا...... ذرا سوچئے تو سہی اس بات کا ردِعمل کیا ہوا ہے؟''

کھانڈے راؤ نے پوچھا:

''کس ردِعمل کی طرف اشارہ کر رہے ہو تم؟''

دھیان چند نے بتایا:

''جب سے یہ شخص آیا ہے اجمیر کے لوگ بُت کی طرح اسے پوج رہے ہیں۔ جدھر سے نکل جاتا ہے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کے دیدار کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ شہر اور دیہات ہر جگہ اس کی شہرت، ہر دل عزیزی اور شرافت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دشمن ملک اور دشمن بادشاہ کے اس نمائندے کو ہماری راج دھانی میں وہ عزت، وہ وقعت وہ عظمت حاصل ہو گئی ہے جو

اس وقت کم از کم کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

کھانڈے راؤ نے تشویش آمیز نظروں سے دھیان چند کو دیکھا اور پہلو بدل کر اس طرف یوں گھورنے لگا جیسے کہہ رہا ہے، جو کچھ کہنا چاہتے ہو سب کچھ کہہ ڈالو۔

''دشمن کی یہ دل عزیزی خود ہمارے ملک میں، ہماری راجدھانی میں کیا خطرناک نہیں ہے؟''

کھانڈے راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''ضرور ہے......لیکن کیوں یہ تو بتاؤ!''

دھیان چند نے بتایا!

''پہلے اس شہر کے لوگ اس شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اسے دشمن سمجھتے تھے، اس کے خون کے پیاسے تھے اور اب اُسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسے خاندانِ شاہی کا......اور اپنا محسن سمجھتے ہیں اور شاید اگر وقت پڑے تو اس کے پسینے کی جگہ خون بہانے کو بھی تیار ہو جائیں گے۔عوام کی نفسیات ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔''

کھانڈے راؤ نے مضطرب ہو کر کہا۔

''ہم سمجھ رہے ہیں تمہارا مقصد کیا ہے......واقعی تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے......لیکن......''

دھیان چند نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ کہ کل کو اگر لڑائی ہو، غوری اور رائے پتھورا میں ٹھن جائے اور معاف کیجئے گا......لڑائی شروع ہونے کے بعد بعض دفعہ غیر متوقع حالات پیش آجاتے ہیں۔ فرض کیجئے کسی وجہ سے ہمیں پسپا ہونا پڑے اور دشمن فوجیں ہمارے اس محسنِ اعظم کی سربراہی میں اجمیر کی سرزمین پر قدم رکھیں تو کیا ہوگا؟''

کھانڈے راؤ نے بے کل ہو کر پوچھا:

''پھر کیا ہوگا......بتاؤ؟''

دھیان چند نے کہا:

''یہ بختیار کو ہیرو سمجھنے والے لوگ جو اَب تک اس کی شرافت کے گُن گا رہے ہیں اس کی بہادری کے گیت بھی گانے لگیں گے۔ کیا آپ ان سے توقع کر سکتے ہیں کہ یہ اپنے اندر وہ جذبہ

پیدا کر سکیں گے جو دشمن فوج کو نکال کر باہر کر دینے کے لیے عوام کے قلوب میں موجزن ہوتا ہے۔ کم از کم مجھے تو یہ امید نہیں ہے۔''

کھانڈے راؤ نے سوال کیا۔

''پھر کیا کرنا چاہیے؟''

دھیان چند نے بے پروائی کے ساتھ کہا:

''قتل......''

کھانڈے راؤ اچھل پڑا:

''قتل......کیا کہتے ہو دھیان چند؟''

دھیان چند نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا:

''میری رائے تو یہی ہے۔''

کھانڈے راؤ نے پس و پیش کرتے ہوئے کہا:

''لیکن بڑی خطرناک رائے ہے۔''

دھیان چند نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا:

''لیکن اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو رسوائی، ذلت، بدنامی اور بے حوصلگی کے سوا ہمیں کچھ نہ ملے گا۔''

اور عرض کروں۔

کھانڈے راؤ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا:

''جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے دھڑک کہہ ڈالو۔''

''یہ شخص یہاں سے جا کر اپنے بادشاہ کو بھی اپنا کارنامہ سنائے گا ضرور سنائے گا پھر اس بادشاہ کی نظر میں ہماری کیا وقعت رہ جائے گی، جس کے ایک معمولی سے ملازم نے ہماری راجکماری کی جان بچائی۔ کیا وہ ہمیں کم مایہ نہیں سمجھے گا؟''

کھانڈے راؤ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''ٹھیک کہتے ہو دھیان چند!''

دھیان چند نے پھر سلسلۂ کلام شروع کر دیا اور بولا۔

''اس شخص نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا، اجمیر کے لوگوں میں بھی ہمیں ذلیل کیا اور اپنے

دیس جا کر بھی ہمارے منہ کا کالک سب کو دکھائے گا۔''

کھانڈے راؤ کا رنگ رُخ دفعتہً بدل گیا۔ غصہ، برہمی اور اشتعال کے آثار طاری ہو گئے، اس نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔

''جی چاہتا ہے واقعی اس موذی کو قتل کر دوں؟''

اندر کمار اور شاہو جی اب تک خاموش بیٹھے ہوئے تھے، اب اُن دونوں نے بھی بیک آواز کہا:

''مہاراج یہ شخص کسی رعایت کا سزاوار نہیں ہے اسے ضرور قتل کر دینا چاہیے۔''

دھیان چند نے تائید مزید کی:

''صرف اسی طرح ہم رسوائی سے بچ سکتے ہیں......کم از کم اس سے ایک یہ فائدہ تو ہوگا کہ دیس سے باہر یہ خبر نہیں پھیل سکے گی۔''

کھانڈے راؤ نے سر ہلا کر تائید کی اور کہا:

''تمہارا خیال بالکل درست ہے......یہی ہونا چاہیے۔''

دھیان چند نے اس حوصلہ افزائی سے شہ پا کر کہا:

''ایک بات اور بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں۔''

کھانڈے راؤ نے اپنائیت کے لہجے میں کہا:

''دھیان چند بار بار پوچھتے کیوں ہو؟ کہتے کیوں نہیں جو کچھ کہنا ہے۔''

دھیان چند نے جواب دیا:

''مہاراج میں نے سنا ہے کہ غوری جب آپ کے ہاتھوں شکست کھا کر غزنی واپس گیا تو اس نے ان سپاہیوں کی بُری گت بنائی۔ جو میدانِ جنگ سے بھاگے تھے۔

کھانڈے راؤ ہنسنے لگا۔

''یعنی اپنی شکست کا غصہ ان بیچاروں پر اتارا!''

دھیان چند نے تصحیح کی۔

''نہیں مہاراج غوری نے شکست نہیں کھائی تھی، جو ہمارے اتنے بڑے لشکر کو چیرتا ہوا آپ کے ہاتھی تک پہنچ جائے۔ اور اس کے سونڈ پر پاؤں رکھ کر آپ کے ہوودج سے ٹکراتا ہوا آپ پر بھرپور وار کر گزرے۔ وہ شکست کھا جائے تب بھی اُسے شکست یافتہ نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو آپ

جیسا جی دار اور بہادر تھا جس نے اپنے حواس قائم رکھے اور زخمی ہو کر بھی ایسا وار کیا کہ اگر یہی ایلچی اسے بھگا کر نہ لیجاتا تو آج وہ زخمی نرگ (جہنم) کی سیر کر رہا ہوتا۔''

کھانڈے راؤ نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

''ٹھیک کہتے ہو دھیان چند، لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ غوری نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

دھیان چند نے بتایا:

''مہاراج اس نے ان تمام لوگوں کے منہ پر توبڑے کسوا دیے اور اُن میں دانہ گھاس ڈال کر انہیں حکم دیا، کھاؤ، اور پھر سارے شہر میں ان کی تشہیر کرائی، خلقت نے ان کے منہ پر تھوکا، اور ذلیل کیا۔ اس کے بعد یہ لوگ برخواست کر دیے گئے!''

کھانڈے راؤ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''بڑی دلچسپ خبر سنائی تم نے؟''

دھیان چند بولا۔

''اس کاروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھگوڑے سپاہیوں کو، ان کی یہ حالت دیکھ کر دوسروں کو سبق مل گیا کہ میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں کا حشر کیا ہوتا ہے۔''

کھانڈے راؤ نے تائید کرتے ہوئے کہا:

''ہمیں تمہارے خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔''

دھیان چند نے دیکھا لوہا گرم ہے چوٹ لگا دینی چاہیے، چنانچہ اُس نے کہا:

''پھر مہاراج آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

کھانڈے راؤ نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''کس کے ساتھ؟''

دھیان چند نے بتایا:

''اُن سب کے ساتھ جو راجکماری کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔''

''کھانڈے راؤ کے دل میں یہ بات جم گئی۔''

''ایسا ہوگا، ضرور ایسا ہوگا۔''

اندر کمار نے پوچھا:

''مگر اس ایلچی کا حشر کیا ہوگا! یہ بھی تو ارشاد ہو!''

شاہو جی نے اندر کمار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''مہاراج اپنے بھگوڑے سپاہیوں کی سرکوبی تو ہم ہر وقت کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ ایلچی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ہاتھ نہ آئے گا۔''

دھیان چند کو پھر اپنی بات پر زور دینے کا موقع مل گیا:

''موقع سے فائدہ نہ اُٹھانا بہت بڑی غلطی ہے مہاراج؟''

کھانڈے راؤ نے پرخیال انداز میں کہا:

''یہ تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بختیار اب یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جائے گا، لیکن اس فیصلے کو عمل میں لانے سے پہلے کئی امور ہیں جن پر غور کرنے کے بعد ہی قدم اُٹھانا چاہیے۔''

دھیان چند نے اس خیال سے اتفاق کا اظہار کیا:

''بجا ارشاد ہوا ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہیے یہ کیوں آیا ہے اور کیا پیام لے کر آیا ہے؟''

کھانڈے راؤ نے دھیان چند کی ذہانت سے خوش ہو کر کہا:

''ہاں ہمارا مطلب یہی تھا...... دوسرے یہ کہ اس شخص کو یہاں نہیں قتل کرنا چاہیے؟''

دھیان چند ہنسنے لگا:

''تو کیا غزنی جا کر اسے ہلاک کرنا چاہیے مہاراج؟''

کھانڈے راؤ کو بھی ہنسی آ گئی۔

''نہیں بھائی، جب یہ اپنا کارِ سفارت انجام دے لے تو اسے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ ہم رخصت کریں گے۔ اجمیر سے چند میل کے فاصلے پر ایک جنگل پڑتا ہے، وہاں رہزنوں کا ایک بڑا گروہ خلجی کے مختصر سے دستہ پر دفعتہً ٹوٹ پڑے گا اور اس کا قیمہ قیمہ کر دے گا۔ پھر ہم بڑے جاہ وجلال کے ساتھ اس شریف ایلچی کی زخموں سے بھری ہوئی لاش غوری کی خدمت میں اپنے اظہار افسوس اور دلی اظہارِ رنج والم کے ساتھ واپس کر دیں گے، جس پر وہ ہمارا شکر گزار ہوگا۔ پھر یہی نہیں بلکہ کچھ مجرموں کو جن کے لیے قتل کا حکم بڑے مہاراج صادر کر چکے ہیں ہم قتل کر کے ان کی کٹی ہوئی گردنیں بھی غوری کو بھیج دیں گے کہ رہزنوں کے یہ لوگ پکڑے گئے۔ جنہیں فوراً کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا۔ اور خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ان کی کٹی ہوئی گردنیں بھی ارسال

خدمت کی جا رہی ہیں۔

''اس بات پر غوری ہمارا اور بھی زیادہ ممنون ہوگا۔''

دھیان چند اچھل پڑا اس نے ترنگ میں آ کر کہا:

''زندہ باد!...... چھوٹے مہاراج آپ کتنے بڑے بہادر ہیں اتنے ہی بڑے مدبر ہیں۔ کیا بات سوچی ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

کھانڈے راؤ نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا:

''اور یہ رہزن ہمارے سپاہی ہوں گے جو لباس بدل لیں گے اور ان رہزنوں کی سرداری اندر کمار اور شاہو جی کریں گے، کیوں......؟''

اندر کمار شاہو جی کا چہرہ اس اعزاز کی بشارت سن کر سفید پڑ گیا۔ کیونکہ دونوں بختیار کی بہادری سے واقف تھے، لیکن انہوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو جوڑ کر کہا۔

''اس سے بڑھ کر ہماری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ یہ کارنامہ ہم انجام دینے کے لئے ہمیں منتخب کیا جائے۔''

کھانڈے راؤ نے دونوں کو نگاہِ توجہ سے دیکھا اور بولا۔

''تم دونوں سے مجھے اسی جواب کی امید تھی، بس تو اب اشارہ کے منتظر رہو۔''

اندر کمار اور شاہو جی نے بیک آواز کہا:

''ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔''

دھیان چند نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

''میرا خیال ہے بڑے مہاراج بھی اس تجویز کو منظور کر لیں گے؟''

کھانڈے راؤ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''اس کی فکر نہ کرو دھیان چند، کھانڈے راؤ کی بات بڑے مہاراج نے کبھی رد نہیں کی، وہ کبھی رد نہیں کر سکتے۔''

دل و جان سے اس دعوے کی تائید کرتے ہوئے دھیان چند گویا ہوا۔

''کیا میں جانتا نہیں چھوٹے مہاراج؟...... جانتا ہوں!''

پھر ذرا دیر خاموش رہ کر دھیان چند نے کہا۔

''لیکن اندر کمار اور شاہو جی رہزنوں کے جس گروہ کی سرداری کریں گے وہ بڑے

تگڑے جوانوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔''

کھانڈے راؤ نے پورے وثوق کے ساتھ کہا۔

''ہاں ہاں ایسا ہی ہوگا...... وہ لوگ میری نظر میں ہیں۔ بلکہ دل ہی دل میں انہیں منتخب کر چکا ہوں جو اندر کمار اور شاہو جی کے ساتھ جائیں گے۔''

دھیان چند کے زرخیز دماغ نے ایک اور تجویز پیش کر دی:

''چھوٹے مہاراج میری رائے تو یہ ہے کہ فی الحال آپ ایلچی کی نقل وحرکت پر پابندی عائد کر دیں۔''

یہ بات کھانڈے راؤ کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے پوچھا:

''اس کا کیا مطلب؟''

دھیان چند نے کہا:

جب اسے اجمیر کے لوگ گھیرے میں لے کر ممونیت اور تحسین کے جذبہ سے اس کی طرف تکتے ہیں تو میرا خون اُبلنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے تلوار کھینچوں اور ڈھیر کر دوں۔''

کھانڈے راؤ نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا:

''ہم تمہارے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں...... مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

دھیان چند نے کہا۔

''صرف یہ حکم صادر کر دیجئے، جب تک بڑے مہاراج شکار سے واپس آ کر اسے شرف باریابی نہ عطا کریں یہ اپنے گھر میں بند رہے باہر نہ نکلے...... نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

کھانڈے راؤ نے ہنستے ہوئے کہا:

''یہ تو ہوسکتا ہے، مگر پھر وہ بات نہیں ہو سکے گی جس کا ابھی ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔''

دھیان چند نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا:

یہ کیوں چھوٹے مہاراج۔

کھانڈے راؤ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''اب اگر ہم کسی طرح کی پابندی عائد کرتے ہیں یہ احسان فراموشی ہوگی، خود اجمیر کی رعایا بھی اس فیصلے سے بھڑک اُٹھے گی۔ اور اس کے بعد جب رہزن اسے قتل کریں گے تو غوری تو غوری خود ہمارے لوگ ہم پر شبہ کرنے لگیں گے کہ ضرور سازش کے تحت یہ قتل ہوا ہے۔ اور قطعاً اس

میں ہمارا ہاتھ ہے۔ لیکن اگر ہم رخصت کے وقت تک بختیار سے تپاک، گرجوشی اور خلوص کا برتاؤ کریں تو اس کا قتل نامعلوم رہزنوں کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ غوری تک کو ہماری نیکی اور شرافت پر شبہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔''

دھیان چند اس دلیل سے بالکل مطمئن ہو گیا۔

''کیا کہنا ہے ہمارے چھوٹے مہاراج کا، جب سوجھتی ہے دور کی سوجھتی ہے۔ واقعی بڑی عمدہ تدبیر آپ کے ذہن میں آئی ہے۔''

کھانڈے راؤ نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا:

''جب تک بختیار رخصت نہیں ہوتا ہمیں تمہیں، اندر کمار، شاہو جی سب کو اس کے ساتھ بڑی اپنائیت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ ہماری طرف سے بالکل مطمئن رہے چنانچہ ہمارا ارادہ ہے کہ کل ہم خود اس کی قیام گاہ پر جائیں اور دلی جوش و خروش کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس طرح وہ بھی مطمئن ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھی بھی ہماری نیک نیتی اور احسان شناسی کے قائل ہو جائیں گے، اور پھر۔ اور پھر......

یہ کہہ کر کھانڈے راؤ ہنسنے لگا۔ دھیان چند کا قہقہہ کھانڈے راؤ سے بھی اونچا تھا اور جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو نرملا اور آشا دروازہ سے کان لگائے کھڑی تھیں۔

(5)

خواجۂ بزرگ کا آستانہ

پرتھوی راج کو شکار سے واپس آنے میں کئی دن لگ گئے۔

اس عرصے میں ایک طرف کھانڈے اور دھیان چند کی تجویز کو عمل میں لانے کے نقشے بنتے رہے۔ دوسری طرف بختیار بھی اپنا دن سیر سپاٹے میں گزارتا رہا۔ اپنی مختصر سی مدت میں اس نے غیر معمولی محبوبیت اور مرجعت حاصل کر لی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا جنگ اور آویزش جو کچھ ہے وہ رائے پتھورا سے ہے۔ ورنہ بیچارے عوام سے پرخاش اور عداوت کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا وہ بھی بڑی خوش اخلاقی اور گرم جوشی سے ان کے تپاک اور تحسین و آفرین کا جواب دیتا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اجمیر میں ہو اور آستانہ خواجہ پر حاضری نہ دے۔ فجر اور مغرب کی نماز لازمی طور پر وہ خواجہ صاحب کی درگاہ پر پڑھتا تھا۔ اور نماز کے بعد کچھ دیر تک حاضر بھی رہتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب بھی اس کے ساتھ شفقت اور عنایت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس سے شہاب الدین غوری، مسلمانانِ غزنی اور ملت اسلامیہ کے حال و مستقبل پر گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اس گفتگو سے وہ عجیب طرح کی طمانیت فرحت اور سکون قلب محسوس کرتا تھا۔ اس آستانہ پر پہنچتے ہی وہ اپنی ساری کلفتیں اور درماندگیاں بھول جاتا تھا۔ ایک نیا عزم، ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش اپنے اندر محسوس کرنے لگتا تھا۔

ایک روز حضرت خواجہ صاحب نے باتوں باتوں میں دریافت فرمایا:

'تو سلطان شہاب الدین غوری کو اپنی شکست کا بہت غم تھا؟''

بختیار نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''یا حضرت اس غم نے انہیں نڈھال کر دیا ہے۔ دنیا کی ہر لذت، انہوں نے اپنے اوپر حرام کر لی ہے۔ جو لوگ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے سلطان نے انہیں ذلت بخش سزائیں دیں اور فیصلہ کر لیا کہ جب تک شکست کا داغ ان کے اُجلے دامن سے نہیں دھل جاتا چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

حضرت خواجہ صاحب کے نورانی چہرے پر تبسم کے آثار ہویدا ہوئے، انہوں نے فرمایا:

''فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے، فتح پر مغرور نہ ہونا چاہیے شکست سے بددل نہ ہونا چاہیے۔ جو فاتح ہوتے ہیں انہیں بھی ذلت بخش شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو شکست کھاتے ہیں وہ بھی فاتح بن جاتے ہیں۔''

ان سادہ سے الفاظ میں بختیار کو ایک دفتر معانی پنہاں نظر آیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ حضرت خواجہ صاحب نے درحقیقت یہ پیش گوئی فرمائی ہے کہ رائے پتھورا جس نے ترادوری کی جنگ فتح حاصل کی تھی شکست کھائے گا۔ اور سلطان شہاب الدین غوری جو شکست سے دوچار ہوا تھا، عروس کامرانی سے ہمکنار ہوگا اور فتح حاصل کرے گا۔ یہ سوچ کر اُسے ایک بہت بڑا بوجھ اپنے دل سے اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اور یقین ہو گیا کہ اس سفارت کا نتیجہ اعلانِ جنگ کی صورت میں نکلے گا اور آخر کار پرتھوی راج شکست کھائے گا۔ اور سلطان شہاب الدین غوری فتح حاصل کرے گا۔ یہ الفاظ سن کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا، اس نے عرض کیا۔

''یا حضرت! سلطان نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو جان کی بازی لگا کر بھی اسے جیت کر رہیں گے۔''

حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا:

''کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی اپنے مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دیتے!''

بختیار نے الحاح وزاری کے ساتھ عرض کیا۔

''یا حضرت دعا فرمائیے کہ جنگ کی صورت میں فتح ہمارے سلطان کو ہو۔''

حضرت خواجہ صاحب نے شفقت آمیز لہجے میں فرمایا:

''اگر غوری ذاتی سربلندیوں اور مال و دولت حاصل کرنے کے لیے میدان جنگ کا رُخ کرے، تو نہ وہ دعا کا مستحق ہے، نہ دعا اسے فائدہ دے سکتی ہے، لیکن اگر وہ اپنی قوم کے لیے، اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے، مسلمانوں کی سربلندی اور دین اسلام کی سرفرازی کے لیے میدان میں آتا ہے تو فرشتے بھی بارگاہ الٰہی میں، اس کے لیے دست بہ دعا ہوں گے۔''

بختیار کا دل یہ باتیں سن کر پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اُسے سلطان کی کامیابی اور یقین ہو گیا، پھر وہ نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ عرض گزار ہوا۔

''یا حضرت میرے لیے دُعا فرمائیے۔''

حضرت نے پوچھا:

''تم کیا چاہتے ہو؟''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں عرض پیرا ہوا۔

''صرف ایک بات...... میں چاہتا ہوں میرے دل سے موت کی دہشت نکل جائے میرے اندر کٹ مرنے اور راہِ خدا میں جان دینے کا ولولہ پیدا ہو جائے۔''

حضرت خواجہ صاحب نے مشفقانہ لہجے میں دریافت فرمایا:

''کیا تم موت سے ڈرتے ہو! کیا خدا کے راستے میں کٹ مرنے اور جان دے دینے میں تمہیں تامل ہے......! اپنا جائزہ لو، خدا نے یہ نعمت تمہیں پہلے سے دے رکھی ہے۔''

یہ سن کر بختیار نے ایک فخر سا محسوس کیا۔ حضرت نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''تمہیں بہت سا کام کرنا ہے، تمہاری پیشانی روشن ہے۔ اگر تمہارا یہ ایمان اور یہی اخلاص قائم رہا تو دنیا تمہاری عظمت کے سامنے سر جھکائے گی، اور تمہارے حسنِ نیت سے اُمید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔''

یہ الفاظ نہ تھے، مستقبل کی کھلی ہوئی کتاب تھی۔

''بختیار کی حیثیت اب تک معمولی سپاہی سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ بن سکتا ہے، شاید بہت کچھ بن سکتا ہے۔''

(6)

دھیان چند!

بالآخر اپنے خدم وحشم کے ساتھ پرتھوی اجمیر واپس آ گیا۔

پرتھوی راج کے واپس آنے کے بعد بختیار نے باقاعدہ طور پر سلطان شہاب الدین غوری کا پیام لے کر اجمیر حاضر ہونے کی اطلاع دی، لیکن پرتھوی راج نے ایک ہفتہ شرف باریابی نہیں عطا کیا۔

ملاقات میں اس تاخیر سے وہ سخت پریشان ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں اندیشہ ہائے دور دراز پیدا ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رائے پتھورا ملاقات سے کیوں گریز کر رہا ہے۔

آخر ایک روز دھیان چند رائے پتھورا کی طرف سے بختیار کے پاس آیا، بختیار نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ دھیان چند بھی سراپا اخلاق وشرافت بن کر ملا۔ اس نے کہا:

''آپ سے مل کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔''

اس اپنائیت کی گفتگو سے بختیار کافی متاثر ہوا، اس نے کہا۔

''یہ آپ کی نوازش ہے جو ایسا محسوس کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے اخلاق نے میرے دل پر بہت گہرا اثر کیا ہے۔''

دھیان چند نے بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''صاحب اخلاق ہمارے پاس کہاں وہ تو آپ کے پاس ہے۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی جان بچانا یہ اخلاق ہے!''

بختیار نے انکسار آمیز لہجے میں کہا:

''ایسا نہ کہیے، میں نے اپنا فرض ادا کیا، ایک انسان کا فرض ہے انسانیت جو ہر چیز سے بالا ہے۔ اور میرا مذہب تو سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیتا ہے وہ یہی ہے۔''

دھیان چند نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

''آپ بھی بہت اچھے ہیں اور آپ کا مذہب بھی بہت اچھا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو

لوگ پروانے کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر آپ پر کیوں گر رہے ہوتے۔ آپ نے ہمارے شہر میں جو ہر دل عزیزی حاصل کر لی ہے، اتنی عمر ہماری ہونے کو ہے مگر وہ بات ہمیں بھی نہ حاصل ہو سکی آج تک۔"

بختیار نے کہا۔

"یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی قوم بہادر ہے اور بہادری کی قدر کرتی ہے۔"

دھیان چند نے کچھ تامل کے بعد کہا۔

"بے شک یہ بات تو ہے...... کہیے آپ کی طبیعت تو نہیں گھبرائی، کوئی تکلیف تو نہیں ہے آپ کو؟"

اس پرسش کے جواب میں بختیار نے کہا:

"تکلیف تو ذرا بھی نہیں ہے۔ لیکن طبیعت ضرور گھبراتی ہے۔"

دھیان چند چونک پڑا۔

"طبیعت گھبراتی ہے؟...... بات یہ ہے کہ شاید آپ خشک مزاج کے آدمی ہیں۔ معاف کیجیے گا، میں ذرا بے تکلف قسم کا آدمی ہوں اس لیے بغیر کسی تکلف کے دل کی بات زبان پر لے آتا ہوں۔ نہ رقص و نغمہ سے آپ کو دلچسپی ہے نہ شراب و کباب سے پھر جی تو گھبرانا ہی چاہیے۔ ہمیں اگر آپ کی طرح کی خشک زندگی بسر کرنا پڑے تو پاگل ہو جائیں گے۔"

"سر پھاڑ کر جنگل کی راہ لیں۔"

بختیار ہنسنے لگا، اس نے کہا:

"جی ہاں اپنا اپنا ذوق ہے...... لیکن میری طبیعت یوں گھبرا رہی ہے کہ یہاں آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے۔ پہلے تو مہاراج کئی روز تک شکار میں مصروف رہے، اب تشریف لائے ہوئے بھی کئی دن گزر چکے ہیں۔ مگر شرفِ باریابی حاصل کرنے کا موقع اب تک نہیں ملا، حالانکہ مجھے تاکید کی گئی تھی کہ جلد از جلد اپنا فرض انجام دے کر غزنی واپس پہنچوں۔"

دھیان چند نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ کل مہاراج کی خدمت میں آپ پیش ہوں گے۔"

بختیار یہ سن کر خوش ہو گیا، اس نے کہا:

"بہت بہت شکریہ آپ کا بھی اور مہاراج کا بھی۔"

(7)

طنزوتعریض

دوسرے روز بختیار رائے پتھورا کے راج بھون میں پہنچا۔ یہ ایک بہت بڑے بادشاہ کا محل تھا۔اس کی آرائش، زیب و زینت ہر چیز تعریف وصیف سے ماوراتھی۔اس مرتبہ نئی بات بختیار نے یہ دیکھی کہ جب وہ پہنچا تو پرتوی راج کھانڈے راؤ کے ساتھ ایک بلند چبوترے پر کھڑا اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ بہت بڑی فوج تھی، کیل کانٹے سے لیس سازوسامانِ جنگ سے آراستہ، سوار پیادے زرق برق ہتھیار سجائے اپنی بہادری اور تہور کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ایک طرف پیدل سپاہ کا جم غفیر تھا، دوسری طرف خوبصورت اور مضبوط گھوڑوں پر سواروں کا ایک بہت بڑا دستہ نقل وحرکت کرتا نظر آرہا تھا۔ایک اور طرف اونٹوں کی فوج تھی، یہ اونٹ اتنے صبا رفتار تھے کہ حیرت ہوتی تھی ان کے پاؤں ہیں یا بجلی، جو سپاہی اونٹوں پر سوار تھے وہ طرح طرح کے کرتب دکھا رہے تھے۔ پھر ہاتھیوں کا ایک بہت بڑا گلہ نظر آیا، ان کی پیٹھ پر عماریاں کسی ہوئی تھیں اور ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے سپاہی نخوت وغرور کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد پرتھوی راج نے ایک اشارہ کیا۔

فوراً یہ وسیع میدان جہاں رائے پتھورا اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا میدان جنگ کا نمونہ بن گیا۔اور مصنوعی جنگ شروع ہوگئی۔اس جنگ میں تیغ وتفنگ، تیروتبر، خنجر اور نیزے بے محابہ استعمال کیے گئے، پرتھوی راج اپنے سواروں اور سپاہیوں کے جنگی کارنامے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر اشرفیاں پھینکیں۔ پھر اپنے کمانداروں کو بلایا اور انہیں شاباش دی اور کہا:

''وطن کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ اگر تم بہادر ہو تو دشمن کے چھکے چھڑا دو گے اگر بزدل ہو تو ناکامی ونامرادی سے دوچار ہو گے، لیکن نہیں تم پرتھوی راج کے ملازم ہو، پرتھوی راج کو تم پر فخر ہے۔تم بزدل نہیں ہو سکتے۔تم بہادر ہو، کامیابی تمہارے قدم چومے گی، خوش بختی تمہارے ساتھ چلے گی، تم زمین کا سینہ روندتے ہوئے آگے بڑھو گے اور دشمن کو کچل دو گے۔ دُنیا کی کوئی طاقت تمہارے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔تم نے ہمیشہ دشمن کو میدانِ جنگ میں للکارا ہے۔اور اس کے

دانت کھٹے کر دیے ہیں۔ تم اپنی شاندار روایات کو قائم رکھو گئے۔ تمہارے ملک کو تمہاری قوم کو تمہارے بادشاہ کو تم پر ناز ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ناز بیجا نہیں ہے۔ بجا طور پر تم اس کے سزاوار اور مستحق ہو۔''

اس تقریر کے بعد رائے پتھورا نے اپنے افسران فوج کو انعامات تقسیم کیے۔ اور اس کے بعد دربار ہال کی طرف روانہ ہوا۔

یہ نظارہ دیکھ کر بختیار نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ فوجی نمائش صرف اسے مرعوب کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ تاکہ یہاں سے جا کر وہ سلطان شہاب الدین غوری کو بتا سکے کہ پرتھوی راج کے پاس مور و ملخ کا سا لشکر ہے۔ اس کے پاس ہاتھی ہیں، اونٹ ہیں، اس کے ملک میں ہُن برستا ہے، رعایا شاد، دوست بامراد، نہ قحط سالی کا اندیشہ نہ کسی اور طرح کی فکر، اس سے لڑنا قسمت سے لڑنا ہے اور قسمت سے جنگ کر کے آج تک کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔

یہ سوچ کر بختیار دل ہی دل میں ہنسا، اس نے کہا۔

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار اُن سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

اسلحہ اور ساز و سامانِ جنگ کی یہ نمائش ان لوگوں کو کیا مرعوب کر سکتی ہے۔ جو کفن سر سے باندھ کر میدانِ جنگ میں اترتے ہوں جو زندگی سے زیادہ موت کو عزیز رکھتے ہوں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فرزندانِ توحید ہر چیز کی قربانی دے سکتے ہوں، یہ گھوڑے، یہ اونٹ یہ ہاتھی سلطان شہاب الدین غوری کی شمشیر بے پناہ کو دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ یہ پیادے اور سوار، جو اکڑ اکڑ کر اپنے جیالے پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں میدانِ جنگ میں ان کی لاشیں چیل کوؤں کے لیے خوانِ یغما ثابت ہوں گی۔''

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دھیان چند اس کے پاس آیا، اسے غرق تخیل دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اس نے خیال کیا آج کے فوجی مظاہرہ نے دشمن کی ہمت پارہ پارہ کر دی اور قریب آ کر اُس نے بختیار کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دوستانہ لہجے میں کہا۔

''کیا سوچ رہے ہو میرے دوست؟''

بختیار چونک پڑا، اس نے کہا:

''کوئی خاص بات نہیں۔''

دھیان چند مسکراتا ہوا بولا:

''تم نے ہمارے مہاراج کی سینا (فوج) دیکھی!''

بختیار نے جواب دیا:

'''بہت اچھی طرح کیا کہنا اس لشکر کا۔''

دھیان چند ہنسنے لگا، اس نے کہا۔

''ابھی تم نے کیا دیکھا ہے۔ یہ تو مصنوعی جنگ تھی۔ ہمارے ان سپاہیوں کا کمال میدانِ جنگ میں نظر آئے گا۔ اس وقت کے فوجی مظاہرہ میں ہماری چوتھائی فوج بھی شریک نہ ہوسکی۔ لیکن جنگ کا بگل جب بجے گا تو پوری فوج جو حد شمار سے باہر ہے آن کی آن میں پیامِ قضا بن کر میدانِ جنگ میں پہنچ جائے گی۔''

بختیار مسکرانے لگا، اس نے کہا:

''اور پھر لقمۂ اجل ہو جائے گی۔''

دھیان چند نے بے خیالی میں کہا:

''ہاں اور کیا...... بے شک!''

یکا یک اُسے خیال آیا کہ بختیار نے بڑا گہرا طنز کیا تھا، اس کی بے تکلفی قہر و غضب سے بدل گئی۔

اس نے کہا:

''یہ میدان جنگ میں معلوم ہوگا کہ موت کس کی طرف جھپٹتی ہے اور کسے اپنا شکار بناتی ہے۔''

بختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''مجھے آپ کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے...... بیشک اس کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوسکتا ہے، لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آج مہاراج شرفِ باریابی عطا کریں گے؟''

دھیان چند نے جواب دیا:

''ہاں میں اسی لیے آیا تھا، مہاراج نے تمہیں طلب کیا ہے۔''

(8)

مَہاراج کے دَربار میں

بختیار دھیان چند کے ساتھ دربارِ ہال میں پہنچا۔ مسندِ شاہی پر تکیہ لگائے رائے پتھورا بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی کھانڈے راؤ بھی متمکن تھا۔ کھانڈے راؤ کے پیچھے اندر کمار اور شاہو جی ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پرتھوی راج نے کہا۔

''ایلچی تم آ گئے ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں، تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔''

بختیار نے شائستگی اور وقار کے ساتھ جواب دیا:

''مجھے فخر ہے کہ آپ کے دربار میں حاضر ہوں، آپ کے زیرِ سایہ کسی تکلیف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر پرتھوی راج کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ کھانڈے راؤ بول پڑا۔

''ایلچی! تمہارے شہاب الدین غوری کا کیا حال ہے؟''

بختیار نے جواب دیا:

''وہ بخیریت ہیں، خوش وخرم ہیں، انہیں کا پیام لے کر میں حاضر ہوا ہوں۔''

کھانڈے راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا:

''ایلچی! یہ تو بتاؤ ہماری تلوار سے تمہارے سلطان کو جو زخم کاری لگا تھا، اس کا کیا حال ہے! کیا وہ مندمل ہو گیا ہے؟''

بختیار نے بے ساختہ جواب دیا:

''خدا کا شکر ہے مندمل ہو گیا، میرے سلطان نے آپ کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ سے دریافت کروں، ان کے نیزے سے آپ کے سامنے کے جو دو دانت ٹوٹ گئے تھے کیا وہ پھر نکل آئے؟''

یہ سُن کر کھانڈے راؤ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا، اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا:

''ایلچی تم آدابِ سفارت سے ناواقف ہو، اسے نہ بھولو کہ تمہارا مخاطب کون ہے! اگر تم ایلچی نہ ہوتے تو ہم تمہاری گردن اڑادیتے!''

بختیار نے عزم واستقامت سے بھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

''سفیر کا فرض پیام کالانا اور لے جانا ہوتا ہے۔ جس طرح میرا یہ فرض ہے کہ آپ کے الفاظ سلطان تک پہنچادوں۔ اسی طرح میرا یہ فرض بھی ہے کہ سلطان کا ارشاد آپ کے گوش گزار کردوں۔ اگر انہیں آپ سے یا آپ کو ان سے شکایت ہے تو جس طرح آپ کی تلوار بے نیام ہوسکتی ہے اسی طرح سلطان کا نیزہ بھی چمک سکتا ہے۔ آپ جانیں اور وہ۔ باقی رہی یہ بات کہ آپ میری گردن اڑا سکتے ہیں تو اس کے جواب میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ میری گردن اُڑے دو چار گردنیں اس سے پہلے ضرور اس فرش شاہی پر لڑھکتی نظر آئیں گی۔''

کھانڈے راؤ کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچا۔ پرتھوی راج نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموش ہوجاؤ، کھانڈے راؤ کی آنکھوں سے گو خون ٹپک رہا تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور خاموش ہوگیا۔

پرتھوی راج نے بختیار کو مخاطب کیا:

''بتاؤ تمہارے سلطان نے کیا پیام بھیجا ہے؟''

بختیار نے کہا:

''وہی جو پہلے بھیجا تھا۔''

''لیکن اس کا جواب تم لے چکے ہو؟''

بختیار نے عرض کیا:

''اس جواب سے میرے سلطان کی تشفی نہیں ہوئی۔ انہوں نے مجھے اتمام حجت کے لیے بھیجا ہے۔''

پرتھوی راج نے پہلو بدلتے ہوئے خشم آلود لہجے میں پوچھا:

''ایلچی! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

بختیار نے سکون اور اطمینان کے ساتھ کہا:

''میرے سلطان نے فرمایا ہے، کہ یا تو آپ اسلام قبول کرلیں.....''

پرتھوی راج اپنی مسند سے ایک بالشت اُچھل پڑا، اس نے بادل کی طرح گرجتے

ہوئے کہا:

''ہم اسلام قبول کرلیں......؟''

پھر اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

''اگر ہم اسلام قبول نہ کریں تو......؟''

بختیار نے جواب میں عرض کیا:

''پھر لڑنے کے لیے تیار ہو جائیے۔''

پرتھوی راج کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم لڑیں گے، اپنے سلطان سے کہہ دو وہ یہاں تک آنے کی زحمت نہ کریں ہم وہیں آتے ہیں، ہندوستان کی سرزمین اسے قبر کے لیے بھی جگہ دینے کو تیار نہیں ہے غزنی میں شکست کھانے کے بعد اُسے گوشۂ قبر تو میسر آئے گا۔ دیکھو ایلچی ہم کتنے رحم دل ہیں۔''

بختیار نے پرتھوی راج کا ایک ایک لفظ پورے تحمّل کے ساتھ سنا، پھر اُس نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''میں آپ کا ارشاد سلطان والا شان تک پہنچا دوں گا۔''

پرتھوی راج نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے طنز اور حقارت کے لہجے میں کہا:

''سلطان والا شان۔''

اور پھر یکا یک وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ایوانِ خاص کی طرف جانے کے لئے مڑتے ہوئے بختیار سے کہا۔

''ایلچی اب تم جا سکتے ہو تمہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ راج بھون ہی سے نہیں اجمیر سے بھی! ہندوستان سے بھی خلاف عادت ہم نے بہت زیادہ تحمّل سے کام لیا ہے۔ لیکن ہم اپنے آپ سے برہم ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہمارا غصہ زیادہ بھڑ کا تو سلطان والا شان سے پہلے تمہاری شامت آجائے گی۔

دو قدم آگے بڑھنے کے بعد پرتھوی راج نے بختیار سے پوچھا۔

''تم کب جا رہے ہو؟''

بختیار نے بتایا:

''مہاراج میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔''

جاتے جاتے پرتھوی راج نے کہا:
''لیکن صبح ہونے کے بعد اجمیر میں تمہاری صورت نظر نہ آنی چاہیے۔''
بختیار نے رخصت ہوتے ہوئے جواب دیا:
''ایسا ہی ہوگا مہاراج!''
بختیار اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا، پرتھوی راج، کھانڈے راؤ اور دھیان چند کے ساتھ اپنے ایوان خاص میں آیا۔ اس نے کھانڈے راؤ سے کہا:
''ہمیں جنگ کی تیاری شروع کر دینی چاہیے، تم بڑے اچھے وقت پر اجمیر پہنچے ورنہ لازمی طور پر تمہارے انتظار میں تاخیر کرنا پڑتی۔''
کھانڈے راؤ نے بصد ادب عرض کیا۔
''ہم تیار ہیں، ہماری فوجیں کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ قبل اس کے کہ دشمن ہماری سرحد میں قدم رکھے ہم اس کی سرزمین پر اُسے جا لیں گے اور اس کا خاتمہ کر دیں گے۔''
پرتھوی راج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:
''ہاں ضرور ایسا ہی ہوگا، ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے۔''
دھیان چند جو اَب تک خاموش بیٹھا تھا یکا یک سرگرمِ تکلم ہوا۔
''مہاراج کیا یہ ایلچی یہاں سے زندہ چلا جائے گا؟''
پرتھوی راج نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا:
''کیا تم اسے قتل کر دینا چاہتے ہو؟''
دھیان چند نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا۔
''مہاراج میں یہی چاہتا ہوں اور یہ تمنا صرف میری ہی نہیں ہے (کھانڈے راؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چھوٹے مہاراج کی بھی یہی رائے ہے، بلکہ ہم دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل ہوگا اور ضرور ہوگا۔''
پرتھوی راج نے کھانڈے راؤ کو مخاطب کیا:
''کیا واقعی دھیان چند سچ کہتا ہے، تمہاری بھی یہی رائے ہے؟''
کھانڈے راؤ نے بغیر کسی تامل اور تذبذب کے جواب دیا:
''واقعہ تو یہی ہے مہاراج، اگر یہ شخص یہاں سے زندہ بچ کر نکل گیا تو ہمارے منہ پر

کالک لگ جائے گی۔ ہم ذلیل اور رسوا ہو جائیں گے۔ ہماری آن اور شان خاک میں مل جائے گی۔''

لحہ بہ لحہ یہ باتیں سن کر پرتھوی راج کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی، اس نے کہا:

''لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوگا...... ہم مانتے ہیں کہ یہ ایلچی نہایت منہ پھٹ اور گستاخ ہے لیکن بہر حال ایلچی ہے اور دُنیا کی کوئی حکومت بھی سفیروں کو قتل نہیں کیا کرتی، تم چاہتے ہو ہم وہ اصول توڑ دیں جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ تمہاری خاطر اگر ہم اس کے قتل کا حکم صادر کر دیں تو کیا اس کے بعد بھی ہمارے منہ میں کالک نہ لگے گی۔ ہم ذلیل و رسوا ہوں گے۔ نہیں کھانڈے راؤ نہیں، نہیں دھیان چند نہیں۔ اس طرح نہ سوچو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے، ہم قطعاً اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ انہونی بات ہے۔''

کھانڈے راؤ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''تو میں خودکشی کرلوں گا۔''

دھیان چند نے سُر میں سُر ملایا۔

''اور مہاراج کا یہ غلام بھی زہر کھالے گا۔ ہم اسی وقت تک زندہ ہیں جب تک ہمارے آقا، مالک اور مہاراج کی عزت و آبرو پر حرف نہ آئے۔''

پرتھوی راج یہ باتیں سن کر سخت پریشان ہوا، اس نے استمالت کے لہجے میں کہا:

''لیکن میرے بھائیو بتاؤ تو سہی وہ کونسی بات ہے جس نے تمہیں اتنا برانگیختہ کر دیا ہے۔''

کھانڈے راؤ نے وہ تمام گفتگو جو اس کے اور دھیان چند کے مابین بختیار کے قتل کے سلسلے میں ہوئی تھی پرتھوی راج کے سامنے دہرا دی۔ یہ گفتگو کچھ ایسے اثر انگیز الفاظ میں دہرائی کہ پرتھوی راج بہت متاثر ہوا، کچھ دیر تک وہ بحرِ فکر میں غوطہ زن رہا، پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

''بات تو ٹھیک ہے...... لیکن کیا اندر کمار اور شاہو جی کی بہادری پر تمہیں اعتماد ہے کہ یہ دونوں اس شخص سے جس کی دلیری اور دلاوری کے ہم دونوں قائل ہیں عہدہ برآ ہو سکیں گے۔''

کھانڈے راؤ سے پہلے دھیان چند بول پڑا۔

''اندر کمار اور شاہو جی نوجوان ہیں، ان کی رگوں میں گرم خون دوڑ رہا ہے۔ شاہو آشا کا منگیتر ہے۔ اندر کمار کو راجکماری نرملا سے کتنی محبت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے

کہ جیسے ہی اس نے ڈاکوؤں کی خبر سنی وہ بیقرار ہو کر یہاں چلا آیا۔''

کھانڈے راؤ نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''مہاراج آپ کے یہ دونوں سرفروش غلام تنہا تو نہیں جائیں گے، بختیار کے ساتھ ساٹھ ستر سواروں کا ایک دستہ ہے۔ اندر کمار اور شاہو جی کے ساتھ تین سو آدمی ہوں گے چُنے ہوئے منتخب، بہادری میں یکتا، سرفروشی میں بے مثال یہ تین سو نوجوان اندر کمار اور شاہو جی کی سرکردگی میں بختیار کا اور اس کے ساتھیوں کا قیمہ قیمہ کر دیں گے۔ اور پھر ان سب کی لاشیں عزت واحترام کے ساتھ دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے غوری کے پاس بھیج دیں گے اور اس کے ساتھ قتل کے چند مجرموں کی گردنیں بھی کہ یہ ڈاکو تھے، جنہوں نے ان کو ہلاک کیا پکڑے گئے اور کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ ان کے کٹے ہوئے سر ہمارے خلوص کا بہترین ثبوت ہیں۔''

پرتھوی راج نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

''جو چاہو کرو...... تمہیں اختیار ہے۔''

(9)

ترکیب تو اچھی ہے

نرملا کی وجہ سے آشا کو بختیار سے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی تھی۔ کھانڈے راؤ اور دھیان چند میں بختیار کو ہلاک کر دینے کا جو مشورہ ہوا تھا اُسے نرملا اور آشا دونوں نے سنا تھا اور پھر آج پرتھوی راج، دھیان چند اور کھانڈے راؤ نے اس سلسلے میں جو آخری فیصلہ کیا تھا اس کا ایک ایک لفظ بھی ان دونوں نے سُن لیا تھا۔ بختیار کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ بڑے مہاراج سے ملنے آ رہا ہے تو آشا نے نرملا سے کہا۔

''چلو ذرا باتیں سنیں گے، دیکھنا چاہیے سلطان کا ایلچی کیا پیام لے کر آیا ہے۔''

نرملا خوش خوش راضی ہوگئی، اس نے آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا:

''آؤ چلیں۔''

دونوں نے ایک الگ گوشے میں جا کر وہ تمام باتیں سنیں جو کھانڈے راؤ اور بختیار...... بختیار اور پرتھوی راج کے مابین ہوئی تھیں۔ پھر بختیار کے جانے کے بعد دھیان چند، کھانڈے راؤ اور رپرتھوی راج کی مجلسِ مشاورت نے جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی ان دونوں کے علم میں آ گیا۔

نرملا نے بے بسی کے ساتھ آشا کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیوں آشا اب کیا ہوگا؟''

آشا نے دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''ہوگا تو کچھ نہیں، لیکن اندر کمار اور شاہو جی کی شامت ضرور آئی ہے۔''

سہمے ہوئے انداز میں نرملا بولی۔

''یہ نہ کہو آشا ان کے پاس تھوڑے سے آدمی ہیں، اندر اور شاہو پوری فوج لے کر جائیں گے۔''

آشا نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا:

بختیار ایک بہادر شخص ... بزدلوں کی موت نہیں مر سکتا لیکن نرملا مجھے حیرت اس پر

ہے کہ بڑے مہاراج اور چھوٹے مہاراج کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا بہادر بھی بزدل ہوتے ہیں۔ دھوکے سے کسی آمی کو قتل کرنا میرے نزدیک تو بزدلی ہے۔ اور تمہارے نزدیک۔''

''میرے نزدیک بھی! نرملا نے جواب دیا۔

''میرا خیال تھا بڑے مہاراج دھیان چند کی باتوں میں نہیں آئیں گے اور چھوٹے مہاراج کو اس کاروائی سے باز رکھیں گے جس میں ان کی، ملک اور قوم کی بدنامی ہے، لیکن اس کمینے دھیان چند سے بھگوان سمجھے نہ جانے اس کی باتوں میں کیا جادو ہے کہ اس نے بڑے مہاراج کو بھی اپنے دام میں پھنسالیا۔''

نرملا نے آشا کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

پھر نرملا نے آشا سے پوچھا۔

''کیا میرا ساتھ دو گی؟''

آشا نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔

''آخر وقت تک...... بے شک میں بڑی بزدل اور کمزور ہوں، جیسا کہ تم جانتی ہو لیکن تمہارا معاملہ آجانے پر مجھ سے بڑھ کر بہادر کوئی نہیں ہے۔ یاد ہے ناشیر کے ڈر سے جو آشا اپنے رتھ سے نہیں اتری تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ نرملا شیر کے سامنے یعنی موت کے دہانے پر کھڑی ہے تو اس کی بزدلی کافور ہو گئی۔ وہ رتھ سے اُتری اور بھاگوں بھاگ نرملا کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر نرملا اس دُنیا سے رخصت ہو چکی ہے تو وہ بھی اپنا سر شیر کے منہ میں ڈال دے گی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی نرملا آشا سے پوچھتی ہے کیا تم میرا ساتھ دو گی؟''

نرملا محبت بھری نظروں سے آشا کو دیکھ رہی تھی اور اس کی باتیں سن رہی تھی، اسے گلے سے لگاتی ہوئی بولی۔

''میں نے تو یونہی ایک بات پوچھی تھی، یہ مقصد کب تھا کہ تم کو خفا کر لوں، اس قدر جلد نہ روٹھ جایا کرو آشا!''

آشا نے جواب دیا:

''اچھا اب نہیں روٹھوں گی، بتاؤ پروگرام کیا ہے۔ کیا چاہتی ہو، کیا ارادہ ہے۔ کیا کرو گی؟''

نرملا نے اس سے کہا:

''کان میرے پاس لاؤ، دیوار ہم گوش دارد۔''

آشانے اپنا کان نرملا کے منہ سے لگا دیا۔ اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا:

''وہاں چلنا ہے۔''

آشانے پھٹی پھٹی نگاہوں سے نرملا کو دیکھا اور بولی۔

''کہاں چلنا ہے، کیا بختیار کے پاس؟''

نرملا نے آشا کے رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں پگلی......اور کہاں!''

بڑی معصومیت کے ساتھ آشانے جوابدیا:

''تو کیا تم اس کے ساتھ بھاگ جاؤ گی؟......نا بھائی اس معاملے میں ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔''

نرملا ہنسنے لگی، بولی۔

''اپنی طرف سے خیال آرائیاں چھوڑ دو۔ کیا تم نے مجھے اتنا گیا گزرا سمجھا ہے کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ بھی سکتی ہوں؟''

آشانے چھیڑتے ہوئے کہا:

''بختیار کا شمار ''کسی'' میں تو نہیں ہے۔ یہ وہی ذاتِ شریف ہیں جن پر تم ہزار جان سے فریفتہ ہو؟''

نرملا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگی:

''ہاں مجھے ان سے محبت ہے، لیکن صرف مجھے۔ اُنہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتی کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی بار دیکھا۔ لیکن ان نگاہوں میں اجنبیت تھی، پیار نہ تھا۔ آشا میں ان سے محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی، لیکن ان کے سامنے یہ لفظ میری زبان پر نہیں آسکتا۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اگر دو قدم وہ میری طرف بڑھتے تو میں دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑتی، لیکن وہ میری طرف پیٹھ کیے کھڑے ہیں ان سے مجھے کوئی آس نہیں ہے۔ آشا سچ کہتی ہوں محبت بڑے مزے کی چیز ہے اگر دل کی کوٹھڑی کے اندر رہے۔''

آشانے نرملا کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

''معلوم ہے تم کتنی اونچی ہو، لیکن اپنی بڑائی کا ذکر خود اپنے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ خیر

اگر تم نے فیصلہ کر لیا ہے تو چلو ہم بھی چلے چلیں گے ساتھ۔''

نرملا خوش ہو گئی، اس نے کہا۔

''آشا تو واقعی مایوسیوں کی آشا (امید) ہے، لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لے۔''

آشا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، نرملا بولی۔

''ان سے باتیں تجھی کو کرنا پڑیں گی، میں تو بس ہوں ہاں کرتی رہوں گی۔''

آشا نے چہک کر کہا۔

''واہ یہ بھی اچھی رہی تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ محبت کریں راجکماری جی خود، اور اُن کی ترجمانی کروں میں! جی بخشیے...... میں تو ہوں ہاں بھی نہیں کرنے کی۔ چپ چاپ بیٹھی رہوں گی تم کرنی رہنا راز و نیاز جی بھر کے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کیا کہنا ہے؟''

نرملا نے کچھ دیر تامل رہ کر و جواب دیا۔

''صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ ہوشیار رہیں، ایسا نہ ہو کہ اچانک اُن پر وار ہو جائے میری رائے میں تو انہیں اپنی حفاظت کا انتظام کر لینا چاہیے۔''

آشا نے نرملا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''سچ ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ یہ بھی کر لو، خاندان کی ناک کٹانے میں تمہیں قسم ہے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا، بہر حال ہم تمہارے ساتھ ہیں، جو تمہارا حشر ہو گا وہی ہمارا۔ کب چلنا ہے؟''

نرملا نے جواب دیا:

''بس آج ہی رات ہے، کل تو وہ چلے جائیں گے۔''

آشا نے ایک سوال بڑا بے ڈھب کیا، اس نے پوچھا۔

''لیکن راج بھون سے باہر کس طرح نکلیں گے ہم لوگ؟''

نرملا نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا، میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ اسے جانتی ہو نا! وہ ہماری باندی ہے۔ منورما، وہ میرا کہنا کسی طرح نہیں ٹال سکتی۔ ابھی بلا کر اسے سمجھا دوں گی۔ ٹھیک بارہ بجے رات کو، اس کا بھائی دو کسے کسائے گھوڑے لے کر آ جائے گا۔ ہم چور دروازہ سے باہر نکلیں گے اور ان گھوڑوں پر بیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے۔''

''بات آشا کے دل میں جم گئی کہنے لگی، ہاں ترکیب تو اچھی ہے۔''

(10)

اب کیا ہوگا آشا

انا ساگر کی طرف سے ہوتے ہوئے دو سوار تارا گڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ پہاڑ اجمیر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ روایتیں بھی تقدس اور احترام کی شامل ہیں۔ پہاڑ کے دامن میں ایک بلند ٹیلے پر وہ خوش نما عمارت نظر آ رہی تھی۔ جو بختیار کا مسکن تھی۔ عمارت پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا ہے۔ صرف پہرہ دار پھاٹک پر اپنے فرض کی بجا آوری میں تلوار اور نیزہ سے مسلح کھڑا ہوا ہے۔ یہ دونوں سوار پہرہ دار کے پاس آئے اور اس سے کہا۔

''ہمیں ابھی اور اسی وقت شہاب الدین غوری کے ایلچی بختیار سے ملنا ہے۔''

پہرہ دار نے سر سے پاؤں تک ان دونوں کو گھور کے دیکھا، پھر پوچھا۔

''تم کیوں ملنا چاہتے ہو کون ہو تم؟ یہ وقت کیا ملاقات کا ہے! جاؤ اپنی راہ لو۔''

ایک سوار نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ تو مہاراج کا نوکر ہے اور مہاراج سپاہیوں کو نہیں پہچانتا۔ ہم مہاراج کا خاص پیغام لے کر آئے ہیں۔ اگر تم نے بختیار کو اطلاع نہ دی تو ابھی تیری گردن لڑھکتی نظر آئے گی۔ اور تیرے بال بچوں کو راجہ کولھو میں پلوا دیں گے۔''

یہ سن کر پہرہ دار بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا، اس نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا:

''بھول ہوگئی سرکار مجھ سے آپ کو پہچانا نہ تھا، میری کیا مجال ہے کہ مہاراج کے سپاہیوں کو روک سکوں، جایئے، تشریف لے جایئے۔ داہنے ہاتھ کو جو پہلا کمرہ ہے اس میں غزنی کا ایلچی رہتا ہے۔ اور اس کمرے کی پشت پر جو بہت چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں ان میں ان کے سپاہی رہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر پہرہ دار سامنے سے ہٹ گیا۔ دونوں سوار گھوڑے سے اُترے۔ ان کی لگام پہرہ دار کو تھمائی اور کہا

''ہم ابھی آتے ہیں گھوڑوں کو سنبھالے رکھنا۔''

دونوں سوار آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے اس کمرہ کی طرف بڑھے جو بختیار کا مسکن تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر دستک دی مگر صدائے برنخاست، تیسری دستک پر دروازہ کھلا، بختیار کا روشن اور تاباں چہرہ نمودار ہوا، اس نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر پھرے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔

''تم کون ہو! کیوں آئے ہو! کیا چاہتے ہو''

ایک سوار نے نرم اور ملائم لہجے میں کہا:

''ڈریے مت ہم دوست ہیں باتیں کرنے آئے ہیں۔''

بختیار نے حیرت سے ان دونوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھا اور کہا۔

''تم دوست ہو لیکن میں تمہیں جانتا نہیں، تم مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہو، لیکن میں کسی قسم کی گفتگو تم لوگوں سے نہیں کرنا چاہتا۔''

دوسرے سوار نے کہا۔

ایلچی صاحب معلوم ہے آپ بڑے بہادر ہیں لیکن اتنے زیادہ بہادر بھی نہ بنیے کہ بزدلی کا شبہ ہونے لگے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے، کہ ہم آپ کی جان لینے آئے ہیں تو لیجئے، یہ تلواریں ہم الگ رکھے دیتے ہیں، لیکن مایوس واپس نہ کیجئے۔ کچھ ضروری اور بے انتہا اہم باتیں آپ سے کرنی ہیں۔ وہ باتیں آپ ہی کے فائدے کی ہیں ہمیں موقع دیجئے، ہم پر اعتماد کیجئے، وقت نہ ضائع کیجئے، ہمیں واپس جانا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو آپ کی خیریت ہے نہ ہماری۔''

ان الفاظ میں کچھ ایسا اثر تھا کہ بختیار نے دروازہ کھول دیا اور کہا۔

''آیئے تشریف لایئے۔''

دونوں سوار اندر داخل ہو گئے، اور داخل ہوتے ہی پہلے سوار نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھتے ہوئے اُس نے بختیار سے کہا:

''آپ بھی تشریف رکھئے۔''

بختیار بیٹھ گیا۔ دوسرے سوار نے سوال کیا:

''کیا آپ کل صبح غزنی واپس جارہے ہیں؟''

''جی ہاں۔ صبح مجھے یہاں سے ضرور چلے جانا چاہیے۔''

''کس راستے سے جائیں گے آپ؟''

''جس راستے سے آیا تھا...... لیکن اس سوال کا مطلب! میں جس راستے سے چاہوں واپس جا سکتا ہوں۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خاص راستہ مجھے اختیار کرنا چاہیے، کیا آپ کے مہاراج یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں اور ان کے بھیجے ہوئے آدمی میرا کام تمام کر دیں، لیکن میرے دوست میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔''

دوسرے سوار نے کہا۔

''آپ کی بہادری میں کون شبہ کر سکتا ہے، ہمیں مہاراج نے نہیں بھیجا راجکماری نرملا نے بھیجا ہے۔ انہوں نے درخواست کی ہے آپ کسی نئے راستے سے جائیں۔''

یہ الفاظ سن کر بختیار چونک پڑا، اس نے کہا۔

''آپ کو راجکماری نرملا نے بھیجا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ نہایت شریف اور اونچے کردار کی مالک ہیں۔ اگر انہوں نے بھیجا ہے تو ضرور کوئی خاص بات ہے۔ کیا کوئی وجہ بھی بتائی انہوں نے؟''

دوسرے سوار نے پہلے سوار کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''جی ہاں، وجہ بھی بتائی ہے۔ دھیان چند، کھانڈے راؤ اور مہاراج نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ اگر یہاں آپ کو قتل کیا جاتا ہے تو اس سے بدنامی ہوتی۔ لہٰذا طے یہ کیا گیا ہے کہ راستے میں آپ پر بہت سے آدمی ٹوٹ پڑیں اور جب آپ کو قتل کر چکیں تو آپ کی لاش سلطان شہاب الدین کے پاس بھیج دیں۔ اور ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہیں یہ ڈاکوؤں کی حرکت تھی۔ ان لوگوں نے یہ بھی طے کیا ہے کہ جن لوگوں کو کسی جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی ہے ان میں سے پندرہ بیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ان کی کٹی ہوئی گردنیں بھی سلطان کے پاس بھیج دی جائیں۔

بختیار نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا:

''لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

سوار نے جواب دیا:

''سلطان کو باور کرا دیا جائے گا کہ جن ڈاکوؤں نے آپ کو قتل کیا ہے اُن کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح سلطان برہم ہونے کے بجائے مہاراج کے ممنون ہوں گے۔''

بختیار نے ایک اور سوال کیا:

''راجکماری کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ مہاراج نے مجھے قتل کر ڈالنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

دوسرے سوار نے پہلے سوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ ان سے پوچھیے۔''

پہلا سوار گڑ بڑا گیا۔ اسے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑا، بختیار نے کہا:

''بہر حال میں راجکماری کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک پردیسی شخص اور دشمن قوم کے نمائندہ کے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کیا، میں ان کی شرفت اور کردار کی بلندی کا بہت دنوں سے قائل ہوں۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور کہہ دیجئے آپ کے حکم پر میں جان دے سکتا ہو۔ لیکن جان بچانے کے لیے آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ میں ہرگز کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کروں گا۔ میں اسی راستے سے جاؤں گا جو عام راستہ ہے جس سے میں آیا تھا، اگر موت لکھی ہے تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا اور اگر زندگی باقی ہے تو ہر خطرہ کو جھیلتا ہوا سلامتی سے نکل جاؤں گا۔''

پہلے سوار نے التجا کے لہجے میں کہا:

''ضد نہ کیجئے، کہنا مانیے، سانپ کے منہ میں انگلی دینا بہادری نہیں ہے۔ بہادری کا مظاہرہ میدانِ جنگ میں کیا جاتا ہے۔ وہاں جتنی چاہیے گا بہادری دکھا لیجئے گا۔ لیکن مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ سینکڑوں مسلح دشمنوں کا مقابلہ کرنا دانائی نہیں ہے۔''

بختیار نے ایک عزم کے ساتھ کڑے تیوروں سے جواب دیا:

''ممکن ہے، یہ دانائی نہ ہو لیکن بزدلی ضرور ہے۔ عقل مند بن کر بزدل کی زندگی بسر کرنا بس سے باہر ہے۔ بہادری کے ساتھ دشمن سے لڑتے ہوئے جان دے دینا ممکن ہے بیوقوفی ہو لیکن افسوس پھر میں بیوقوف ہی ہوں۔''

بہت کمزور گھٹی ہوئی آواز میں پہلے سوار نے کہا۔

''تو آپ نہیں مانیں گے۔''

بختیار نے اور زیادہ زور اور شدت کے ساتھ مختصر سا جواب دیا:

''نہیں۔''

دفعتہً پہلے سوار نے دوسرے سوار کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''آشا؟ کیا تم بھی نہیں سمجھا سکتیں؟''

اور یہ کہتے کہتے اس کے ہاتھ پاؤں پر تشنجی کیفیت طاری ہوگئی، دانت بیٹھ گئے اور اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ بختیار نے اضطراب اور استعجاب کے ساتھ دوسرے سوار کی طرف دیکھا، پھر پوچھا۔

''آپ آشا دیوی ہیں، اور یہ...... یہ؟''

آشا نے جواب دیا:

''جی ہاں یہ راجکماری نرملا ہیں...... وہ مغرور لڑکی جس نے بڑی بڑی ہستیوں کو، راجوں کو، مہاراجوں کو، شہزادوں کو راجکماروں کو، دولت مندوں اور سرمایہ داروں کو بہادر سپاہیوں اور جنگ جو سورماؤں کو کبھی نگاہِ غلط انداز سے نہیں دیکھا۔ وہی مغرور لڑکی آپ کے لیے، صرف آپ کے لیے اپنی جان، ایمان اور ناموس غرض ہر چیز کو خطرہ میں ڈال کر افتاں وخیزاں یہاں پہنچی ہے۔ محبت!''

(11)

وہ گھورتی ہوئی آنکھیں

وہ کمرہ ہے اور وہی تین نفوس، نرملا، آشا اور بختیار!

نرملا اب ہوش میں آ چکی تھی، آشا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور بختیار پیکر اضطراب بنا ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشوش اور فکر کے آثار طاری تھے۔ یکا یک وہ نرملا کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، اس نے کہا۔

''راجکماری! اب صبح ہونے والی ہے آپ کو تشریف لے جانا چاہئے۔ لیکن اب آپ کا مزاج کیسا ہے! کمزوری تو نہیں محسوس ہوتی۔ آپ گھوڑے پر کیسے سوار ہو سکیں گی۔ چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔''

آشا بولی:

''جی ضرور...... تا کہ پھر ہمارے سپاہیوں کو آپ کے تعاقب میں نہ جانا پڑے۔ شکار خود ہی صیاد کے سامنے پہنچ جائے۔''

بختیار ہنسنے لگا۔

''واقعی آپ کے دلچسپ ہونے میں شبہ نہیں۔''

آشا نے سوکھے منہ سے کہا:

''شکریہ......''

پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ پکڑ کر نرملا کو اُٹھاتی ہوئی بولی۔

''آؤ، نرملا، واقعی اب صبح ہوا چاہتی ہے۔ اگر راز افشاں ہو گیا تو مجھے اپنی فکر نہیں، تمہیں بھی اپنی فکر نہیں، لیکن ہم دونوں کو ان کی۔

بختیار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے!

فکر ضرور ہے۔ ان کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ نہ جی چاہو تو بھی چلو...... سینے پر پتھر رکھ کر چلو!''

نرملا کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

''تمہاری شامت آئی ہے شاید!''

پھر وہ جانے کے لیے مڑی، اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

''ایک مرتبہ پھر آپ سے کہتی ہوں کہ ضد نہ کیجئے۔''

بختیار نے اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا:

''راجکماری! آپ فکر نہ کیجئے...... بالکل فکر نہ کیجئے......خدا حافظ!''

راجکماری چلی گئی۔ بختیار سامانِ سفر ٹھیک کرنے میں لگ گیا۔ بہ ظاہر وہ کام میں مصروف تھا، لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے نرملا کی تصویر پھر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں آشا کی آواز گونج رہی تھی، محبت......!

اس نے اپنے دل سے سوال کیا:

''کیا میں بھی محبت کر سکتا ہوں نرملا سے؟''

دل نے جواب دیا: ''یہ کیسے ممکن ہے، محبت ایک ہی سے ہوتی ہے، دو سے نہیں ہوسکتی۔ اگر ماہ سے محبت کرتے ہو تو نرملا سے نہیں کر سکتے۔ اور اگر ماہ کو اب تک دھوکا دیتے رہے تھے تو بے شک شوق سے عشق لڑاؤ۔''

بختیار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا:

''مجھے ماہ سے محبت ہے، عشق ہے۔ اس سے، اس کی وفاداری سے، دلاوری، صداقت، خلوص، محبت کون سی چیز ایسی ہے جو فراموش ہو سکے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار......اور شاید آخری بار بھی صرف اسی سے محبت کی ہے۔ میں اُسے چاہتا ہوں اس کے سوا کسی کو نہیں چاہ سکتا۔ وہ میری آرزو ہے میری جانِ آرزو ہے......وہ صرف میری ہے میں صرف اس کا ہوں...... ہاں راجکماری کے اخلاق، شرافت، عالی ظرفی اور بلند کردار کا میں دل سے معترف ہوں، لیکن میرے اور اس کے راستے میں کیسے کیسے خار حائل ہیں۔ مذہب، قوم، ملک اور سب سے بڑھ کر ماہ، کسی قیمت پر بھی اس کے سوا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا، اگر راجکماری مجھ سے محبت کرتی ہے تو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ لیکن میں سب کچھ دے سکتا ہوں لیکن میں دل نہیں دے سکتا۔ وہ میرا ہے ہی کب، جس کا تھا اُس کے پاس ہے......اُسی کے پاس رہے گا۔''

پھر اس نے سوچا، راجکماری کی حالت قابلِ رحم ہے، لیکن زمانہ اس نقش کو مٹا دے گا۔

میں اگر اس ملک کا باشندہ ہوتا، اس ملک کے مذہب کا پرستار ہوتا۔ رائے پتھورا کا ملازم یا درباری ہوتا۔ میری اور راجکماری کی ہر وقت ملاقات ہوا کرتی تو بے شک یہ نقش جو راجکماری کے دل پر قائم ہو گیا ہے نہیں مٹ سکتا تھا لیکن آج کے بعد جب کبھی اُسے میری صورت دیکھنے کا، مجھ سے ملنے کا، ربط ضبط بڑھانے کا موقع نہیں ملے گا تو وہ مجھے بھول جانے پر مجبور ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر اُس کے دل کو اطمینان ہو گیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا سر سے! اب وہ پہلے سے زیادہ دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں فجر کا وقت آ گیا، اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''تم لوگ ساری تیاری جلد از جلد مکمل کر لو۔ میں ذرا آستانۂ خواجہ تک جاتا ہوں، وہاں حاضری دوں گا اور حضرت خواجہ صاحب سے دعائے خیر لوں گا۔ اور پھر واپس آ جاؤں گا، طلوع آفتاب پر ہمیں یہ شہر چھوڑ دینا چاہیے۔''

''کوئی ایک گھنٹے بعد حضرت صاحب کے اقتدا میں نماز پڑھ کر، ان سے رخصت ہو کر اور دعائے خیر حاصل کر کے بختیار واپس آیا۔ یہاں ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اس کے آتے ہی سب نے باگیں اُٹھائیں اور گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے روانہ ہو گئے۔''

یہ قافلہ راج بھون کے نیچے سے گزرا خود بخود بختیار کی آنکھ اوپر اُٹھ گئی اسے دو آنکھیں ایک روزن سے اپنی طرف تکتی نظر آئیں، اس نے سمجھ لیا یہ نرملا ہے۔

قافلہ آگے بڑھا اور بہت جلد شہر سے نکل کر اپنے اصل راستے پر ہو لیا۔

بختیار نے نرملا سے جب وہ ہوش میں آئی تھی وعدہ کر لیا تھا کہ دوسرے راستے سے جائیں گے۔ لیکن یہ بات اس نے محض نرملا کا دل رکھنے کے لیے کہہ دی تھی۔ ورنہ اس کی غیرت یہ بات کسی طرح برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی کہ دشمن کے ڈر سے اپنا راستہ بدل دے۔

چنانچہ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا، یعنی اسی راستے پر چل پڑا جس سے آیا تھا۔ جو عام اور کھلا ہوا راستہ تھا۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ وہ چوکنا تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو اس کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچ جاتا۔

''سارا دن اسی طرح گزر گیا، اور اب اُسے یقین ہو گیا کہ نرملا کا اندیشہ بے بنیاد تھا، کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا!''

(12)

اندر کمار اور شاہو جی کا قتل

بختیار عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا اور اب سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کا ایک معتمد غلام خیمے میں آیا اور اُس نے کہا۔

''ہمارے طلایہ کے دو آدمی خبر لائے ہیں کہ تقریباً تین سو آدمیوں کا ایک لشکر اس طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے، جس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی بُرے ارادہ سے نہ آ رہے ہوں۔''

''وہ جس ارادہ سے بھی آ رہے ہوں ہم اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ اگر وہ دشمن ہیں تو انہیں ایک ناقابل شکست دشمن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر دوست ہیں تو ہم دیدہ دل فرش راہ کر دیں گے لیکن ہمیں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

یہ کہہ کر بختیار باہر آیا، اس نے اپنے ساتھیوں کو بلایا اور گویا ہوا۔

''کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں ہمارے آدمیوں کی اطلاع یہ ہے کہ وہ دشمن ہیں، ممکن ہے یہ اطلاع غلط ہو۔ لیکن ہمیں تیار رہنا چاہیے۔''

تھوڑی سی دیر میں بختیار اور اس کے ساتھی، جن کی مجموعی تعداد ستر اسی افراد سے زیادہ نہ تھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیار ہو گئے۔ اتنے میں سواروں کا ایک دستہ نظر آیا اور بہت جلد سر پر پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے بختیار اور اس کے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اندر کمار اور شاہو صف سے نکل کر آگے آئے اور انہوں نے بختیار سے کہا:

''مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، تم بھی اور تمہارے ساتھی بھی۔ ہمیں انسان نہ سمجھنا ہم ملک الموت ہیں۔''

بختیار مُسکرایا، حقارت کی ایک نظر دونوں پر ڈالی اور کہنے لگا:

''دنیا میں ہمیشہ کون زندہ رہا ہے، سب کو مرنا ہے۔ کمزور کو بھی اور طاقتور کو بھی ہمیں بھی اور تمہیں بھی۔ لیکن ہم میں سے کون پہلے مرے گا اس کی پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔''

اندر کمار نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا اور نہایت بپھرے ہوئے لہجے میں کہا:

''کمینے انسان، کیا تم لڑنا چاہتے ہو۔ لڑ سکو گے ہم سے، اتنی سکت ہے تم میں؟''

بختیار نے نہایت تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

''یقیناً میں اور میرا ساتھی اس وقت تک لڑے گا جب تک بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔''

شاہو اب تک خاموش کھڑا تھا، اس نے کہا۔

ہمیں تم پر رحم آتا ہے، تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے، ضد نہ کرو ہتھیار ڈال دو۔

بختیار نے پوچھا۔

''اگر ہتھیار ڈال دوں تو کیا ہوگا؟''

شاہو نے جواب دیا۔

اس طرح ممکن ہے تمہاری جان بچ جائے۔

بختیار نے ایک اور سوال کیا۔

''لیکن کیا اس طرح اپنی جان بچا کر میں دنیا میں کسی کو منہ دکھا سکوں گا؟''

شاہو ہنسنے لگا، اس نے جواب دیا:

''زندگی کے مقابلے میں ہر ذلت گوارا کی جا سکتی ہے۔''

بختیار نے کڑے تیور کے ساتھ کہا:

''مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔''

اندر کمار نے تلوار نیام سے نکالی اور حملہ کرتے ہوئے گویا ہوا:

''ہم بھی کب تمہیں زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

بختیار نے تلوار کو تلوار پر روکا اور پھر ایک ایسا ہاتھ اس کے سر پر لگایا گردن کٹ کر دور جا پڑی، یہ واقعہ اس قدر جلد رونما ہوا کہ شاہو حواس کھو بیٹھا۔ سامنے اندر کمار کی بے جان لاش پڑی تھی اور اس کا کٹا ہوا سر لڑھک رہا تھا، اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ وہ یہ سمجھ کر آیا تھا کہ بختیار ایک لقمۂ تر ہے۔ ہمارے تین سو آدمیوں کے مقابلے میں وہ کیا ٹھہر سکے گا۔ لیکن ان تین سو آدمیوں کا سپہ سالار اعظم خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ میں کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ اب جب تک بختیار کی گردن کاٹ نہ لی جائے کام نہیں بنے گا۔

یہ سب کچھ ایک لمحے کے اندر سوچ کر اس نے تلوار میان سے نکالی اور بختیار پر جھپٹ پڑا، جھپٹتے جھپٹتے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''دوستو آگے بڑھو، خبردار دشمن کا ایک آدمی بھی زندہ بچ کر نہ جاسکے۔''

ادھر شاہو نے بختیار پر حملہ کیا ادھر اُس کے تین سو جنگ دیدہ اور کارآزمودہ جیالے تلوار سونت کر بختیار کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بختیار اور شاہو میں دو منٹ تک تلوار چلتی رہی، شاہو کی تلوار کا ایک اوچھا سا وار بختیار کے شانے پر پڑا اور خون جاری ہو گیا، بختیار نے ایسا جچا ہوا ہاتھ لگایا کہ اس کی تلوار شاہو کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ پیٹھ سے جا نکلی۔ آہ کے ایک نعرے کے ساتھ وہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ ادھر شاہو کے آدمیوں اور بختیار کے ساتھیوں میں بھی زور شور سے جنگ جاری تھی۔ بختیار کے کئی آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے، شاہو کے سپاہیوں میں بھی بیس پچیس آدمی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ ان لوگوں میں اندر کمار کے قتل کے بعد ہی پست حوصلگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب انہوں نے چشمِ زدن میں شاہو کو بھی زمین پر پاؤں رگڑتے موت کی ہچکیاں لیتے دیکھا تو یہ دہل گئے۔ ان کا حوصلہ جواب دے گیا، یہ اسی طرح بھاگ کھڑے ہوئے جس طرح شیر کو دیکھ کر اندر کمار اور شاہو جی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔ ان کے فرار کے بعد بختیار نے اپنے ساتھیوں کو شمار کیا تو سات آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں ایک کی حالت اتنی نازک تھی کہ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ باقیوں کے زخم معمولی تھے۔ ان کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ بختیار کے حکم سے ایک بڑا گڑھا کھودا گیا۔ اور اس میں یہ شہیدان خونی کفن دفن کر دیے گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر بختیار نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''دوستو، یہ پرتھوی راج کے آدمی تھے جو ہمیں قتل کرنے آئے تھے، ہر طرح کے اختلاف کے باوجود میرا خیال تھا کہ پرتھوی راج ایک بہادر شخص ہے لیکن آج معلوم ہوا وہ بزدل ہے دنیا کا کوئی بادشاہ بھی سفیر اور ایلچی کو قتل نہیں کرتا۔ لیکن اس نے ہمیں قتل کرنے کے لیے تین سو آدمیوں کا ایک لشکر بھیج دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ حق غالب آیا اور باطل کو شکست ہوئی۔ کثرت تعداد کے باوجود دشمن کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ قلت تعداد کے باوجود فتح اور کامرانی ہمارے حصے میں آئی۔ آؤ اس خدائے بزرگ و برتر کی جناب میں سجدۂ شکر ادا کریں۔''

بختیار اور اس کے ساتھی دوسرے تمام آدمی خدائے بے ہمتا کی بارگاہ میں سربسجود ہو گئے۔ پھر بختیار نے ان سے کہا۔

''یہاں قیام کا ارادہ ہمیں ترک کر دینا چاہیے لیکن ممکن ہے تھوڑی دیر میں اس سے بھی کوئی بڑا لشکر ہمارا تعاقب کرتا ہوا آ جائے اور ہمیں سلطان والا شان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہاں کے صحیح حالات پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے وہ ہمارے منتظر ہوں گے۔ ہمارے معروضات سننے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے۔ لیکن دشمن نے اگر ہمیں قتل کر دیا تو بے خبری میں وہ ان پر جا پڑے گا۔ اور سلطان کو ایک مرتبہ پھر ویسی ہی شکست سے دوچار ہونا پڑے گا جیسی ترادری کے میدان میں ہو چکی ہے، یہ شکست سلطان شہاب الدین غوری کی نہ ہوگی بلکہ ملت اسلامیہ کی ہوگی۔ اسلام کا م جو قافلہ غزنی سے نکل کر سرزمینِ ہند پر اپنا پرچم لہرانے کے لیے آمادۂ جہاد ہو کر آ رہا ہے اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک جائیں گے۔ مسلمانوں کی کشور کشائی ایک افسانۂ پارینہ بن جائے گی۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے یہ شکست ہی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو اور پرتھوی راج یلغار کرتا ہوا غزنی تک پہنچ جائے......نہیں ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے ہم ہر قیمت پر سلطان کی خدمت میں پہنچیں گے اور پھر ان کے ساتھ جہاد کے لیے اس سرزمین پر واپس آئیں گے۔''

اس تقریر کے بعد چند لمحوں کے اندر سامانِ سفر تیار ہو گیا۔ اور یہ چھوٹا سا قافلہ رات کے اندھیرے میں ایمان کی روشنی ساتھ لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔

(13)

ہیم چند اور تھوِ یراج

اجمیر کے راج بھون میں آج رُت جگے کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایوانِ خاص میں پرتھوی راج، کھانڈے راؤ اور دھیان چند، شاہو اور اندر کمار کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ محل سرا کے زنانہ حصے میں نرملا اور آشا اپنے کمرے میں بیٹھی گم صم اور خاموش ایک دوسرے کی طرف تک رہی تھیں۔ نرملا کی آنکھ اشک آلود تھیں۔ آشا کے چہرے پر اضطراب کے اثرات طاری تھے۔

نرملا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا:

''اب کیا ہوگا آشا! میں نے تمہیں روکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ راستہ بدل لیں گے میرا دل کہتا ہے کہ صرف مجھے تسلی دینے کے لیے انہوں نے وعدہ کرلیا تھا ورنہ وہ اسی عام راستے سے گئے ہوں گے بلکہ ممکن ہے دور جانے کے بعد وہ اندر اور شاہو کے انتظار میں ٹھہرے ہوں تاکہ وہ دو ہاتھ کرلیں تب جائیں۔ لیکن آشا کیا بہادر لوگ بیوقوف بھی ہوتے ہیں؟ سوچو تو سہی کہاں مٹھی بھر آدمی کہاں تین سو کا لشکر؟! اکیلا چنا کیا بھاڑ پھونکے گا؟ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو آشا میں بھی زندہ نہیں رہوں گی، صرف یہ سننے کے لیے بیٹھی ہوں کہ اندر اور شاہو کیا خبر لاتے ہیں؟''

آشا نے نرملا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تم دیوانی ہو، مانا وہ بڑے بہادر ہیں۔ لیکن موت کے منہ میں کود پڑنا تو بہادری نہیں ہے، وہ ضرور دوسرے راستے سے گئے ہوں گے، دیکھ لینا اندر اور شاہو خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ منہ لٹکائے جھینپے جھینپے، سچ نرملا بڑا مزا آئے گا ان کی یہ حالت دیکھ کر، تم جانتی ہو میں نے شاہو سے ملنا جلنا اور بات چیت کرنا بند کردیا ہے، لیکن آج ضرور مبارک باد دوں گی۔''

نرملا نے آشا کی طرف تعجب سے دیکھا اور بولی۔

''مبارک باد کس بات پر دوگی؟''

آشا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ناکامی پر!......نرملا! میرا کہا مانو تم بھی اندر کمار کو آج ناکامی پر مبارک باد دے ڈالو۔ خوش ہو جائے گا بیچارہ!''

نرملا بولی:

''ہٹو بھی آشا...... تمہیں اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔''

اتنے میں کسی کام سے منورما داخل ہوئی آشا نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

''کیوں ری کوئی خبر آئی؟''

''نہیں سرکار۔ بڑے مہاراج اور چھوٹے مہاراج دونوں پریشان ہو رہے ہیں، کہ یہ لوگ اب تک کیوں نہیں واپس آئے؟''

عین اُس وقت جب منورما نرملا سے یہ باتیں کر رہی تھی پرتھوی راج نے جام شراب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

''کھانڈے راؤ تمہارے اندر کمار اور شاہو جی کا اب تک پتہ نہیں!''

کھانڈے راؤ نے نہایت اطمینان سے کہا:

''آتے ہوں گے ابھی ذرا دیر میں بختیار اور اس کے ساتھیوں کی کٹی ہوئی گردنیں ہمارے سامنے ہوں گی۔''

دھیان چند نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

''جی بیشک۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر لطف آ رہا ہے کہ سلطان والا شان شہاب الدین غوری جب بختیار کی نعش بے سر دیکھیں گے تو کیا حالت ہوگی اُن کی، سنا ہے بڑے باجلال آدمی ہیں۔ یقیناً غصے میں بوٹیاں نوچنے لگیں گے اپنی، ممکن ہے خودکشی کر لیں!''

کھانڈے راؤ نے بھی ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

''اگر غوری نے خودکشی کر لی تو ہمیں خوشی نہیں ہوگی۔ ہم تو اُسے تلوار سے میدان جنگ میں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دھیان چند اس مرتبہ تمہیں بھی میدانِ جنگ میں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اور دشمن سے مقابلہ بھی کرنا پڑے گا۔''

دھیان چند کا جوش مسرت یہی سن کر کافور ہو گیا اس نے کہا۔

''آپ لوگ کبھی کبھی میدانِ جنگ میں لڑتے ہیں۔ لیکن مجھے ہر روز دن میں بھی اور رات میں بھی وقت کا بڑا حصہ رن میں صرف کرنا پڑتا ہے۔''

''پرتھوی راج نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے اور رومال سے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔''

''کیوں جھوٹ بولتے ہو، تم نے آج تک میدان جنگ میں قدم رکھا بھی ہے۔''

دھیان چند نے دست بستہ مضحک صورت بنا کر کہا۔

''سرکار میری بیوی بڑی جنگ جو ہے ہر وقت مجھ سے لڑا کرتی ہے، وہ تو میں ہی ہوں کہ میدان چھوڑ کر بھاگتا نہیں، میرے بجائے اُسے لے جائیے اور دشمن سے بھڑا دیجئے پھر تماشا دیکھئے، اگر پندرہ منٹ میں دشمن کا سارا لشکر دم دبا کر نہ بھاگ کھڑا ہوا''

کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے۔ قہقہوں کے شور میں دفعتہً ہیم چند آیا۔ یہ ان تین سو سواروں کا سردار تھا جو شاہو اور اندر کمار کی سرکردگی میں بختیار کو قتل کرنے گئے تھے۔ ہیم چند کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھیں سرخ بدن مرتعش، پگڑی غائب، اسے اس حالت میں دیکھ کر دھیان چند کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک پوری محفل پر سناٹا چھایا رہا۔ کسی میں یارائے دم زدن نہ تھا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر شخص کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن الفاظ زبان پر نہیں آتے تھے۔ دل میں ایک اَن جانا سا اندیشہ محسوس ہو رہا تھا۔ آخر پرتھوی راج نے اپنے حواس مجتمع کیے اور باوقار انداز میں پوچھا:

''ہیم چند! یہ تمہارا کیا حال بنا ہوا ہے؟ کیا تم اندر اور شاہو کے ساتھ بختیار کی سرکوبی کے لیے نہیں گئے تھے؟''

ہیم چند سر جھکائے کھڑا رہا، کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کھانڈے راؤ کا اضطراب ناقابل برداشت ہو چکا تھا، اُس نے برہم لہجے میں کہا۔

''جواب کیوں نہیں دیتے ہیم چند، کیا پوچھا جا رہا ہے تم سے، کہاں سے آ رہے ہو تم؟''

دھیان چند کو حالات کی سنجیدگی کا اب تک علم نہیں ہوا تھا، اس نے ہیم چند پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''شاید گھر سے پٹ کر آئے ہو، بھئی واقعہ یہ ہے بیوی بھی عجیب مصیبت ہوتی ہے۔ پتی ورتا ہو گی ایسی کہ شوہر کے پاؤں دھو دھو کر پیے گی۔ اور لڑاکا ہو گی تو شوہر کے لیے موت کا فرشتہ بن جائے گی۔ ہیم چند بھائی اپنا بھی یہی حال ہے۔ تم اپنی بیوی کو چھوڑو میں اپنی بیوی کو چھوڑے دیتا ہوں، ہم دونوں بھائی بہن کی طرح زندگی گزار دیں گے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اس فقرے کی کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج کی طرف سے خوب داد ملتی، لیکن اس وقت حالت دوسری تھی، پرتھوی راج نے خون آشام نظروں سے دھیان چند کی طرف دیکھا، وہ سہم کر دبک گیا۔ پھر اُس نے ہیم چند سے کہا۔

''تم اب تک خاموش کھڑے ہو، ہمارے سوال کا جواب دو کیا کر آئے؟''

ہیم چند بدستور سر جھکائے کھڑا تھا، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہمیں شکست ہوگئی ہمارے بہت سے آدمی کام آگئے۔''

یہ سُن کر کھانڈے راؤ اچھل پڑا، اس نے کہا۔

''کیا بکتے ہو، شاید تم نے ضرورت سے زیادہ شراب پی لی ہے۔ اندر اور شاہو کو مہاراج کے سامنے حاضر کرو۔''

ہیم چند نے گھٹی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''اندر کمار اور شاہو جی......''

پھر اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا، کھانڈے راؤ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، اس نے ہیم چند کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا۔

''سچ سچ بتاؤ، کیا خبر لے کر آئے ہو۔ اگر تم نے جواب نہ دیا یا جھوٹ بولا تو ابھی تمہاری گردن اڑا دوں گا۔''

ہیم چند نے دہشت زدہ نظروں سے کھانڈے راؤ کو دیکھا اور گویا ہوا۔

''وہ دونوں قتل ہو گئے۔''

ایسا معلوم ہوا جیسے حاضرین پر بجلی گر پڑی۔ دھیان چند کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج کی تلے کی سانس تلے اور اوپر کی اوپر رہ گئی، ایک مرتبہ پھر پرتھوی راج نے اپنا ٹوٹا ہوا حوصلہ جوڑ کر ہیم چند سے پوچھا۔

''کیا واقعی اندر کمار اور شاہو جی قتل ہو گئے؟''

ہیم چند نے اسی طرح سر جھکائے سر جھکائے عرض کیا:

''غلام کی اتنی مجال کہاں کہ وہ اپنے آقا کے سامنے جھوٹ بول سکے۔''

پرتھوی راج نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

''تم اپنے ساتھ کتنے آدمی لے گئے تھے؟''

''تین سو ہٹے کٹے مضبوط، توانا، تجربہ کار اور فن کار سپاہی ہمارے ساتھ تھے!''

''دشمن کی تعداد کتنی تھی؟''

''میرا خیال ہے ستر اسی سے زیادہ نہ ہوگی۔''

''پھر بھی تمہیں شکست ہوئی؟''

''بعض دفعہ شکست آکاش سے اترتی ہے مہاراج، کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکست کھاتے، لیکن ہم ہار گئے۔''

''کس طرح! کیونکر؟ ستر اسی آدمی تین سو آدمیوں پر کس طرح غالب آ گئے؟''

''اگر ہم نے جاتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا ہوتا تو یقیناً اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے لیکن اندر کمار نے جاتے ہی بختیار سے باتیں شروع کر دیں، اُلجھ پڑے اور پھر تلوار میان سے نکال کر حملہ کر دیا۔ جس طرح بجلی کوندتی ہے اس طرح بختیار کی تلوار چمکی، اندر کمار قتل ہو گئے، شاہو جی پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں حکم دیا دشمن کو مارلو۔ اور خود بختیار سے لڑنے لگے۔ شاید اندر کمار کے قتل نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ انہوں نے جب تلوار چلائی تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دشمن نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا، اور اپنی تلوار نہایت چابکدستی سے ان کے سینے میں بھونک دی۔ وہ ایک آہ کر کے گرے اور ختم ہو گئے۔ ہمارے سپاہی بہادری کے ساتھ جنگ کر رہے تھے لیکن اندر اور شاہو کے قتل کے بعد ان کا حوصلہ جواب دے گیا، پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر سپاہی جب میدان جنگ سے بھاگتا ہے تو کسی کی نہیں سنتا۔''

پرتھوی راج نے طنز کرتے ہوئے پوچھا:

''اور پھر ان بھاگتے ہوؤں کے ساتھ تم بھی بھاگنے پر مجبور ہو گئے...... کیوں ہیم چند؟''

ہیم چند نے بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا: ''نہیں مہاراج میں بھاگا نہیں، آپ کو خبر دینے آیا ہوں۔''

پرتھوی راج اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے کھانڈے راؤ سے کہا: ''اس کی گردن اڑا دو۔''

کھانڈے راؤ نے اس کی گردن اڑا دی۔

(14)

لڑائی ضرور ہوگی

ہیم چند کی گردن اُڑا دی گئی۔ پرتھوی راج پر اس وقت جلال کی سی کیفیت طاری تھی کہ اگر اس کا بس چلتا تو ساری دنیا کو قتل کر دیتا، اسے ہر چیز سے نفرت ہوگئی تھی اپنے وجود تک سے، اس نے کھانڈے راؤ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کتنی بڑی بدشگونی ہے، ہمارے آدمیوں کا بھاگ آنا، اندر اور شاہو کا قتل ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے کھانڈے راؤ ہم سوچتے ہیں کہیں ہمارا استارہ گردش میں تو نہیں آ گیا۔''

کھانڈے راؤ خود بھی سخت ملول اور دل گرفتہ تھا۔ جو بات پرتھوی راج نے منہ سے کہہ دی تھی وہ اس کے دل میں چور کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک طرف اندر کمار اور شاہو کا غم اس کے دل کے ٹکڑے کیے دے رہا تھا دوسری طرف ایک انجانا سا خطرہ اسے سر پر منڈلاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے پرتھوی راج کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

ایسا خیال نہ کیجئے مہاراج، چند غلام اپنے مہاراج پر قربان ہوئے، چند ہزار اور چند لاکھ بھی اگر قربان ہو جائیں تو یہ ان کا فرض ہے، مہاراج کے دبدبے اور طنطنے میں اس سے کیا فرق آ سکتا ہے۔ باقی اس کا افسوس ضرور ہے کہ ہماری اسکیم ناکام ہوگئی۔

پرتھوی راج پر خیال انداز میں گویا ہوا۔

''صرف اسی بات کا غم نہیں ہے کہ ہماری اسکیم ناکام ہوگئی، زیادہ غم اس بات کا ہے کہ ہم ذلیل ہوئے ہماری سبکی ہوئی۔ ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔''

یہ کہہ کر پرتھوی راج نے دھیان چند کی طرف گھور کر دیکھا اور دانت پیستے ہوئے کہا:

''ہماری اس ذلت کا سبب یہ نمک حرام ہے۔ اس مشیر بے تدبیر کی رائے پر عمل کر کے ہم نے خود اپنے منہ پر کالک مل لی ہے۔ کھانڈے راؤ ہمیں تم سے بھی شکایت ہے کہ تم نے بے سوچے سمجھے اس احمق کی رائے مان لی اور ہمیں ایسے فعل پر آمادہ کیا جس کے نتائج بہت تلخ ہوں گے۔''

پرتھوی راج کے یہ الفاظ سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دھیان چند کی روح قبض کر لی ہے۔ چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ سارے بدن سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے سوچا وہ بھی بہت جلد ہیم چند کے پاس پہنچ جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کھڑے کھڑے دھم سے پرتھوی راج کے پاؤں پر گر پڑا، اور گھگھیا کر بولا۔

''میں بڑا پاپی ہوں مہاراج! بیشک مجھ سے بڑی بھول ہوئی ہے، لیکن بادشاہوں کا دستور ہے کہ اپنے غلاموں کی جان نہیں لیا کرتے۔''

پرتھوی راج نے دھیان چند کے سر پر ایک ٹھوکر لگائی اور الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کھانڈے راؤ کی حالت بھی دھیان چند سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اسے بھی اپنا حال اور مستقبل بہت تاریک نظر آ رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہاراج میرے اور دھیان چند کے قتل کا حکم صادر فرما دیں۔ یکا یک پرتھوی راج نے کھانڈے راؤ سے دھیان چند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''دیکھتے ہو اس بزدل کو، یہ اپنی جان بچانا چاہ رہا ہے، حالانکہ اس کی وجہ سے اندراور شاہو، ہیم چند اور اس کے ساتھی مارے گئے، اسی نے اپنی بے تدبیری سے تمہیں داغ دیا اور ہمیں سرنگوں کیا۔ کیا یہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے بھی ہیم چند کے پاس پہنچا دیا جائے۔''

دھیان چند نے رحم طلب نظروں سے کھانڈے راؤ کی طرف دیکھا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کھانڈے راؤ کو خود اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی اس نے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا۔

''مہاراج کوئی شبہ نہیں، دھیان چند کا بہت بڑا جرم ہے اور اس جرم کی کم سے کم سزا موت ہی ہو سکتی ہے، لیکن......''

پرتھوی راج نے بات نہ پوری ہونے دی:

''لیکن...... کیا تم اس کی سفارش میں کچھ کہہ کر اپنی بات ضائع کرنا چاہتے ہو؟''

کھانڈے راؤ نے سراپا ادب بن کر عرض کیا:

''کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا، مالک اور بادشاہ کی بات ٹال سکے۔ اس پر اعتراض کر سکے۔ اگر دھیان چند کے بارے میں آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے مرنا چاہیے تو یقیناً یہ بہترین فیصلہ ہے اور میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس فیصلے کی

تکمیل میرے ہاتھ سے، میری تلوار سے ہو۔''

''لیکن کیا تم کچھ کہنا چاہتے تھے اس نابکار کے متعلق؟''

کھانڈے راؤ نے اپنے حواس مجتمع کر کے گزارش کی:

''صرف یہ بات کہ دھیان چند کی یہ احمقانہ صلاح، جس کا ہولناک نتیجہ ہمارے سامنے ہے، بہر حال وفاداری، خلوص اور اپنے مہاراج سے بے پناہ محبت پر مبنی تھی۔''

پرتھوی راج کے ماتھے پر بل پڑ گئے، وہ گویا ہوا:

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

کھانڈے راؤ نے اپنے قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''اس نے بختیار کے قتل کا مشورہ صرف اس لیے دیا تھا کہ یہی ایک صورت تھی، جس سے مہاراج اور اس کے خاندان کو رسوائی سے بچایا جا سکتا تھا۔ بختیار کی زبان بندی کی جا سکتی تھی۔ اس سے انتقام لیا جا سکتا تھا۔ وہ یہ نہیں گوارا کر سکا کہ بختیار غزنی جا کر یہ شیخی مارے کہ مہاراج کا انتظام سلطنت اتنا ناقص تھا کہ ڈاکو کسی اور پر ہی نہیں خود مہاراجہ کے ارکین خاندان تک پر دست درازی سے باز نہیں آتے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص خواہ وہ ایلچی ہی کیوں نہ ہو...... رُو در رُو مہاراج کی توہین کرے اور زندہ رہے وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ دشمن ملک کا ایک نمائندہ ہمارے پایہ تخت میں آ کر عزت، ہر دلعزیزی اور وقعت حاصل کرے۔ یہی سب کچھ سوچ کر اس نے ایک ترکیب سوچی، اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو آج ہم سب اسے مبارک باد دیتے، ناکام ہوئی تو اب وہ قتل کا مستحق ہے۔''

بات پرتھوی راج کی سمجھ میں آ گئی، اس نے کہا۔

''ہم اس کی جان بخشی کرتے ہیں لیکن اس سے کہہ دو کچھ دن تک ہمارے سامنے نہ آئے۔''

کھانڈے راؤ نے اشارہ کیا اور دھیان چند اپنی پگڑی بغل میں دبا کر آہستہ آہستہ ذرا دُور جا کر دوڑتا ہوا راج بھون سے باہر نکل گیا۔

دھیان چند کے جانے کے بعد پرتھوی راج نے کہا۔

''اب جنگ یقینی ہے، غوری بپھر جائے گا۔ اب زیادہ سے زیادہ فوج لے کر وہ حملہ کرنے کے ارادہ سے آئے گا۔''

کھانڈے راؤ نے بے پروائی مگر استقلال کے ساتھ جواب دیا:

''آئے گا تو منہ کی کھائے گا۔''

پرتھوی راج نے پرخیال انداز میں کہا:

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہمیں بھی تیاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہیے۔ تاکہ اس مرتبہ ایسی شکست کھا کر واپس جائے کہ پھر بھولے سے بھی ادھر کا رُخ نہ کر سکے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا مہاراج!...... یہ کام کھانڈے راؤ کا ہے، اسے فکر کرنے دیجئے۔ آپ اب آرام کیجئے۔'' کھانڈے راؤ نے جواب دیا۔

پھر پرتھوی راج ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے راحت کدے کی طرف روانہ ہوگیا، جہاں انتظار کرتے کرتے راج بھون کی داسیاں اونگھنے لگی تھیں۔

مہاراج کا معمول تھا کہ داسیوں کے رقص ونغمہ سے لطف اندوز ہونے کے بعد بستر استراحت کا رخ کرتے تھے۔ پرتھوی راج کے جانے کے بعد کھانڈے راؤ کی آنکھیں نہ جانے یکایک کیوں ابل پڑیں اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اب تک وہ ضبط سے کام لے رہا تھا......اب ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

بالائے بام

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صُبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

(1)

انتظار

بختیار کو غزنی سے گئے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے، وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماہ کی زبان خاموش تھی۔ لیکن دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ نہ وہ نشاط و مسرت کی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ نہ وہ قہقہے اور چہچہے، نہ وہ بے بات کی بات پر تبسم ریزیاں، نہ وہ جلوۂ فتنہ ساماں کی تبسم ریزیاں، نہ وہ بے فکری، نہ عیش مسلسل، ہر وقت اس فکر میں ہلکان اور بیمار رہتی کہ بختیار کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا۔ اور یہ سوچتے سوچتے اسے خیال آتا وہ ایک دشمن ملک میں گیا ہے، آدمی من چلا قسم کا ہے۔ کسی سے دبنا اس نے سیکھا ہی نہیں ہے خطروں اور آفتوں کے استقبال کے لیے چشم براہ رہتا ہے، کہیں کسی سے اُلجھ نہ پڑا ہو، کہیں مہاراجہ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دی ہو اور اُسے قتل کر ڈالا گیا ہو!''

سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ سارے بدن میں پسینہ آ جاتا، وہ لاکھ روکتی اور آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں اور پھر وہ اپنے خدائے رحمان و رحیم سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی کہ یا اللہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے، اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا میری زندگی اسے دے دینا، لیکن اسے ہر آفت، ہر مصیبت سے محفوظ رکھنا۔

عاصمہ خاتون ماہ کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ اس کے جذبات و تاثرات کا انہیں پورا پورا اندازہ تھا۔ وہ طرح طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ باتوں باتوں

میں اسے اطمینان دلاتیں کہ بختیار کارِ سرکار سے گیا ہے۔ سفیروں اور ایلچیوں کی جان ہر طرح محفوظ ہوتی ہے۔ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ پھر وہ خوش آئند امیدوں کا سماں کھینچ دیتیں، وہ آئے گا، کامیاب و بامراد واپس آئے گا۔ سلطان کی نگاہ میں پہلے ہی اس کی عزت و عظمت زیادہ ہے۔ اب اس کے لیے ترقیوں اور سرفرازیوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ وہ عروج حاصل کرے گا، ترقی کے زینے طے کرے گا۔ پہلے وزیر بنے گا، پھر وزیر اعظم بنے گا۔ خدا نے اسے بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اب ان کے اُبھرنے اور نمایاں ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

یہ باتیں سن کر ماہ بھی عاصمہ کے دماغ سے سوچنے لگتی۔ وہ بھی ان امیدوں اور آرزوؤں میں شریک ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بختیار کا زریں مستقبل جھلکنے لگتا۔

ایک مرتبہ عاصمہ اسی طرح باتوں باتوں میں ماہ کی افسردگی دُور کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُس نے سوال کیا۔

''آخر وہ اب تک واپس کیوں نہیں آئے، اتنے دن تو ہو گئے؟''

عاصمہ نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا:

''بیٹی، سفارت کی ذمہ داریاں بڑی اہم ہوتی ہیں۔ ایسے کام چٹکی بجاتے ہیں نہیں ہوتے، دیر لگتی ہی ہے، پھر یہ بھی تو سوچ میری بچی۔ کہ ہندوستان کوئی غزنی کا ایک محلہ تو ہے نہیں کہ جب جی چاہا چلے گئے جب مرضی ہوئی واپس آ گئے۔ وہ ایک الگ ملک ہے اور یہاں سے کالے کوسوں دُور، مہینہ بھر سے زیادہ مدت تو وہاں پہنچنے میں لگتی ہے، پھر بادشاہ سیلانی ہوتے ہیں، مہینوں سفیر پڑے رہتے ہیں مگر باریابی کا موقع نہیں ملتا۔ پھر بات چیت شروع ہوتی ہے، اس میں کافی وقت لگ جاتا ہے، اسی طرح واپس آنے میں بھی ایک زمانہ لگ جاتا ہے۔''

ماہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا:

''لیکن ایک زمانہ تو بیت گیا؟''

عاصمہ کو اس بھولے سے اعتراض پر ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔

''بیت گیا تو اب وہ بھی آیا چاہتا ہوگا، ممکن ہے پرسوں تک آ جائے یا شاید ایک ہفتہ لگ جائے؟ میرا دل کہتا ہے اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی!''

اس بات سے ماہ کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوئی، مایوسی کے عالم میں بولی۔

''یہ تو ایک عرصے سے سن رہی ہوں، نہ کل پرسوں آتا ہے نہ ایک ہفتہ ختم ہوتا ہے۔''

عاصمہ نے اسے گلے لگایا، اور پیار بھرے لہجے میں کہا:
''بیٹی تو اس طرح الجھ رہی ہے جیسے میں نے اُسے آنے سے منع کر دیا ہو، آجائے گا بیٹی بہت جلد آجائے گا۔''

ماہ نے پھر ایک معصوم سا سوال کر ڈالا:
''اور اگر نہ آئے؟''

عاصمہ نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔
''تیرے منہ میں خاک۔ آئے گا کیوں نہیں؟''
وہ کچھ سوچتی ہوئی گویا ہوئی۔
''یہ بھی ہو سکتا ہے وہ وہیں رہ جائیں؟''
عاصمہ کو پھر ہنسی آئی۔
''اری پگلی وہاں رہ کر کیا کرے گا؟''
ماہ نے پر خیال انداز میں جواب دیا:
''ہو سکتا ہے کوئی روک لے۔''

کوئی روک لے، کا مطلب سمجھ کر عاصمہ کے لیے پھر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
''بڑی نادان چھوکری ہے، میں کہتی ہوں وہاں اسے روکنے والا کون بیٹھا ہے۔ یہ ملک، غیر مذہب، غیر لوگ یہ چاہیں گے کہ یہ جلد از جلد واپس جائے یا یہ چاہیں گے کہ یہیں رہ پڑے۔ تو جانتی نہیں وہ لوگ مسلمانوں کو اچھوت سمجھتے ہیں۔''
یہ نیا لفظ سن کر ماہ نے دریافت کیا۔
''اماں جی، اچھوت کسے کہتے ہیں، یہ کیا چیز ہے؟''
عاصمہ نے بتایا:
''اپنے علاوہ ہر مذہب کے آدمی کو ہندو ناپاک خیال کرتے ہیں، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے ہیں نہ کھانا کھاتے ہیں۔''
ماہ نے اعتراض جڑ دیا:
''لیکن ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔''
عاصمہ نے یہ بات مان لی اور کہا:

''ہاں بیٹی ہمارے ہاں ایسانہیں ہوتا۔''

ماہ نے پھر سوال کیا:

''کیوں نہیں ہوتا...... ہندو،ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں۔تو ہم کیوں نہ انہیں اچھوت سمجھیں تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔''

ایک معلم کی طرح تشریح کرتے ہوئے عاصمہ نے وضاحت کی:

''نہیں بیٹی...... ہمارااسلام ہرانسان کومساوات کادرجہ دیتا ہے،مذہبی اختلاف دوسری چیز ہے اور انسانیت کا اتحاد الگ چیز۔اور بیٹی ان لوگوں کا تو حال یہ ہے کہ خود اپنے مذہب کو بھی انہوں نے ذات پات کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ایک ذات کا ہندو دوسری ذات کے ہندو کو اچھوت اور ناپاک سمجھتا ہے۔نہ اس کے ہاتھ کا کھانا کھائے گا نہ پانی پیئے گا۔حتیٰ کہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھاسکتا!''

یہ باتیں سن کر ماہ کو بڑی حیرت ہوئی۔

''تو اماں جی پھر وہ کیا کرتے ہوں گے! کس طرح کھاتے پیتے ہوں گے! وہاں مسلمان تو ہیں نہیں!''

عاصمہ نے جواب میں کہا۔

''لیکن وہ اپنے ساتھ تو مسلمانوں کو لے گیا ہے۔اتنی معمولی بات بھی تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں اس کے ساتھ سپاہی، تیغ زن اور تیرانداز گئے ہیں وہاں باورچی، دھوبی اور دوسرے پیشہ ور بھی گئے ہیں۔قاعدہ یہی ہے۔تکلیف، اس کے دشمنوں کو ہو۔جس ٹھاٹھ سے یہاں رہتا تھا اسی آن بان سے وہاں رہا ہوگا اور پھر سفیروں کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جاتا جو اورلوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔''

''ماہ نے سکوت اختیار کرلیا، گویا وہ مطمئن ہوگئی۔''

(2)

شاید آں شہسوار می آید

کئی دن اور گزر گئے۔

ماہ کا یہ معمول تھا کہ ہر روز شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی۔

کوٹھے پر بیٹھ کر وہ راہگزر اچھی طرح نظر آتی تھی، جہاں سے باہر کے قافلے شہر میں آتے جاتے تھے۔

یہاں بیٹھ کر ٹکٹکی لگائے وہ راہگزر کی طرف تکا کرتی۔

شاید بختیار آرہا ہو!

جب بھی گرد اُڑتی دکھائی دیتی وہ ہمہ تن متوجہ ہو کر دیکھنے لگتی کہ کون آرہا ہے پھر جب دیکھتی کہ آنے والا کوئی قافلہ ہے یا تاجروں کا گروہ، یا سپاہیوں کا دستہ تو اس پر اوس سی پڑ جاتی، مایوسی کے بادل چھا جاتے۔

اور پھر ہمہ تن چشم انتظار بن کر وہ راہگزر کو تکنے لگتی۔

یہاں تک کہ جب اندھیرا چھا جاتا تو مایوس و دل گرفتہ، مضمحل اور افسردہ نیچے اتر آتی۔ اور چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر پڑی رہتی۔

ایک روز حسبِ معمول وہ کوٹھے پر بیٹھی راہگزر کا نظارہ کر رہی تھی کہ اسے گرد اُڑتی نظر آئی، دل دھڑکنے لگا، پھر آس پیدا ہوئی کہ ضرور یہ بختیار ہے۔

گرد چھٹی تو سواروں کا ایک دستہ نظر آیا۔

ان سواروں کے آگے آگے ایک اسپ تازی پر بختیار چلا آرہا تھا۔

اتنا لمبا سفر کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر رونق تھی، بشاشت تھی، وہ خوش نظر آرہا تھا۔ ماہ کے دل نے کہا۔ وہ آگئے، کیسے خوش نظر آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے کامیاب آئے ہیں، سلطان ان کی اور زیادہ قدر افزائی کریں گے، اب وہ وزیر بنیں گے، پھر بہت جلد وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن کر دیے جائیں گے۔

ماہ پر اس وقت خوشی کی جنونی کیفیت جاری تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے شہسوار کو جو وقار و عظمت کا پیکر بنا اسپ خوش خرم پر چلا آرہا تھا، دیکھے جارہی تھی۔

آخر گھوڑے کی باگ قصر شاہی کی طرف مڑ گئی۔

یہ دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا ماہ کے دل پر، وہ پھر مغموم ہوگئی۔

''پہلے یہاں کیوں نہیں آئے؟''

لیکن دل نے تسلی دی۔

''یہ بات آداب شاہی کے خلاف ہے، وہ سلطان کے ایلچی بن کر گئے تھے، ان کا فرض ہے سب سے پہلے اپنے شہریار کی خدمت میں حاضر ہوں، انہیں رودادِ سفر سنائیں اپنی سفارت کے واقعات سنائیں۔ پھر اطمینان سے اپنے گھر آئیں۔ وہ سلطان کے ہاں جارہے ہیں بہت جلد واپس آئیں گے۔''

وہ اس وقت تک اپنے شہسوار کو تکتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا۔

پھر اُسے خیال آیا، وہ آگئے ہیں...... سلطان کے ہاں سے یہاں تک آنے میں دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ جاؤں ان کا کمرہ ٹھیک کردوں۔ بستر لگا دوں، اس کے لیے اچھے اچھے کھانے تیار کرا دوں۔ کتنے دنوں کے بعد وہ گھر کا کھانا کھائیں گے!

اماں جی کو یک بیک اُن کے آنے کا حال جب معلوم ہوگا تو وہ کتنی خوش ہوں گی مجھ سے زیادہ بیقراری کے ساتھ وہ ان کا انتظار کرنے لگیں گی۔

یہ سوچ کر وہیں کوٹھے سے وہ اپنی ماں کو خوش خبری دیتی ہوئی اتری۔

''اماں جی...... اماں جی...... وہ آگئے۔''

سیڑھیاں اترتی جاتی تھی اور نشۂ مسرت سے خود ہی الفاظ دہراتی جاتی تھی۔ دوپٹہ ڈھلک کر کاندھے پر آگیا تھا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مست یہی نعرہ لگاتی بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

دفعتہً اُس نے ٹھوکر کھائی۔ پاؤں رپٹا اور وہ قلابازیاں کھاتی، زینہ کی دہلیز پر گر پڑی۔

عاصمہ خاتون نماز مغرب کے لیے وضو کر چکی تھیں، اور مصلے پر کھڑے ہو کر نماز کی نیت باندھنے والی ہی تھیں کہ دھماکہ کی آواز سن کر نیچے مڑ کر دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی کہ ماہ خون میں لت پت زینہ کی دہلیز پر پڑی ہے۔

''ہائے میری بچی!''

کہتی ہوئی وہ لپکی، گھر کی دوسری خادمائیں اور باندیاں بھی دوڑ پڑیں۔ ماہ کا سر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔

عاصمہ نے باچشمِ اشکبار پوچھا۔

''میری بچی یہ کیا ہوگیا؟''

ماہ نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

''گر پڑی۔''

پھر اُس نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا: ''اماں جی وہ آ گئے۔''

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی بے ہوش ہوگئی۔

(3)

حضورِ سلطان میں

بختیار سیدھا قصرِ سلطانی پہنچا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سلطان کو اطلاع کی گئی وہاں سے طلبی کا فرمان صادر ہوا۔ بختیار ایوانِ خاص میں پہنچا تو سلطان دروازے پہ کھڑا بیتابی اور اشتیاق کے عالم میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔

''بختیار تم آ گئے؟''

بختیار نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

''غلام اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔''

سلطان اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ خلوت کدہ میں لایا اور بیٹھ کر اس سے پرسش احوال کرنے لگا۔

''ہاں تو کیا خبر لائے ہو تم؟...... کیا پرتھوی راج راہِ راست پر آ گیا؟''

بختیار نے جواب دیا۔

''نہیں سلطان عالم پناہ اس کا تمرد اور غرور پہلے سے کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے وہ نشۂ نخوت سے مسرت ہو رہا ہے۔ وہ لڑنے پر تیار ہے۔ اس کا حوصلہ اتنا بلند ہے کہ کہہ رہا تھا تم چلو ہم غزنی آتے ہیں۔''

یہ سن کر شہاب الدین غوری کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اُس نے نہایت برہمی کے عالم میں پوچھا۔

''یہ جواب دیا ہے اُس نے ہمارے پیامِ مصالحت کا!''

بختیار نے عرض کیا:

''سلطانِ عالم پناہ وہ کسی اُصول کا قائل نہیں ہے، دنیا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایلچی اور سفیر پر زوال نہیں آتا۔ لیکن اُس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو قتل کرنے کے لیے رات کی تاریکی میں تین سو آدمیوں کا لشکر بھیجا۔

شہاب الدین نے بیتاب ہو کر سوال کیا:

''یہ بزدلی کی انتہا ہے...... پھر تم کس طرح دشمن کے ہاتھ سے محفوظ رہے؟''

بختیار نے عرض کیا:

''سلطان کے غلام دشمن کی کثرت تعداد سے مرعوب نہیں ہوا کرتے۔''

تو کیا تم نے مقابلہ کیا، اور انہیں راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا؟...... (پیٹھ تھپکتے ہوئے) جزاک اللہ، جزاک اللہ!...... بختیار ہمیں تم پر فخر ہے۔''

''غلام نے اُس کے لشکر کے دونوں سرداروں کو بھی قتل کر دیا؟''

''(اور زیادہ خوش ہو کر) شاباش! تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب دشمن کے ہاں صفِ ماتم بچھی ہو گی، دُنیا اس کی نظروں میں تیرہ و تار ہو رہی ہو گی!''

پھر دفعتہً کچھ سوچ کر سلطان نے کہا۔

''تم اپنے ساتھ بڑی اچھی فال لے کر آئے ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مرتبہ انشاء اللہ ہمیں فتح ہو گی۔ اور پہلی شکست کا ہم خاطر خواہ انتقام لے لیں گے...... ہم نے کوشش کی تھی کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ لیکن جب دشمن خودکشی پر تلا ہوا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں......؟ لیکن ہمیں سخت حیرت ہے کہ پرتھوی راج کو یہ کیا سوجھی؟''

بختیار نے دست بستہ عرض کیا۔

''سلطانِ عالم کی حیرت اور بڑھ جائے گی، جب معلوم ہو گا کہ پرتھوی راج نے بزدلانہ اقدام اس شخص کے خلاف کیا جو اس کا محسن تھا۔ جس نے اُس کا ناموس بچایا......''

سلطان زیادہ نہ سن سکا، اس نے سوال کیا:

''کیا تم نے اس پر کوئی احسان بھی کیا تھا؟''

بختیار نے راجکماری نرملا اور راجکماری آشا کا سارا واقعہ سنا دیا۔

شہاب الدین نے اس کا یہ کارنامہ سن کر جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر اس کی پیشانی چوم لی اور شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:

''اب تک ہم تمہاری قدر کرتے تھے، تمہارے ثنا خواں تھے، تمہاری بہادری پر مفتخر تھے، تمہاری وفاداری اور جاں نثاری کو اپنی بہت بڑی اور لازوال پونجی سمجھتے تھے، تمہاری شرافت اور انسانیت کے قائل تھے۔ لیکن آج ہمارے دل میں تم نے بہت احترام پیدا کر لیا ہے، اپنی عزت

پیدا کر لی ہے۔ تم نے وہ کام کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان تھا۔ راجکماری نرملا اور آشا کو ڈاکوؤں کے ہاتھ سے بچا کر تم نے اسلام کی، مسلمانوں کی، انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اور اگر اس کا صلہ تمہیں قاتلانہ حملے کی صورت میں ملا تو یہ بھی تمہاری خوش بختی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن تمہارے مقابلے میں اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے لگا۔''

پھر کچھ سوچتے ہوئے سلطان نے فرمایا:

''کیا تم بتا سکتے ہو، پرتھوی راج نے ایسا کیوں کیا؟''

بختیار نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''سلطانِ عالم پنا میں نے بہت کوشش کی کہ میں اس احسان فراموشی کا سبب معلوم کر سکوں، لیکن میری عقل کام نہیں کرتی۔''

سلطان نے ہنستے ہوئے فرمایا:

''حالانکہ سبب بہت صاف اور واضح ہے، اس واقعہ کے بعد، جیسا کہ تم نے بتایا، اجمیر کے عوام میں غیر معمولی ہر دلعزیزی تمہیں حاصل ہو گئی تھی۔ پرتھوی راج اُسے برداشت نہ کر سکا، اور اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو گا کہ غزنی پہنچ کر اپنا یہ کارنامہ ہم سے ضرور بیان کرو گے۔ اور اس میں پرتھوی راج کو اپنی ذلت نظر آئی ہو گی۔ ذلت سے بچنے کی یہی تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ تمہیں قتل کر دے۔ لیکن یہ بھول گیا کہ ''خدا خود میر سامان است اربابِ توکل را۔'' جو لوگ خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، خدا اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ پرتھوی راج نے بظاہر تمہیں ہلاک کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، لیکن اس کا پانسا الٹا پڑا اور اسے ایک اور بلکہ ہم تو کہتے ہیں پہلے سے کہیں بڑی مات سے دوچار ہونا پڑا۔''

بختیار نے سلطان کی باتیں سن کر عرض کیا۔

''بجا ارشاد ہوا سلطانِ عالم پناہ!''

سلطانِ عالم پناہ نے ارشاد فرمایا:

''تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہاں سے کوچ کی تیاری شروع کر دینا چاہیے۔''

''بے شک!''

ہماری ساری تیاریاں مکمل ہیں، ہم جب چاہیں روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''تو غلام کی رائے ہے کہ ہمیں جلد از جلد کوچ کر دینا چاہیے، قبل اس کے کہ دشمن

ہمارے دروازوں پر دستک دے ہمیں اس کے سر پر پہنچ جانا چاہیے۔''

''ایسا ہی ہوگا میرے عزیز، ایسا ہی ہوگا۔''

''تو سلطان عالم پناہ کب کوچ فرمائیں گے؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں، ہم تو اسی وقت روانہ ہو جاتے۔ یہ باتیں سننے کے بعد اب ہم میں تابِ ضبط نہیں ہے۔ لیکن اتنی بڑی منزل مار کر آئے ہو، چند دن تمہیں ستا لینا چاہیے۔''

''سلطانِ عالم پناہ غلام کی وجہ سے کوچ میں تاخیر نہ کریں۔ غلام بالکل تازہ دم اور چوکس ہے۔ وہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے روانہ ہوسکتا ہے صرف اشارہ کی دیر ہے۔''

''ہم تمہارے اس جذبہ کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔''

''تو غلام نہایت ادب سے لیکن پورے احترام کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ آج نہیں تو کل ہمیں یہاں روانہ ہو جانا چاہیے۔ دشمن کے ساز و سامان کی کوئی انتہا نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس تازہ صدمہ سے دیوانہ ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ غزنی پر چڑھ دوڑے اور غلام کی یہ خواہش ہے کہ جنگ اس کی سرزمین پر ہو!''

''ایسا ہی ہوگا۔ ایک ہفتہ کی تاخیر سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، وہ کتنی ہی تیزی سے آگے بڑھے ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ قبل اس کے کہ وہ ادھر کا رُخ کرے، ہم اُسے جالیں گے...... لیکن چند روز تمہیں ضرور آرام کر لینا چاہیے۔''

پھر ذرا دیر رک کر سلطان نے فرمایا:

''بیچاری عاصمہ خاتون تمہارے لیے بہت فکر مند تھیں۔ ہر دوسرے روز ان کا آدمی تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا کرتا تھا۔ یوں دفعتہً روانہ ہو جاؤ گے تو اس بوڑھی اور غم نصیب خاتون کو بہت صدمہ ہوگا۔ اس کا دل ویسے ہی دُکھا ہوا ہے، ہم اسے مزید صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے، چند روز تم اس کے پاس رہ لو گے وہ خوش ہو جائے گی۔''

بختیار کے لیے اب ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اور گو وہ میدانِ جنگ کی طرف فوراً روانہ ہو جانے کو تیار تھا لیکن خود اس کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ چند روز یہاں گزارے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ جنگ دوسرداروں میں ہے، نہ جانے اس جنگ کا انجام کیا ہو؟......

ہوسکتا ہے کہ سلطان کو فتح حاصل ہو اور میں کام آجاؤں۔ اپنے شاہِ ذی جاہ پر قربان ہو جاؤں۔ اپنے ملک اپنی قوم، اپنے بادشاہ پر قربان ہو جانا بڑی سعادت ہے۔ اور اس سعادت کے حصول پر مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ چند روز ماہ کے ساتھ گزار لوں؟ وہ بھی میرے انتظار میں پریشان ہوگی؟ عاصمہ خاتون میری طلب خیریت کے لیے دوسرے تیسرے دن جو آدمی بھیجتی رہتی تھی اس کا اصل محرک ماہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ مجھے دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ میں اُسے پا کر کتنا خوش ہوں گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کو پا کر نشاط و مسرت کی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ نشاط و مسرت کی دنیا، جہاں کوئی غم نہ ہوگا، کوئی فکر نہ ہوگی، کوئی وسوسہ اور اندیشہ نہ ہوگا، جہاں شمع ہوگی اور پروانہ جہاں چاند ہوگا اور چکور، جہاں حُسن ہوگا اور عشق!

یہ سوچتے سوچتے بختیار کا جی چاہا کہ فوراً اُٹھے۔ اور ماہ سے ملنے کے لیے روانہ ہو جائے۔ لیکن بغیر اذن سلطان کے سامنے سے اُٹھ جانا بھی تو مناسب نہیں تھا۔

لیکن یہ مشکل خود سلطان نے آسان کردی۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور شفقت و عنایت کے لہجے میں کہا:

''اب تم جا سکتے ہو۔''

بختیار نے کہا۔

''بہت خوب غلام جاتا ہے۔''

سلطان نے فرمایا:

''لیکن روز ہم سے ملتے رہو۔''

بختیار نے جواب دیا:

''غلام ہر روز خدمت والا میں حاضر ہوتا رہے گا۔''

(4)

بسترِ علالت

بختیار غوری کے پاس سے رخصت ہو کر امیدوں اور آرزوؤں سے معمور گھر پہنچا۔ لیکن یہاں ایک عجیب افراتفری کا عالم نظر آیا۔ ملازم خاموش، گھر پر سکوتِ مرگ آسا طاری، عاصمہ خاتون پر نظر پڑی تو چہرہ اُترا ہوا، آنکھیں پرنم...... پوچھنا ہی چاہتا تھا کیا بات ہے، سارے گھر پر یہ عجیب قسم کی اُداسی کیوں طاری ہے کہ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بڑھیں اور اُسے شانے سے لگا کر رونے لگیں۔ بختیار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''سب خیریت تو ہے، آپ کی یہ کیا حالت ہو رہی ہے؟''

عاصمہ خاتون کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

''میری بچی۔''

اور پھر رونے لگیں، بختیار نے پھر لرزتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''خدا کے لیے بتایئے کیا بات ہے؟...... ماہ کی طبیعت کیسی ہے؟''

عاصمہ خاتون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بختیار نے انہیں وہیں چھوڑا، اور بھاگتا ہوا ماہ کے کمرے میں پہنچا، وہ نیم بیہوش بستر پر دراز تھی۔ سارا بدن پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ ماہ کو اس حالت میں دیکھ کر بختیار کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ ایک ملازمہ گوہر سامنے کھڑی تھی۔ بختیار نے اس سے پوچھا۔

''گوہر یہ کیا بات ہے......! ماہ کی یہ کیا حالت ہو رہی ہے؟''

گوہر نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا:

''روز آپ کا انتظار کیا کرتی تھیں، ہر شام کو بالا خانے پر جا کر اس رہ گزر کو تکتی رہتی تھیں جدھر سے قافلے آتے ہیں کہ شاید آپ آ رہے ہوں، ہر روز مایوس اور دل شکستہ واپس آ جاتی تھیں۔ آج انہوں نے دیکھا کہ قافلہ آ گیا۔ وہ قافلہ آ گیا، جس کا انتظار تھا۔ آپ گھوڑے پر سوار آ گئے

آگے اور آپ کے ساتھی پیچھے پیچھے، یہ دیکھ کر اپنا طوفان مسرت نہ ضبط کرسکیں۔

بختیار نے بے تاب ہوکر پوچھا:

''پھر کیا ہوا؟...... گوہر بتاؤ پھر کیا ہوا؟ جلد بتاؤ۔ تم چپ کیوں ہو گئیں؟''

گوہر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''آپ کو دیکھ کر وہ طوفانِ مسرت نہ ضبط کرسکیں۔ بڑی بیگم، عاصمہ خاتون، کو خوشخبری پہنچانے اور آپ کے لیے کھانا تیار کرانے، آپ کے رہنے کا کمرہ صاف کروانے کی ہدایت دینے کے لیے تیزی سے بھاگیں، زینہ پر پاؤں دوپٹہ کے دامن میں الجھا اور......اور......''

بختیار نے پوچھا۔

''اور وہ گر پڑیں۔''

گوہر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

''وہ گر پڑیں، کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ دماغ پر زیادہ گہرا زخم آیا ہے۔ حکیم صاحب اپنے ساتھ جراح لے کر آئے تھے مرہم پٹی ہو چکی ہے لیکن......''

بختیار نے سراپا اضطراب بن کر سوال کیا۔

''لیکن گوہر کچھ آگے بھی تو کہو...... کیا حکیم صاحب نے کچھ ناامیدی کی بات کہی ہے؟''

گوہر روتی ہوئی بولی:

''حکیم صاحب کے کہنے کی کیا ضرورت ہے، خود ہی دیکھ لیجئے۔ کیا حالت ہو رہی ہے؟''

اتنے میں پھر غلغلہ پڑا کہ حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ حکیم صاحب تشریف لائے، انہوں نے ایک مرتبہ پھر مریضہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کی، نبض ٹٹولی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''خدا رحم کرے۔''

بختیار نے پوچھا۔

''حکیم صاحب! خدا کے لیے بتا دیجئے، صحت کی امید تو ہے؟''

حکیم صاحب نے ایک عارف کامل کی طرح فرمایا۔

''خدا سے مایوس ہونا مومن کی شان نہیں.....لیکن حالت نازک ہے، بہت نازک ہے۔خون کافی نکل گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبض کمزور ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔''

حکیم صاحب تھوڑی دیر بیٹھے، پھر تسکین اور دل دہی کی باتیں کر کے رخصت ہو گئے، بختیار نے لباس تک نہیں اتارا۔اسی طرح ماہ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

(5)

رازونیاز

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔
بختیار دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا فکر، نہ سونے کا خیال نہ آرام کا ہوش، وہ تھا اور ماہ کا بستر علالت۔ عاصمہ خاتون بار بار آتیں اور اپنی اکلوتی بیٹی پر صدقے قربان ہو کر واپس چلی جاتیں۔ پھر مصلے پر بیٹھ کر گڑگڑا کر خدا سے اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتیں۔ حکیم صاحب آتے، نسخہ بدلتے، نئی نئی دوائیں تیار کراتے، بار بار علاج بدلتے لیکن اس کے تن نیم جان میں زندگی کی رمق نظر نہ آتی۔ بختیار چپ چاپ بیٹھا عالم خیال میں مستغرق یہ مناظر دیکھتا رہتا۔ نہ وہ عاصمہ خاتون سے کچھ کہتا نہ حکیم صاحب سے کچھ پوچھتا، نہ گوہر سے کوئی بات کرتا۔ ٹکر ٹکر ماہ کے نڈھال اور زرد چہرے کو تکا کرتا، وہ پھول سا چہرہ کملا کر کانٹا ہو گیا تھا۔ جس کا چہرہ رعنائی و زیبائی کا پیکر تھا۔ وہ اب بے رنگ اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔
کئی دن کے بعد ماہ نے آج آنکھ کھولی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، پھر اس کی نظر بختیار پر جا کر ٹک گئی، بختیار خوش ہو گیا۔ اس نے جوشِ مسرت سے بے تاب ہو کر کہا:
''ماہ مجھے دیکھو...... میں ہوں بختیار......؟''
ماہ نے حسرت بھری نظروں سے بختیار کو دیکھا، پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی کمزور اور نحیف آواز میں بولی۔
''آپ آ گئے؟!''
بختیار نے بھرائی آواز میں کہا۔
''ہاں میں آ گیا ماہ۔''
وہ رُک رُک کر بولی:
''کتنے دن سے میں آپ کی راہ تک رہی تھی۔''
بختیار نے آگے کچھ نہ کہنے دیا:

''ہاں ماہ میں نے گوہر سے سب کچھ سن لیا ہے۔ لیکن تم نے یہ کیا کر لیا..... تم زخمی کیوں ہو گئیں؟''

''میں اپنے ہوش میں کب تھی۔''

بختیار نے ماہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُسے سہلاتا ہوا محبت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

''ماہ تم بڑی اچھی ہو لیکن بے وقوف! میں کہیں بھاگا جا رہا تھا، لمبی لمبی منزلیں طے کرتا، دریاؤں کو پھلانگتا، صحراؤں کو عبور کرتا، جنگلوں کو قطع کرتا تمہارے ہی لیے تو آیا تھا۔ تم نہیں جانتیں سلطان کے پاس میرا جو وقت صرف ہوا وہ میں نے کس طرح گزارا؟ ایک ایک پل پہاڑ ہو رہا تھا، جی چاہتا تھا پر لگ جائیں اور تمہارے پاس پہنچوں، جلدی جلدی سلطان سے نمٹ کر گھر آیا۔ اور یہاں آ کر میں نے کیا دیکھا؟ اُسے بیان کرنے کی ضرورت ہے! تمہیں دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سر چکرا گیا، ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے بیہوش ہو جاؤں گا۔ بار ہا دل میں ایک خیال آتا تھا، خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا؟..... تو میرا کیا حال ہو گا۔ کیا میں زندہ رہ سکوں گا!''

ماہ اس سے زیادہ نہ سن سکی، اس نے کہا۔

''ایسی باتیں نہ کرو..... میں نہیں سُن سکتی۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عاصمہ خاتون آ گئیں۔ انہوں نے جو ماہ کو ہوش میں اور باتیں کرتے دیکھا تو خوشی سے بے قابو ہو گئیں، ماہ کی بلائیں لیتی ہوئی کہنے لگیں:

''میری بچی..... میری بیٹی اب تیرا کیا حال ہے؟''

ماہ نے کمزور آواز میں جواب دیا:

''اَب تو اچھی ہوں..... اماں اب میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔''

عاصمہ خاتون نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''ہاں خدا نے چاہا تو بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ پھر میں رت جگا کروں گی، جشن مناؤں گی۔ صدقہ کروں گی، خیرات کرونگی..... اور اپنی شہزادی کو دلہن بناؤں گی۔''

ماہ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، وہ شرما گئی..... اُس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ عاصمہ نے بختیار سے کہا۔

''بیٹا تو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ اب تو خدا کے فضل سے ماہ کی حالت ٹھیک

ہوگئی۔ ذرا آدمی بن...... کب سے نہ تو نے آرام کیا ہے، نہ سویا ہے...... اب تجھے آرام کرنا چاہیے۔''

بختیار نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا۔

''میری فکر نہ کرو، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بڑے آرام سے ہوں؟''

(6)

رُخصت سے پہلے

دو دن گزر گئے۔

ماہ کی حالت اب کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ بختیار کے وقت کا بڑا حصہ اسی کے پاس صرف ہوتا تھا۔ ماہ نے باتوں باتوں میں پوچھا:

''سنا ہے آپ پھر کسی مہم پر باہر جانے والے ہیں، کیا واقعی؟''

بختیار نے ماہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اسے سہلاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''ہاں ماہ، دو چار دن میں مجھے غزنی سے باہر جانا پڑے گا۔''

''پھر کوئی خاص مہم سونپی ہے آپ کو؟''

''سلطان بہ نفس نفیس جہاد کرنے ہندوستان تشریف لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ رائے پتھورا راہ راست پر آجائے لیکن وہ اپنی خودسری اور بدعہدی پر اڑا ہوا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ تلوار کے ذریعے فیصلہ کرایا جائے۔''

''کب کوچ ہوگا...... کیا بہت جلد؟''

''ہاں...... زیادہ سے زیادہ دو یا تین دن میں؟''

''اور آپ بھی جائیں گے؟''

''(ایک آہِ سرد کے ساتھ) ہاں ماہ مجھے بھی جانا پڑے گا، لیکن جلد واپس آجاؤں گا!''

''یہی تو آپ نے اس وقت بھی کہا تھا جب مہینہ بھر کو کہہ کر گئے تھے اور چھ مہینے بعد واپس آئے، آپ کے وعدوں کا اعتبار کیا۔''

''وہ دوسری بات تھی...... اس مرتبہ ہم کافی تیاریوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔'' جنگ یقیناً بڑی زبردست ہوگی لیکن ختم بھی جلد ہو جائے گی، دونوں فریق اپنی اپنی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔''

''اور اس جنگ میں آپ سب سے پیش پیش ہوں گے...... بہت بڑے بہادر ہیں نا؟''

''ماہ تم مجھے ترغیب دو، حکم دو کہ میں سب سے پیش پیش رہوں۔ بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا جاؤں، اور میری لاش تمہارے پاس آئے۔ اس پر تمہیں فخر ہونا چاہیے۔ کیا ایک بھگوڑے آدمی پر تم فخر کر سکتی ہو، برداشت کر سکتی ہو؟''

''لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر تو لڑنا چاہیے، بہادری کے یہ معنی بھی تو نہیں ہیں کہ آدمی جلتی ہوئی آگ میں کود پڑے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا ماہ میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ زندگی تو میرے لیے ایک خارستان تھی، ماں کی محبت، باپ کی شفقت، بھائیوں بہنوں کی الفت، کسی چیز میں بھی میرا حصہ نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ دنیا نفرت کی جگہ ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، مجھے زندگی سے نفرت ہوگئی تھی۔ لیکن تمہارے گھر میں قدم رکھنے کے بعد پہلی مرتبہ میرے دل میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوئی، میں نے جانا محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میری زندگی کا صحرا چمنستان بن گیا۔ میں زندگی سے محبت کرنے لگا۔ میرے دل میں زندگی کی قدر پیدا ہوگئی۔''

''افوہ! کتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی آپ نے؟''

''نہیں ماہ، یہ تقریر نہیں ہے، دل کی صدا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ٹھیک بتائیے کب تک واپس ہوں گے آپ؟''

''بس زیادہ سے زیادہ دو تین مہینے ہیں۔''

''ہائے غضب۔ دو تین مہینے تک کیا کرتے رہیں گے آپ؟''

''ایک غیر ملک میں فوج لے کر چڑھائی کرنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے امید ہے جب واپس آؤں گا تو تمہیں بالکل تندرست پاؤں گا، ویسا ہی ہشاش بشاش اور چونچال جیسی کہ بیماری سے پہلے تم نظر آیا کرتی تھیں۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے آپ کے جانے کے بعد میں اور زیادہ بیمار پڑ جاؤں آپ جب آئیں تو مجھے زندہ نہ پائیں۔''

''ایسی باتیں نہیں کرتے...... اس طرح کے خیالات کیوں آتے ہیں تمہارے دل

میں۔''

''نہ جانے کیوں...... لیکن اکثر آتے رہتے ہیں مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے ہر وقت موت کا خیال کیوں رہنے لگا مجھے، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب میں آپ کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گی، یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔''

یہ کہتے کہتے ماہ کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں اور اس کی آواز بھرا گئی۔ بختیار نے بے اختیار ہو کر کہا:

''ماہ آج کیا ہو گیا ہے تمہیں...... ایسی باتیں تو تمہارے منہ سے میں نے کبھی نہیں سنی تھیں۔''

ماہ نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''شاید آنے والے واقعات میری زبان سے بول رہے ہیں۔''

بختیار نے تسلی دی۔

''نہیں...... یہ صرف تمہارا وہم ہے۔ بیماری میں آدمی کی قوتِ متخیلہ بھی بیمار ہو جاتی ہے اور وہ ان ہونی باتیں سوچنے لگتا ہے، تم زندہ رہو گی۔ میں نے حکیم صاحب سے تمہارے بارے میں دریافت کیا تھا۔ کہنے لگے اب خطرہ ٹل گیا، اب مریضہ بہت جلد تندرست ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا کب تک، کہنے لگے انشاء اللہ مہینہ بھر کے اندر غسلِ صحت کی نوید سن لیں گے آپ۔ حکیم صاحب تو جن کے کمالِ فن کا اتنا شہرہ ہے اتنے سراسیمہ نہیں اور تم ہو کہ مایوس ہو جاتی ہو؟''

ماہ نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا:

''اگر میری جگہ حکیم صاحب ہوتے تو شاید وہی کہتے جو میں کہہ رہی ہوں، وہ میرا ظاہر دیکھ رہے ہیں باطن نہیں دیکھ سکتے۔ میری نظر ظاہر پر بھی ہے اور باطن پر بھی، اور میں جانتی ہوں دونوں کے درمیان ہر لحہ فرق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''

یہ باتیں سن کر بختیار بے تاب ہو گیا، اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا:

''ایسی باتیں نہ کرو، تم تو مجھے حواس باختہ کیے دے رہی ہو، آخر کیا تکلیف محسوس کر رہی ہو تم؟''

وہ سنجیدہ لب و لہجہ میں آہستہ سے بولی۔

''تکلیف!...... تکلیف تو کبھی بھی محسوس نہیں ہوتی، یہ تو ہے ظاہری پہلو اور باطنی پہلو

یہ ہے کہ، معلوم ہوتا ہے یہ تنِ نیم جاں عنقریب بے جان ہو جائے گا۔''

بختیار کا اضطراب اور بڑھ گیا، اور دیوانگی کے عالم میں بولا:

''تم زندہ رہو گی۔''

ماہ نے ایک افسردہ تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

''تو مجھے بڑی خوشی ہوگی، اس لیے کہ جہاں تک میری مرضی کا تعلق ہے، میں قطعاً مرنا نہیں چاہتی۔''

''پھر کیوں ایسی باتیں کرتی ہو؟''

''شاید قدرت الفاظ میرے منہ میں ڈال دیتی ہے۔''

''میں تمہارا علاج بدل دوں گا۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''شاید ان کی تشخیص کچھ اور ہو، اُن کے نسخے سے تمہیں آرام آجائے، تمہاری آج کی باتوں سے میں بہت فکرمند ہو گیا ہوں۔''

''فکر سے کیا ہوگا ہے...... خواہ مخواہ کی فکریں مول نہ لیجئے۔''

''یہ خواہ مخواہ کی فکریں ہیں۔ ماہ تم میری زندگی ہو۔ تمہارے بغیر میری زندگی کو معنی نہیں رکھتی۔ اگر خدانخواستہ نہ رہیں تو یہ زندگی پھر وہی بے آب و گیاہ صحرا بن جائے گا۔ جہاں پھول کوئی نہ ہوگا کانٹے ہوں گے۔ جہاں محبت نہ ہوگی نفرت ہوگی۔ بیگانگی ہوگی، اپنایت نہ ہوگی، اسی زندگی سے تنگ آکر تو میں بھاگا تھا۔ پھر مجھے اسی کے حوالے کرنا چاہتی ہو؟''

ماہ نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی:

''انشاءاللہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''کئی دن سے آپ سلطان کے پاس بھی نہیں گئے۔''

''کوئی خاص کام بھی نہ تھا...... انہوں نے مجھے تیاری کا حکم دے رکھا ہے۔''

''مگر آپ نے تو اب تک کوئی تیاری نہیں کی۔''

''سپاہی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جب کوچ کا حکم ہوگا۔ تلوار میری رفیق ہوگی۔ اور سفر شروع کر دوں گا۔''

''کتنا اچھا ہوتا اگر آپ میرے غسلِ صحت کے بعد جاتے۔''

یہ پُراُمید الفاظ سن کر بختیار کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔اس نے والہانہ جوش کے ساتھ کہا۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے...... ہوسکتا ہے۔''

''آپ تو کہہ رہے تھے دو چار دن میں لشکر کوچ کرنے والا ہے اور سلطان نے آپ کو ہر وقت تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے...... میں سلطان سے معذرت کرلوں گا۔''

''یعنی یہ کہ آپ اس فیصلہ کن معرکہ میں اُن کے ساتھ نہیں جائیں گے۔''

''کہہ دوں گا بعد کو آ کر لشکر سے مل جاؤں گا۔لشکر اپنی رفتار سے جائے گا، میں منزلیں مارتا ہوا جب چاہوں گا اُسے جالوں گا۔ پھر ہندوستان جاتے ہی جنگ تو شروع نہیں ہو جائے گی۔ آغاز جنگ سے پہلے کئی مرحلے طے کرنے ہوں گے۔اور ان مرحلوں کے طے کرنے میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی مدت لگ ہی جائے گی۔تمہارے غسل صحت کے انتظار میں اگر رہ جاؤں تو بھی انشاء اللہ وقت پر موقع کارزار میں پہنچ جاؤں گا۔''

بختیار یہ باتیں کرتا جارہا تھا اور ماہ کے زرد چہرے پر نشاط و مسرت کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو ماہ نے کسی حد تک مایوس اور مغموم لہجے میں کہا۔

''لیکن نہ جانے کتنے دن لگ جائیں غسل صحت میں!''

بختیار نے اُسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

''حکیم صاحب امید تو دلا رہے تھے کہ مہینہ بھر میں انشاء اللہ وہ یوم سعید آجائے گا!''

''آپ سلطان سے کیا کہیں گے۔''

''کہہ دوں گا کچھ بھی، وہ میری بات مان لیں گے۔''

''مان تو لیں گے، لیکن نہ جانے کیا خیال کریں گے۔''

''خیال کیا کریں گے؟''

''کہیں یہ نہ سوچیں کہ آپ جنگ سے جی چُرا رہے ہیں!''

''کم از کم میرے بارے میں وہ ایسا نہیں سوچ سکتے۔''

''ممکن ہے دوسرے لوگ یہی خیال کریں!''

''دوسرے لوگ کون؟''

''آپ کے ساتھی...... یہی لوگ تو زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔سازش، لگائی بجھائی،

غیبت ان کا بہترین مشغلہ ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کو ترقی کرتے، عروج پاتے سربلند ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔''

''میں ایسے لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا۔''

''اسی سے تو یہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی سی کر گزرتے ہیں۔''

''یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے، سلطان کی نظر میں آپ نے جو وقعت حاصل کر لی ہے اس نے آپ کے دشمنوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے مجھے سب خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اور یہ دشمن اس تاک میں ہیں کہ کسی طرح بھی سلطان کی نظروں سے آپ کو گرا دیں۔ جب آپ ایلچی بن کر گئے تھے تب بھی اسی طرح کی کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے سلطان کے دل میں آپ کی اتنی جگہ ہے کہ کچھ بنائے نہ بن سکی۔''

''مجھے معلوم ہے، اس مرتبہ بھی یہ اسی طرح ناکام ہوں گے، سلطان کو کسی طرح بھی یہ مجھ سے بدظن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔''

''امید تو مجھے بھی ایسی ہے، لیکن ایسا موقع ہی کیوں دیا جائے کہ یہ سلطان کے کان بھر سکیں۔ بادشاہوں کا مزاج تو آپ جانتے ہی ہیں، گاہے بہ سلامے برنجند، گاہے بہ دشنامے خلعت وہند۔ ہو سکتا ہے مخالفوں کی لگائی بجھائی سے وہ متاثر ہو جائیں، جب کہ موقع بھی ایسا ہی ہے۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ اتنی اہم اور فیصلہ کن جنگ میں آپ کا ساتھ نہ جانا کمزوری یا بزدلی کا نتیجہ ہے۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو، یہ بھی تو معلوم ہو۔''

''میرے غسلِ صحت کا انتظار نہ کیجئے۔ سلطان جس دن کوچ کریں آپ بھی اس دن روانہ ہو جائیے۔ وہ آپ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں کہ اپنے باڈی گارڈ کے طور پر ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں خواہ کتنی ہی معقول وجہ کیوں نہ ہو۔ آپ کی غیر حاضری کو وہ ضرور محسوس کریں گے۔''

''عجیب چیز ہو بھئی ماہ تم بھی...... کبھی کچھ کہتی ہو کبھی کچھ، آخر کروں کیا؟''

''جواب میں نے کہا ہے۔''

یہ کہہ کر ماہ مسکرانے لگی، بختیار نے فکر مند لہجے میں کہا:

''یعنی تمہارے غسلِ صحت کا انتظار نہ کروں؟''

''جی ہاں، جس روز میرا غسلِ صحت ہوگا میں گوہر کے شوہر عادل کے ذریعہ آپ کو اطلاع بھیج دوں گی وہیں خوب خوش ہولیجئے گا۔''

''اچھا، میں تمہاری یہ بات مان لوں گا لیکن ایک شرط ہے۔''

''اب خیر سے آپ بھی شرطیں پیش کرنے لگے۔ کہیے کیا شرط ہے آپ کی؟''

''آئندہ اس طرح کی یاس انگیز باتیں نہ کرنا جیسی آج کی تھیں، تم نہیں جانتیں۔ یہ باتیں سن کر میری کیا حالت ہوگئی تھی۔ سچ کہتا ہوں اب تک دل قابو میں نہیں آیا ہے۔''

''(مسکراتے ہوئے) اچھا آپ کی یہ شرط منظور ہے، بس یا کچھ اور بھی؟''

''ہاں ایک بات اور بھی!''

''(متبسم ہوکر) تو وہ بھی کہہ ڈالیے جلدی سے۔''

''دو چار دن جب تک میں یہاں ہوں، زیادہ سے زیادہ خوش نظر آؤ۔''

''اس کے لیے کی فرمائش کی ضرورت نہیں، جب تک آپ میری نظروں کے سامنے ہیں مجھ سے خوشی کون چھین سکتا ہے۔ غمگین رہنا چاہوں تو بھی نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ...... میرے ہونٹوں پر ہنسی ہے آج کل۔''

''اچھا ایک بات اور......''

''توبہ ہے شیطان کی آنت کی طرح آپ کی باتیں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ وہ ایک بات بھی کہہ چکیے کسی طرح۔''

جب میں رخصت ہونے لگوں تو مسکرا کر، خوش ہو کر مجھے رخصت کرنا، میں چاہتا ہوں اپنے ساتھ تمہارا مسرور ونشاط آفریں تصور لے کر جاؤں، اگر تم اس وقت غمگین اور افسردہ نظر آئیں تو پھر سارے راستے میری طبیعت بے کل رہے گی۔ کیا میری یہ درخواست بھی قبول کرلو گی تم؟''

''(کچھ تامل کے بعد) آپ کی خاطر۔''

بختیار نے ماہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ پھر والہانہ لہجے میں گویا ہوا:

''کتنی اچھی ہو ماہ تم۔''

وہ مسکرانے لگی، پھر گویا ہوئی:

''غلط بیانی سے کام نہ لو، اتنا زیادہ انکسار بھی اچھا نہیں ہوتا، تم ماہِ کامل ہو۔ میں ایک ذرہ بے مقدار۔''

''ایسا نہ کہیئے۔ یوں کہیے، تم ماہِ کامل ہو اور میں خورشید عالم تاب...... ذرہ بے مقدار ہوں آپ کے دشمن!''

اتنے میں گوہر یخنی لے کر حاضر ہوئی۔ ماہ نے تیوری میں بل ڈال کر اسے دیکھا اور پوچھا:

''یہ کیا لے آئیں، ہمیں نہیں پینی یخنی وخنی!''

بختیار نے گوہر سے کہا:

''یہاں رکھ دو ایسے ہی کہہ رہی ہیں، ابھی ذرا دیر میں پی لے گی، ہاں ایسا کرو، ذرا افشردہ انگور تیار کرلاؤ۔ اس سے اور زیادہ تازگی اور توانائی آجائے گی۔''

گوہر نے یخنی رکھ دی اور افشردۂ انگور تیار کرنے چلی گئی، ماہ نے کہا۔

''یخنی آپ پی لیجیے، افشردۂ انگور میں پی لوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، شریر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ بختیار نے کہا۔

''دو چار گھونٹ پی لو، باقی چھوڑ دینا، میں پی لُوں گا۔''

''واہ میرا جھوٹا......''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے! میرے لیے تو وہ آب حیات ہے۔''

یہ کہہ کر بختیار نے یخنی کا کٹورا ماہ کے منہ سے لگا دیا۔ اتنے دنوں سے ہر روز پیتے پیتے اسے کچھ نفرت سی ہوگئی تھی یخنی سے، پھر وہ بختیار کی پیش کش رد نہ کر سکی، منہ بنا کر بڑی مشکل سے دو چار گھونٹ پی کر منہ ہٹا لیا۔

''نہیں۔ اب نہیں پی جاتی۔''

بختیار نے باقی آتش شراب ناب کی طرح غٹ غٹ پینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ عاصمہ خاتون آگئیں۔ انہیں دیکھ کر بختیار سٹ پٹا گیا۔ جلدی سے کٹورا تپائی پر رکھ دیا۔ یخنی کا تلچھٹ اب تک اس میں موجود تھا۔ عاصمہ خاتون کی سمجھ میں نہیں آیا یہ کیا ماجرا ہے۔ کبھی وہ کٹورے کی طرف دیکھتیں کبھی بختیار کی طرف۔ آخر ماہ نے یہ مشکل آسان کر دی۔''

''آپ بھی کتنا ظلم کرتی ہیں ان پر، انہیں یخنی سے اتنا شوق ہے۔ مگر جھوٹوں بھی نہیں پوچھتیں، میں نفرت کرتی ہوں، میرے لیے قدحے پر قدحے چلے آتے ہیں۔''

بختیار کا ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا!''

(7)

یہ کیا ہوگیا؟

سلطان نے دوشنبہ کا دن کوچ کے لیے مقرر کیا۔ سارے لشکر میں زور وشور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ پچھلی مرتبہ شکست اور فرار کا جو داغ لگا تھا ہر سپاہی اپنے دامن سے اسے دھونے کی فکر کرنے لگا۔ جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ پیادہ اور سوار سپاہی اور افسر، کماندار اور سپہ سالار سب ہی بس ایک دُھن میں مست تھے، جنگ!

سلطان اب تک اپنے عہد پر قائم تھا۔ اس نے ہر لذت اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی۔ نہ بستر پر سوتا تھا نہ سر کے نیچے تکیے رکھتا تھا، نہ اچھا کھانا کھاتا، نہ زندگی کی دوسری لذتوں اور راحتوں سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ اس نے اتمامِ حجت کرلیا تھا۔ اور اب جلد از جلد دشمن کے سر پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

کوچ کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔ گلی گلی اور گھر گھر اس کا چرچا تھا۔ جانے والوں کو ان کے عزیز اور دوست مبارک باد دے رہے تھے، ان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور کامرانی وسلامتی کے ساتھ ان کی واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

بختیار یہ خبر سنتے ہی کیل کانٹے سے لیس ہوگیا تھا۔ کل سے دفعتہً ماہ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔ بختیار سے باتیں کرتی ہوئی بیٹھے بیٹھے یکا یک وہ بیہوش ہوگئی فوراً لخلخہ سنگھایا گیا۔ ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں، حکیم صاحب بلائے گئے۔ بڑی دیر بعد ہوش آیا، لیکن اتنی سی دیر میں معلوم ہو رہا تھا جیسے قبر سے نکلی ہے حکیم صاحب نے ویسے تو عاصمہ خاتون کو اور گھر والوں کو ہر طرح سے تسلی دی، لیکن رخصت ہوتے وقت چپکے سے بختیار کے کان میں کہہ دیا۔

''بیٹے، معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے خدا خیر کرے۔''

بختیار کی آنکھوں میں آنسو امڈنے لگے، اُس نے پوچھا:

''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ......''

حکیم صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا۔

''ہاں بیٹا.....خدا کے معاملے میں کون دخل دے سکتا ہے، انسان کا جب وقت آجاتا ہے تو ٹلتا نہیں، مریضہ نے بڑی بہادری سے مرض کا مقابلہ کیا۔لیکن اب ہمت ہار گئی ہے۔''

بختیار کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے.....حکیم صاحب نے دلاسا دیتے ہوئے کہا:

''جوان ہو، مرد ہو، حوصلہ قائم رکھو، اگر تم نے اپنا یہ حال بنالیا تو مریضہ کا کیا حال ہوگا جو بہر حال ابھی زندہ ہے۔اس کی بوڑھی ماں کا کیا حشر ہوگا جسے بہت جلد زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہونا ہے۔

ان باتوں سے صبر تو کیا آتا بختیار کی حالت اور زیادہ متغیر ہوگئی۔ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بیہوش ہوکر گرا چاہتا ہے۔

حکیم صاحب کی رخصت کے بعد وہ گھر کے اندر داخل ہوا ہی چاہتا تھا، کہ سلطانی ہرکارہ افتاں وخیزاں آیا۔اس نے کہا۔

''سلطانِ عالم پناہ نے ابھی اور اسی وقت آپ کو یاد فرمایا ہے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو بختیار فوراً روانہ ہوگیا ہوتا لیکن اس وقت وہ دوسرے ہی عالم میں تھا، اس نے کہا۔

''تم نے خود دیکھا ہے حکیم صاحب ابھی ابھی یہاں سے تشریف لے گئے ہیں مریضہ کی حالت بہت نازک ہے، وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے۔اس وقت میں حاضری سے معذور ہوں۔''

ہرکارہ کو بختیار کی اس حالت پر رحم آیا اس نے استمالت کے لہجے میں کہا۔

''جو کچھ آپ نے کہا ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ سلطان سے عرض کردونگا۔''

بختیار اِس کا شکریہ ادا کرکے ابھی رخصت نہیں ہوا تھا کہ پائگاہ سے سلطانی کا افسرِ خاص گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا، اس نے کہا:

''آپ ابھی تک یہیں موجود ہیں، فوراً چلیے، سلطان نے ابھی یاد کیا ہے؟''

بختیار کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''میں نہیں جاؤنگا۔''

وہ بھی اڑ گیا۔

''کیا تم میں یہ ہمت ہے کہ فرمان سلطانی سے سرتابی کرو، تمہیں چلنا پڑے گا میرے

ساتھ۔''

بختیار نے قبضہ پر ہاتھ ڈال کر کہا:

''تم میری لاش اپنے ساتھ لے جا سکو گے۔''

''افسر بھی آمادۂ جنگ ہو گیا۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو یہی سہی۔''

قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جاتی کہ ایک تیسرا سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اُس نے جو یہ منظر دیکھا تو دونوں لڑنے والوں کے بیچ میں آ گیا، پھر بختیار سے گویا ہوا۔

''میرے دوست! سلطان کے پاس کوئی بڑی اہم اطلاع جاسوس لائے ہیں۔ تمہارے مشورہ کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتے، بڑی بے تابی کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''لیکن میں اس وقت کوئی مشورہ دینے کی سکت اپنے اندر نہیں رکھتا، میرے ہوش وحواس مختل ہو رہے ہیں۔ میرا دماغ معطل ہو رہا ہے۔ حکیم صاحب ابھی یہاں سے تشریف لے گئے ہیں۔ اور جاتے جاتے یہ خوش خبری دے گئے ہیں کہ ماہ کچھ دیر کی مہمان ہے۔ اسے بسترِ مرگ پر چھوڑ کر میں کس طرح چلا جاؤں؟''

سوار نے شفقت اور ہمدردی کے ساتھ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور گویا ہوا:

''واقعی بڑا سخت وقت ہے۔ ایک طرف فرض کی پکار ہے، ایک طرف محبت کا بلاوا! کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے!'' اگر تم محبت کے بلاوے پر لبیک کہتے ہو تو میں اعتراض نہیں کر سکتا۔ خود بھی محبت کر چکا ہوں اور محبت کرنے والوں کے حال سے واقف ہوں، میرے دوست تم فکر نہ کرو، میں جا کر سلطان کو صحیح صورتِ حال واقف کر دوں گا، وہ مشورہ یقیناً کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ سوار دوسرے سواروں کے ساتھ رخصت ہی ہوا چاہتا تھا دفعتاً بجلی سی چمکی، سلطان شہاب الدین سامنے کھڑا تھا۔

سلطان کو دیکھ کر سب پر حیرت اور سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سواروں نے گردن جھکائی اور ادب سے پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان آگے بڑھا، اس نے بختیار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی شفقت وعنایت کے لہجے میں کہا:

''ہم نے تمہیں یاد کیا تھا۔ ہم نے پے در پے کئی آدمی تمہیں بلانے کے لیے بھیجے، مگر

جب تمہارے آنے میں تاخیر ہوئی تو ہم ضبط نہ کر سکے خود آ گئے تمہارے پاس، لیکن یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی، تمہارا چہرہ اتنا زرد کیوں ہے تم پریشان اور فکر مند ہو سکتے ہو۔ کیا تمہاری کوئی ایسی خواہش بھی ہے جو رد ہو سکے؟ بتاؤ بختیار بتاؤ ہم تمہاری ہر آرزو پوری کریں گے؟''

بختیار نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اندر سے شور فغاں اُٹھا۔ اور صدائے ماتم بلند ہوئی سلطان نے متحیر ہو کر سوالیہ نظروں سے بختیار کی طرف دیکھا۔ بختیار نے نہ جانے کس طرح اپنے اوپر قابو پا رکھا تھا۔

''ماہ کا انتقال ہو گیا سلطانِ عالم پناہ!'' اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا، بیہوش ہو کر سلطان کے قدموں پر گر پڑا۔

(8)

موت وحیات کی کش مکش

کئی دن تک بختیار زندگی اور موت کی کش مکش میں گرفتار رہا۔ ماہ کے غم جاناں گداز نے اس کا صبر وقرار چھین لیا تھا۔ عاصمہ خاتون بختیار کا یہ حال دیکھ کر اپنا غم بھول گئیں۔ پھوٹی آنکھ کا دیدہ اب یہی تو رہ گیا تھا۔

آٹھ دس دن کے بعد بختیار کی حالت ذرا سنبھلی اور وہ چلنے پھرنے لگا۔ شہر پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا سلطانی لشکر کوچ کر رہا ہے۔ یہ معلوم کر کے اسے اپنی محرومی پر اور زیادہ صدمہ ہوا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ فوراً میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ عاصمہ خاتون کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو ان کے حواس بجا نہ رہے۔ وہ روتی بلکتی اس کے پاس آئیں اور گویا ہوئیں۔

بیٹے کیا تم بھی میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ تمہارے سوا اس دُنیا میں میرا رہ کون گیا ہے؟''

بختیار نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''آپ میری ماں ہیں، بھلا بیٹا ماں کو بھی چھوڑ کر جا سکتا ہے، ہاں موت مجھے آپ سے چھین لے یہ دوسری بات ہے۔''

موت کا لفظ سن کر عاصمہ خاتون کی جان پر بن گئی۔ انہوں نے بختیار کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''تو زندہ رہے گا، ایسی باتیں کیوں کرتا ہے میرے بچے!''

بختیار نے محبت بھرے لہجے میں عاصمہ خاتون سے کہا:

''مجھے میدان جنگ کی طرف فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔''

عاصمہ خاتون گویا ہوئیں۔

''ہاں بیٹے میں منع تو نہیں کرتی۔ جانتی ہوں سپاہی کی آن میدانِ جنگ ہی سے قائم رہتی ہے۔ لیکن ذرا آئینہ لے کر اپنی حالت کو دیکھئے، ذرا توانائی آجائے طبیعت ٹھیک ہو جائے تو چلے جانا۔''

''نہیں مجھے نہ روکیے میں جاؤں گا، مجھے تو آج ہی جانا چاہیے۔''

''میرا دل دکھا کر، مجھے تم اپنی ماں کہہ چکے ہو، کیا ماں کا دل دکھانا جائز ہے۔''

''مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجئے، اگر میں یہاں رہوں گا تو جس چیز سے آپ ڈرتی ہیں وہ ہو کر رہے گی۔ میں مر جاؤں گا۔ یہاں کے در و دیوار، یہاں کی فضا، یہاں کے صبح و شام مجھے ماہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اور میرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگتی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے یہ غم بھولنے کے لئے اس غم کو سہہ لینے کی سکت پیدا کرنے کے لیے مجھے چلا جانا چاہیے۔''

''لیکن میرے بچے......؟''

''نہیں خدا کے لیے مجھے روکنے کی کوشش نہ کیجئے، میں ایک نیک کام پر جا رہا ہوں۔ ایک اچھا مقصد لے کر جا رہا ہوں۔ خدا کے راستے میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے اگر میری جان کام آ جائے تو کوئی بات نہیں۔ یہ غم جو مجھے گھن کی طرح کھا رہا ہے وہاں جا کر ایک جوش اور جذبے کی صورت اختیار کرے گا۔ مجھ میں ایک نیا ولولہ بھر دے گا۔ دشمن کی سرکوبی میں حصہ لے کر میں اپنے آپ کو پالوں گا۔''

بختیار کی یہ باتیں سن کر عاصمہ خاتون نے سمجھ لیا کہ اب روکنا بے کار ہے یہ جا کر رہے گا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ بات ٹھیک ہی ہے، یہاں جب تک رہے گا غم میں گھلتا رہے گا، لیکن میدانِ جنگ میں پہنچ کر اسے ایک نئی دُنیا ملے گی۔ ممکن ہے وہاں یہ اپنے کھوئے ہوئے وجود کو پالے۔ آخر کافی حیص و بیص کے بعد وہ راضی ہو گئیں۔

عاصمہ خاتون کی اجازت پا کر بختیار نے برق رفتاری کے ساتھ سفر کی تیاریاں شروع کر دیں، اس کا بس چلتا تو اسی روز روانہ ہو جاتا، لیکن ایک بڑے معرکے پر جانا تھا۔ ضروریات سفر فراہم کرنے میں اور سفر کی تیاری میں کچھ نہ کچھ تو وقت صرف ہونا ہی تھا۔ اور بالآخر تیسرے روز ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا عاصمہ خاتون ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتی رہیں، جب وہ گرد میں چھپ گیا تو انہوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا۔

''میرے معبود! اس مسافر کی رکھوالی کرنا، اسے چشم زخم سے بچانا، اسے کامیاب و کامران واپس لانا۔''

بختیار لمبی لمبی منزلیں سر کرتا، ہمت کا توشہ اور حوصلے کا سہارا لے کر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ جیسے سمندر میں مل جانے کے لیے دریا پیچ و تاب کھاتا، چٹانوں سے سر ٹکراتا رواں دواں نہ رکنے والے جوش کے ساتھ بہتا ہے۔

(9)

قاسم

بختیار کے ساتھ جو دستۂ فوج جا رہا تھا، اس کا ایک افسر قاسم بھی تھا۔ قاسم، بختیار کو بہت عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتا تھا، دونوں میں ہم مذاقی کی وجہ سے بہت جلد گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ قاسم بختیار کی دلیری، جرأت اور عزم و حوصلے کا پرستار تھا۔ بختیار بھی قاسم کے خلوص، اپنائیت اور وفاداری کا دل و جان سے قائل تھا، کئی دن کے بعد راستہ چلتے چلتے ایک پہاڑ کے دامن میں شام ہونے کے بعد اس چھوٹے سے قافلے نے حسب معمول پڑاؤ کیا۔ رات کے کھانے کے بعد قاسم اور بختیار میں بات چیت شروع ہو گئی۔ قاسم کہنے لگا:

''وطن پھر وطن ہوتا ہے، اس کی یاد کسی طرح نہیں بھولتی، اس کی کشش برابر دامن دل کھینچتی رہتی ہے۔''

بختیار نے زیر لب تبسم کے ساتھ پوچھا:

''معلوم ہوتا ہے گھر بہت یاد آ رہا ہے؟''

''ہاں بھئی بات تو یہی ہے۔''

بختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوا:

''ہاں بھئی تمہیں حق ہے اس طرح کی باتیں کرنے کا، میں جانتا ہوں کون سی کشش ہے جو تمہارا دامن اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کس کی یاد ہے جو تمہیں ستا رہی ہے۔''

ان الفاظ میں جو درد پنہاں تھا اُسے قاسم نے محسوس کر لیا، اس نے ہمدردی اور دل دہی کے لہجے میں کہا۔

''بختیار تمہیں اپنی حالت بدلنی پڑے گی، خدا نے تمہیں بڑی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ دنیا میں رہ کر تمہیں بہت سے شاندار کارنامے انجام دینا ہے۔ تمہیں قسمت کے سامنے سر نہیں جھکانا ہے۔ خود ہی اس کی تعمیر کرنی ہے بے حوصلگی کی باتیں چھوڑ کر آدمی بنو، کچھ کر کے دکھاؤ؟''

بختیار بے پروائی سے قاسم کی باتیں سنتا رہا، پھر کہنے لگا:

''ہاں میرے دوست اسی لیے جارہا ہوں کہ کچھ کر کے دکھاؤں۔''

قاسم جواب سے خوش ہوگیا۔

''ہم سب کو تم سے ایسی ہی امید تھی مجھے یقین ہے جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر تم واپس آ ؤ گے، تمہارا مستقبل اور زیادہ شاندار ہو جائے گا۔''

زہر خند کرتے ہوئے بختیار نے کہا۔

''سرخرو تو ضرور رہوں گا، لیکن مستقبل! وہ تو میرے ساتھ ترادری کے میدان میں دفن ہوگا۔''

قاسم اپنی جگہ اچھل پڑا۔

''بختیار یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟''

بختیار نے بغیر کسی تاثر کے اظہار کے کہا:

''وہ باتیں جو ہونے والی ہیں میرے دوست اب میں زندہ نہیں رہوں گا، اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا؟''

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

''زندگی کے اور زندہ رہنے کے ولولے ماہ کے ساتھ ختم ہوگئے۔ اب زندگی میرے لیے ایک بے معنی لفظ ہے۔ اب زندگی میرے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے۔''

قاسم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

''پھر وہی دیوانوں کی باتیں۔''

بختیار نے جواب میں کہا:

''میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے لیے شہادت کا سروسامان بہم پہنچادیا، ماہ کے غم میں خودکشی کر لینا ایک غیر اسلامی ہوتا۔ اللہ نے اس گناہ سے بچالیا، موت اب بھی ملے گی لیکن اسلام کے راستے میں۔''

قاسم بحث کرنے پر تل گیا۔

''کیا خدا کے راستے میں انسان شہید ہی ہوتا ہے، غازی نہیں بنتا؟''

بختیار نے جواب دیا:

''کیوں نہیں بنتا، آؤ ہم تقسیمِ عمل کرلیں۔ غازی تم بننا، شہید مجھے بننے دو۔ قاسم تم اندازہ نہیں کر سکتے ہو میرے لیے کتنی خوش گوار چیز ہے، لوگ زندگی پر جان دیتے ہیں میں موت پر مرتا ہوں۔''

''پسند اپنی اپنی۔''

بختیار کی ان باتوں سے قاسم پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بختیار پر بھی اس وقت کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ پھر اس نے کوئی بات چیت نہیں کی۔ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔ قاسم تھوڑی دیر کے بعد سو گیا۔ لیکن بختیار کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ عالم خیال کی سیر کر رہا تھا۔ اسے ماہ یاد آ رہی تھی اسے اپنی ناکامیوں اور حسرتوں پر رونا آ رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا۔ ماہ کو کھو کر میں نے سب کچھ کھو دیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے، کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ نہ دل، نہ دماغ، نہ ہوش نہ حواس، نہ عزم، نہ حوصلہ، حالانکہ مجھے اپنے دل ودماغ پر ناز تھا، وہ ناز بھی چھن گیا۔ وہ چیز بھی چھن گئی۔

بڑی دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی ماہ کا خیال آتا تھا کبھی عاصمہ خاتون کی مضمحل افسردہ اور سوگوار صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی۔ اسی پیچ وتاب اور سوز وساز میں ساری رات گزر گئی اور وہ ایک پل کے لیے نہ سو سکا۔

صبح کی اذان سن کر بستر سے اُٹھا اور نماز میں شرکت کے لیے دوسرے خیمہ میں پہنچ گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد پھر کوچ کی تیاری شروع ہوگئی۔ قاسم نے کہا:

''اب ہم منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ غالباً دو تین دن میں سلطان کے لشکر سے جا ملیں گے!''

بختیار نے تائید کی۔

''ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

قاسم کی نگاہ بختیار کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس نے نگاہِ غور سے اسے دیکھا اور سوال کیا:

''بختیار کیا تم رات سوئے نہیں تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟''

بختیار نے بات کو ٹالتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی۔''

قاسم بہت زیادہ ہمدردانہ لہجے میں گویا ہوا۔

''آج ہم کوچ ملتوی کیے دیتے ہیں، تم آرام کرلو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔''

بختیار نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

''نہیں میرے دوست میں اتنا خوش قسمت کہاں کہ بیمار پڑ جاؤں۔ میں تندرست ہوں اور تندرست رہوں گا، کوچ ملتوی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر اسی طرح ہر آدمی کے لئے کوچ ملتوی ہوتے رہیں تو یہ جنگ جیتی جا چکی۔''

''قاسم نے دیکھا یہ شخص کسی کی ماننے والا نہیں ہے وہی کرے گا جو فیصلہ کر چکا ہے لہٰذا پھر اس نے کوئی بحث نہیں کی۔''

حق و باطل کی جنگ

بجلی گری کہ فوج پہ تیغِ دوسر گری
کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری
سرکاٹ کے ادھر سے جو اُٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہوگئیں
اک آن میں صفوں کی صفیں خاک ہوگئیں

(1)

زبیر سنگھ

بختیار جاتے وقت جو زخم پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کے دل پر لگا گیا تھا اُسے مندمل کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی، یہ کہ جلد از جلد جنگی تیاریاں مکمل کرلی جائیں اور ہندوستان کی سرحد یا غزنی کی حدود میں سلطان شہاب الدین غوری کو ایسی شکست دی جائے جو اس کے لیے عبرت انگیز اور دوسروں کے لیے سبق آموز ہو۔

اندر کمار اور شاہو جی کے قتل کے چند روز بعد پرتھوی راج نے ایک دفعہ پھر مجلسِ مشاورت منعقد کی جس میں کھانڈے راؤ اور دوسرے سرداران فوج شریک تھے پرتھوی راج نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مختصر لیکن ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس نے کہا۔

''ہم نے ترادری کے میدان میں شہاب الدین غوری کو شکست دی۔ یہ یادگار شکست تھی۔ لیکن شہاب الدین ہارنے کے باوجود شکست تسلیم کرنے پر اب تک تیار نہیں ہے۔ اس نے

ہمارے پاس ایلچی بھیجا اور ایلچی نے سلطان کی نمائندگی کرتے ہوئے ہماری توہین کی، ہمیں ذلیل کیا، ہمیں مشتعل کیا۔ اگر سفیر کا قتل کرنا جائز ہوتا تو ہم اسے ضرور قتل کر دیتے، وہ اپنی جان بچا کر یہاں سے چلا گیا۔ ہم نے اس کا راستہ نہیں روکا وہ یقیناً شہاب الدین کے جذبۂ جنگ کو اور زیادہ ابھارے گا۔ پچھلی شکست کا داغ دھونے کے لیے وہ پوری تیاری کے ساتھ میدان میں آئے گا۔ جس طرح ہم نے پچھلی مرتبہ شکست دی تھی اب بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ جنگ شہاب الدین اور پرتھوی راج کی نہیں یہ جنگ دو قوموں کی ہے۔ دو ملکوں کی، دو تہذیبوں کی ہے۔ اس جنگ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو حصہ لینا چاہیے اس جنگ میں ہر والیِ ریاست کو، ہر مہاراجہ کو اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہونا چاہیے۔ ہم اس جنگ کو فیصلہ کن طور پر لڑنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں چاہتے کہ شہاب الدین کو شکست دیں، اسے قتل کر دیں اس کی فوج کے پرخچے اڑا دیں، ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم جنگ اس طرح لڑیں کہ پھر ہندوستان کی طرف کوئی غیر ملکی فرمانروا نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔

''ہمارا جہاں تک تعلق ہے بڑی حد تک ہماری تیاریاں مکمل ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا تنہا اس جنگ کو سر کرنے کا فخر حاصل کرنا نہیں چاہتے، ہماری خواہش ہے کہ اس فخر میں ہندوستان کا ہر راجہ اور مہاراجہ شریک ہو۔''

تقریر ختم کرنے کے بعد پرتھوی راج نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی، گویا ان کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کھانڈے راؤ اٹھا اور اس نے زمین ادب کو بوسہ دے کر کہا۔

''مہاراجہ نے جو کچھ فرمایا اُسے ہم نے دل کے کانوں سے سنا، بے شک یہ جنگ مہاراجہ پرتھوی راج اور شہاب الدین کی نہیں ہے دو قوموں کی جنگ ہے، اس جنگ میں ہندوستان کے ہر سر برآوردہ شخص کو حصہ لینا چاہیے۔''

پرتھوی راج نے مسکراتے ہوئے کھانڈے راؤ سے سوال کیا:

''لیکن یہ بھی تو بتاؤ ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں کو اس جنگ پر آمادہ کرنے کی ترکیب کیا ہے؟''

کھانڈے راؤ نے سر پُرغرور اونچا کیا اور کہا۔

''کیا اس ملک میں کوئی ایسا فرماں روا بھی ہے جو ہمارے مہاراج کی دعوت عمل پر لبیک نہ کہے، اور اگر کوئی ایسا سر پھرا موجود ہے تو کیا مہاراج کی فوجیں غوری سے پہلے اس کا قلع قمع نہ کر دیں گی؟''

پرتھوی راج نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوا۔

''ٹھیک کہتے ہو لیکن کھانڈے راؤ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے، نہ کسی کو جبر اور دباؤ کے ساتھ شریک کرنے کا ہے۔ جو لوگ مجبور ہو کر میدانِ جنگ میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گے وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکیں گے۔ پس ضرورت اس کی ہے کہ دوستانہ اور مخلصانہ تعاون حاصل کیا جائے۔''

حاضرین میں سے ایک شخص زبیر سنگھ سامنے آیا اور کہا۔

''مہاراج کا خیال بالکل درست ہے، ہمیں مخلصانہ اور دوستانہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور یقیناً اس کوشش میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔''

پرتھوی راج نے زبیر کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں کے پاس ہمارا پیام لے کر کون جائے گا؟''

جواب کسی نے نہیں دیا۔ لیکن بے ساختہ سب کی نظریں کھانڈے راؤ کی طرف اُٹھ گئیں۔ پرتھوی راج نے اپنے سوال کا جواب پالیا۔ لیکن اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

''کھانڈے راؤ یقیناً اس کام کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے وہ ہمارا بھائی ہے، دوست ہے، قوت بازو ہے، اس پر ہمیں اتنا ہی اعتماد ہے جتنا خود اپنے آپ پر، لیکن اگر اسے اس کام پر روانہ کیا جائے تو ہماری جنگی تیاریاں نامکمل رہ جائیں گی۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ جب تک دوسرے والیانِ ریاست اپنی فوجیں لے کر آئیں اس وقت تک ہم بھی اپنی جنگی تیاریاں مکمل کر لیں اور یہ کام صرف کھانڈے راؤ ہی کر سکتا ہے...... زبیر سنگھ کیا تم ہمارے ایلچی بن کر بھارت کے راجاؤں کے پاس جانے کو تیار ہو؟''

زبیر نے فخر اور مسرت کے ساتھ جواب دیا:

''بیشک مہاراج یہ غلام اس کام کا بیڑا اٹھانے کو تیار ہے۔''

پرتھوی راج اس جواب سے خوش ہو گیا، اس نے کہا:

''تمہاری ذات سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ تمہاری بہادری، تمہاری قوت گویائی، تمہاری سحر طرازی، یہ سب چیزیں تمہاری کامیابی کی ضامن ہیں۔ اور ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور ہندوستان کے والیان ریاست کو ہمارے جھنڈے تلے جمع کر دیا تو ہماری مہربانیاں تم پر بہت زیادہ ہو جائیں گی، ہم تمہیں ایسا انعام دیں گے جو تمہاری توقع اور آرزو سے کہیں زیادہ ہوگا!''

پرتھوی راج کے یہ الفاظ سن کر زبیر کا چہرہ جوش مسرت سے گلنار ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ

انعام نرملا کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس نے نرملا کو دیکھا تھا، اس نے حسن و جمال پر دہ دل و جان سے فریفتہ تھا۔ لیکن حرفِ مطلب زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک شریف اور معزز گھرانے کا فرد تھا۔ دولت مند تھا فوج میں ایک بڑے عہدہ پر فائز تھا۔ کئی اہم معرکے سر کر چکا تھا۔ مہاراجہ کا منظور نظر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں یہ ہمت نہ تھی کہ نرملا کا نام زبان پر لا سکتا، وہ بہت اونچی تھی، اس کی پہنچ سے بہت زیادہ اونچی، اس کی تمنا کرنا ناممکن کی آرزو کرنا تھا۔ نہ جانے کتنے راجہ اور مہاراجہ اس شمع حسن کے پروانے نہ جانے کتنوں کی طرف سے عرض والتجا کے ساتھ شادی کے پیام آچکے تھے اور نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیے گئے تھے۔ ان حالات میں اس کے لیے یہ سوچنا بھی ناممکن تھا کہ نرملا اس کی ہوسکتی ہے۔ لیکن آج قسمت زروں پر تھی، بے مانگے دل کی مراد پوری ہو رہی تھی اُسے یقین تھا جس مہم پر وہ جا رہا ہے اسے جیت کر آئے گا اور پھر نرملا اس کی ہوگی۔

زبیر نے گردن جھکا کر عرض کیا۔

''غلام پر مہاراجہ کے بے انتہا احسانات ہیں، وہ انعام کی طلب اور صلہ کی ہوس لیے بغیر اپنا فرض انجام دے گا۔''

پرتھوی راج نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''ہمیں تم سے یہی امید تھی۔''

اور پھر ذرا دیر تامل کے بعد پوچھا۔

''تم کب تک روانہ ہوسکتے ہو؟ کتنے دن چاہئیں تمہیں تیار ہونے میں۔''

جوش سے بے قابو ہو کر زبیر نے جواب دیا:

''ایک منٹ بھی نہیں، غلام ابھی اور اسی وقت روانہ ہوسکتا ہے۔''

پرتھوی راج نے تحسین وستائش کی نظروں سے اُسے دیکھا اور بڑے نرم لہجے میں کہا:

''تو پھر کل چلے جاؤ۔''

زبیر نے سر جھکا کر عرض کیا:

''بہت خوب!''

(2)

صحن باغ میں

رات کا وقت ہے، چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، نرملا اور آشا راج بھون کے پائیں باغ میں گلگشت کر رہی ہیں۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شاخ گل کی طرح لچکتی سیر چمن میں مصروف ہیں، تھوڑی دور چلنے کے بعد آشا نے کہا۔

''بھئی ہم تو تھک گئے، ذرا دیر بیٹھو ستالیں۔''

نرملا نے آشا کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''بڑی کم ہمت ہو، دس قدم چلیں اور تھک گئیں۔''

آشا نے ہونٹ پر انگلی رکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا:

''ایسا نہ کہو، نزاکت کی توہین نہ کرو، اگر میں بھی تمہاری طرح پہلوان ہوتی تو رات بھر یہاں کا چکر لگاتی اور نہ تھکتی، لیکن میں ٹھہری دھان پان، نازک اندام، اگر میں بھی دس قدم چلنے کے بعد نہ تھکوں تو کیا آسمان سے پریاں آئیں گی نزاکت دکھانے۔''

نرملا ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔

''اوہو تو آپ دھان پان اور نازک ہیں، کتنے پھولوں میں تلتی ہیں روز؟''

آشا کے پاس جواب تیار تھا۔

''گلاب کا ایک پھول کافی ہوتا ہے۔''

نرملا نے یک بیک سنجیدہ ہو کر پوچھا:

''آشا تم نے کچھ اور بھی سنا؟''

آشا نے ایک پھول توڑ کر سونگھتے ہوئے کہا:

نہ جانے ہر روز کیا کیا سننے میں آتا رہتا ہے، کوئی خاص بات ہو تو بتاؤ؟''

نرملا نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا:

''زبیر کو جانتی ہو تم۔''

آشا نے جھوٹ موٹ بگڑتے ہوئے جواب دیا:

مجھے کیا ضرورت ہے غیر مردوں کو جاننے کی، لیکن یک بیک اس وقت زبیر کی یاد کیوں آ گئی۔ کیا اس غزنی کے رہنے والے خلجی کی جگہ زبیر کو دے رہی ہو؟''

نرملا سچ مچ بگڑ گئی۔

''آشا اگر ایسی باتیں کرو گی تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی، کبھی نہیں بولوں گی۔''

آشا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور خوشامد کرتے ہوئے کہا:

''معاف کر دو نرملا میں نے تو یونہی ہنسی میں ایک بات کہہ دی تھی۔ لیکن بتاؤ تو سہی زبیر کا معاملہ کیا ہے۔ ضرور کوئی خاص بات ہے مجھے تم یہاں یہی کہہ کر لائی تھیں کہ ایک خاص بات کہنی ہے تجھ سے، کیا وہ یہی بات تھی۔''

نرملا نے کچھ سوچتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا:

''ہاں آشا اب میری حیثیت یہ ہوگئی کہ میں دوسروں کو انعام میں عطا کی جاؤں۔''

آشا چونک پڑی اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:

''کیا کہتی ہو نرملا، کچھ دماغ چل گیا ہے تمہارا؟''

ایک ٹھنڈی سانس لے کر نرملا بولی۔

''واقعی میرا دماغ چل گیا ہے، میں پاگل ہو جاؤں گی یا زہر کھا لوں گی، آشا یہ نہ سمجھو کہ میری باتیں دیوانے کی بڑ ہیں، میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔''

آشا کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی، وہ یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''کیا سنا ہے آپ نے! مجھے بھی تو بتاؤ؟''

نرملا نے آشا کو بتایا کہ مہاراج مہارانی سے کہہ رہے تھے کہ نرملا کی شادی کی تیاریاں کرو۔

آشا نے سراپا حیرت بن کر پوچھا۔

''کیا واقعی...... محل میں تو کسی کو بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گا، مہاراجہ سلطان شہاب الدین سے آخری اور فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ ہندوستان کے تمام والیان ریاست کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر کے یہ لڑائی لڑیں گے۔ زبیر کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ بھارت کے راجوں مہاراجوں کو بڑے مہاراج کے قدموں میں لا کر جمع کر دے، اور پھر سب مل کر غوری کو شکست دیں۔ مہاراں

نے زبیر سے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ کامیاب واپس آیا تو اسے اتنا بڑا انعام دیں گے جو اس کی آرزو اور تمنا سے بھی زیادہ ہوگا۔ آشا وہ انعام نرملا ہے۔''

''آشا کو نرملا کی بات پر یقین نہ آیا، وہ بولی، تمہیں تو بات کا بتنگڑ بنانے کی عادت ہے۔ کہیں انعام میں راجکماریاں بھی دی جاتی ہیں۔ زبیر نے اگر یہ کام کر لیا تو ممکن ہے ہمارے مہاراج اسے کوئی جاگیر بخش دیں، کوئی بڑا عہدہ عطا کر دیں۔ وزیر بنا دیں، سپہ سالار بنا دیں۔ لیکن تحفہ کی صورت میں تمہیں بخش دیں، یہ بات نہ مہاراجہ کر سکتے ہیں نہ میں یقین کر سکتی ہوں۔''

نرملا نے اور زیادہ سنجیدہ ہو کر سرگوشی کے لہجے میں کہا:

''آشا میں جھوٹ نہیں کہتی میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، وہ مہارانی سے یہی کہہ رہے تھے، مہارانی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بڑی خوشی سے اس تجویز کو منظور کر لیا، آشا میں جھوٹ نہیں کہتی میں نے خود سب کچھ اپنے کانوں سے سنا ہے۔ کیوں آشا، کیا یہ انصاف ہے؟ کیا ہم راج محل کی رہنے والی راجکماریوں کی حیثیت صرف اتنی ہی ہے کہ ہمارے سرپرست اور بزرگ جس کے ہاتھ میں چاہیں ہمارا ہاتھ پکڑا دیں، کیا ہم کچھ نہیں بول سکتے؟ اپنے مستقبل کے بارے میں ہماری آواز کوئی وزن نہیں رکھتی! ہماری رائے کی ذرا بھی اہمیت نہیں ہے، پھر ہم میں اور باندیوں میں کیا فرق ہوا؟ وہ خریدی جاتی ہیں بیچی جاتی ہیں۔ اس خرید وفروخت میں خود ان کی رائے کا ذرا بھی دخل نہیں ہوتا، جو چاہے خریدے۔ وہ بک جائیں گی، جو چاہے بیچ دے وہ خرید لی جائیں گی، کیا بالکل یہی حالت ہماری نہیں ہے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں ہماری حالت کچھ اور زیادہ بدتر ہے۔ ان کی خرید وفروخت تو ہوتی ہے۔ ان کے دام تو لگتے ہیں، ان کی بولی تو دی جاتی ہے۔ مگر ہمارے ساتھ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا بھی نہیں ہے۔ مہاراجہ نے ایک شخص کو کسی کار اہم پر مامور کیا، اور فرما دیا، اگر تو کامیاب و کامران واپس آیا تو ہمارے محل میں رہنے والی ایک بے زبان مخلوق تجھے انعام میں مل جائے گی۔

''یہ کیا بات ہوئی آشا؟''

آشا سوچ میں پڑ گئی، کچھ دیر تک اس کا سکوت عالم طاری رہا پھر وہ بولی:

''یہ تو بڑی بری خبر سنائی ہے تم نے۔ اندر کمار سے پیچھا چھوٹا تھا کہ یہ نئی بلا آدھمکی۔ مہاراج نے اگر زبیر کو قول دے دیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔ ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔''

نرملا نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا:

''کیا تمہارے پاس بھی مایوسی کے سوا کچھ نہیں!'' (جوش کے ساتھ) آشا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں جس کی ہو چکی ہو چکی۔ اب کوئی اور مرد میرا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک میں زندہ ہوں مہاراجہ کی بات اگر پتھر پر لکیر ہے تو نرملا بھی قول کی دھنی ہے۔ وہ اگر اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے تو نرملا کا فیصلہ بھی نہیں بدلا جا سکتا۔''

آشا نے بہت زیادہ پریشان اور دل گرفتہ ہو کر کہا:

''بھئی یہ تو بڑی مشکل پیش آ گئی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ نہ مہاراج کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ نہ تمہاری رائے بدلی جا سکتی ہے۔ دونوں ایک سے ایک بڑھ کر ضدی ہیں۔ میں تو حیران ہوں آخر اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا؟''

نرملا نے ایک پھول کو ہاتھ میں اچھالتے ہوئے کہا:

''کم از کم میں تو انجام کے بارے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوں۔''

آشا نے جل کر کہا:

''ہاں تمہیں تو بہت آسان نسخہ معلوم ہے۔ زہر کھا کر جان دے دوں گی، کیوں؟''

نرملا بولی:

''تو اور کیا کروں گی، کیا تمہاری رائے ہے ڈولے میں بیٹھ کر زبیر سنگھ کے گھر چلی جاؤں؟''

آشا نے شوخ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تو کون سا غضب ہو جائے گا، کیا وہ خوبصورت نہیں ہے، سچ کہتی ہوں ایسا بانکا نوجوان میری نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔''

نرملا مسکراتی ہوئی گویا ہوئی۔

اس انتخاب لاجواب پر میری دلی دعائیں قبول کرو۔''

آشا نے چڑتے ہوئے کہا:

''دیکھو میرے منہ نہ لگنا مجھ سے برا کوئی نہیں ہے۔''

نرملا ہنسنے لگی۔

ذرا دیر خاموش رہ کر آشا کہنے لگی۔

''سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جن صاحب پر تم ہزار جان سے فریفتہ ہو وہ اتنے

بھولے اور سیدھے سادے ہیں کہ اب تک یہی نہ سمجھ سکے ان سے کوئی محبت کرتا ہے۔ یہ بھی تو سوچو ایسے شخص سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ پہاڑسی زندگی تم صرف ایک شخص کی ..... جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ بیوقوف ہے..... یاد میں بسر کر دو گی۔''

نرملا نے آشا کو گھور کر دیکھا، پھر متبسم ہو کر بولی:

''آشا تم نہیں جانتیں محبت کسے کہتے ہیں، جس محبت میں طلب ہو، تقاضا ہو، مطالبہ ہو، وہ محبت نہیں کچھ اور ہے۔ محبت تو اتنی نازک چیز ہے کہ کسی طرح وہ الفاظ کا بوجھ سہار ہی نہیں سکتی۔ وہ اتنی شرمیلی ہے کہ دل کی حویلی سے زبان کے دروازے تک اس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔ اگر وہ میرے حال سے بے خبر ہیں، میری محبت محسوس نہیں کرتے تو مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں مجھے اپنی محبت پر، اپنی بے غرض محبت فخر ہے۔ اور یہی فخر میری سب سے بڑی پونجی ہے، کیا اس پونجی پر کوئی ڈاکہ ڈال سکتا ہے؟''

آشا نے بے پروائی سے کہا:

''ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ نہ ہم ایسی محبت کر سکتے ہیں۔ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ محبت ہو تو ڈنکے کی چوٹ سے! اور نفرت ہو تو وہ بھی کھلی ہوئی۔ تمہارا فلسفہ تمہیں لے ڈوبے گا تم کہیں کی نہ رہو گی۔''

نرملا نے آشا کی تائید کرتے ہوئے جواب میں کہا۔

''سچ کہتی ہو لیکن دنیا میں میں کچھ ایسے بے وقوف بھی ہوتے ہیں جنہیں پانے سے زیادہ کھونے میں لطف آتا ہے۔ جو پھول چھوڑ دیتے ہیں کانٹے چن لیتے ہیں۔''

آشا نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر حسرت سے دیکھا اور گویا ہوئی۔

''بھگوان اس مورکھ کو تو ہی سمجھ عطا کر، میں نے تو ہار مان لی۔''

نرملا اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے آشا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''چلو کافی رات آگئی ہے۔ میں تمہیں یہ سمجھ کر اپنے ساتھ لائی تھی کہ کوئی مشورہ دو گی، لیکن تم تو مجھ پر صلواتیں بھیجنے لگیں۔ اچھا بھئی تم بھی ساتھ چھوڑ دو۔ سچ ہے مصیبت میں کوئی کام نہیں آتا۔'' آشا نرملا سے لپٹ گئی، اس نے کہا:

''وقت آنے دو۔ پھر دیکھ لینا آشا تمہارے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے؟''

(3)

راجگانِ ہند کا جوش جنگ

زبیر سنگھ نے واقعی سارے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ اس نے ہر راجہ کے دروازے پر دستک دی اور اسے رائے پتھورا کے پرچم تلے کٹ مرنے پر ابھارا۔ وہ جہاں بھی جاتا ایک عجیب جوش پیدا کر دیتا۔ وہ خود بھی جوش و خروش کا پیکر بنا ہوا تھا۔ ایک طرف وطن دوستی اور قوم پرستی کے جذبے نے اس کی زبان میں بلا کا اثر پیدا کر دیا تھا، دوسری طرف نرملا کو پا لینے کی امید نے اس میں بجلی کی سی تیزی پیدا کر دی تھی۔ ابھی یہاں چمکا، ابھی وہاں جھلک دکھا کر پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ ان راجگان سے صرف ایک ہی حرف کہتا تھا۔

تمہیں رائے پتھورا کا صرف اس لیے ساتھ نہیں دینا چاہیے کہ وہ رائے پتھورا ہے بلکہ اس لیے اس کے ساتھ میدانِ جنگ میں پہنچ کر دادِ شجاعت دینی چاہیے کہ خود تمہاری زندگی بھی اسی پر منحصر ہے۔ اگر رائے پتھورا کو شکست ہوگی، اگر وہ اپنے وطن کی حرمت پر نثار ہوتا ہے تو تم اپنی راجدھانی میں بے موت مرو گے اگر سلطان شہاب الدین غوری اجمیر اور دلی کو فتح کر لیتا ہے تو پھر سارا ہندوستان پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آ گرے گا۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے تسخیر ہند سے نہیں روک سکے گی۔ لیکن اگر رائے پتھورا سلطان پر غالب آتا ہے اور اسے پھر ویسی ہی ذلت آمیز شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے جیسی ایک مرتبہ پہلے دے چکا ہے، تو مسلمانوں کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ محمود غزنوی کشور کشائی اور فتح و یلغار کا جو راستہ کھول گیا ہے وہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔ پھر تم میں سے اگر کسی کو رائے پتھورا سے شکایت ہے، دشمنی ہے، رقابت ہے تو شوق سے اس کے بعد اس سے نپٹ لینا۔ تم ہارو یا وہ جیتے وہ ہارے یا تم جیتو۔ اس دیس کی حکومت یہیں کے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ رائے پتھورا نہ سہی جے چند سہی، جے چند نہ سہی لکشمی سہی۔ ایک کی جگہ جو دوسرا آئے گا وہ بہر حال ہندو ہوگا۔ وہ بہر حال اسی ملک کا باشندہ ہوگا، اس کی فتحیابی یا کامرانی سے ملک کے عظیم اور وسیع مفاد کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''

یہ باتیں کچھ ایسے دل ہلا دینے والے اور چونکا دینے والے انداز میں زبیر نے کہیں کہ

سب نے اپنے اختلافات فرموش کر دیے۔ سب رائے پتھورا کے پرچم تلے لڑنے اور جان دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

زبیر نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان راجوں مہاراجوں کو جنگ پر اور پرتھوی راج کے ساتھ دینے پر اکسایا ہو۔ اس نے ہر ریاست کے عوام میں بھی اس طرح کا جوش پیدا کر دیا۔ ہر ریاست کے باشندے بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ اس جنگ میں حصہ لینے پر تیار ہو گئے۔

زبیر آگ لگا تا ہوا بڑھ رہا تھا، وہ جہاں جاتا وہاں کے راجہ کو مع اس کی سینا (فوج) کے اجمیر کی طرف روانہ کر کے دوسری ریاست کی طرف بڑھ جاتا۔

بجلی کی رفتار سے اپنا وسیع اور طویل دورہ ختم کر کے زبیر جب اجمیر واپس پہنچا تو اجمیر کے آس پاس ہر طرف کیمپ ہی کیمپ نظر آرہے تھے۔ ہر راجہ کی چھاؤنی الگ تھی، اسی طرح اس کی فوج کا پڑاؤ بھی الگ تھا۔ پرتھوی راج کی طرف سے سب کی مہمانی ہو رہی تھی۔ اب تک ڈیڑھ سو راجہ اپنی فوج سمیت اجمیر آ چکے تھے۔

ڈیڑھ سو راجاؤں اور ان کی موج در موج فوج کو دیکھ کر کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ پہلے بھی پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کو اپنے اوپر کچھ کم اعتبار نہیں تھا۔ لیکن اب تو وہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

زبیر کو دیکھ کر پرتھوی راج اپنا وقار شاہی تک بھول گیا، وہ لپک کر آگے بڑھا اور اُسے گلے سے لگا لیا۔ اُس نے کہا۔

''زبیر! تم نے وہ وہ کام کیا ہے کہ دیش ہمیشہ تمہیں یاد رکھے گا۔ پرتھوی راج کو تم نے خرید لیا۔''

پھر راجگانِ ہند کے ڈیروں خیموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''دیکھتے ہو یہ کتنی بڑی فوج ہے۔ یہ صرف تمہاری ہمت اور حوصلہ کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ہرگز امید نہ تھی کہ تم اتنی نمایاں اور یادگار کامیابی حاصل کر سکو گے۔''

کھانڈے راؤ نے کہا۔

''مہاراج زبیر نے آپ کے اعلان کردہ انعام کا اپنے آپ کو مستحق ثابت کر دیا۔''

پرتھوی راج نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا:

''بے شک وہ ہر بڑے سے بڑے انعام کا مستحق ہے۔''

زبیر نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا:

''مہاراج زبیر آپ کا غلام ہے۔اس کا سب سے بڑا انعام آپ کی خوشنودی ہے، جو بھگوان کی کرپا سے اسے حاصل ہے۔''

پرتھوی راج نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا:

''اور یہ تمہیں ہمیشہ حاصل رہے گی۔''

پھر پرتھوی راج کھانڈے راؤ سے مخاطب ہوا اور اس نے کہا:

''صرف زبیر کا انتظار تھا۔اب ان راجگانِ ہند کی ایک شاندار دعوت ہماری طرف سے ہونی چاہیے، اور اس کے دوسرے دن ہمیں یہ سارا لشکر لے کر تراوری کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔ہم چاہتے ہیں کہ جس میدان میں شہاب الدین کو پہلی مرتبہ ہم نے شکست دی تھی یہ آخری شکست بھی اسی میدان میں دی جائے۔ سچ پوچھو تو تراوری کا میدان ہمارے لیے بہت مبارک ثابت ہوا ہے۔''

کھانڈے راؤ نے تائید کی۔

''بے شک مہاراج کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔ہمیں یہ آخری جنگ تراوری ہی میں لڑنی چاہیے۔اور چونکہ غوری خود بھی جنگ کی تیاریاں مکمل کر چکا ہوگا لہٰذا جلد از جلد تراوری کی طرف کوچ کر دینا چاہیے۔''

پرتھوی راج نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

''کھانڈے راؤ ہمیں تمہاری رائے سے اتفاق ہے ایسا ہی ہوگا۔اگر غوری ہمارے استقبال کے لیے وہاں موجود ہوا تو ہم وہیں اسے رخصت کر دیں گے۔اور اگر وہ اب تک چہ کنم میں پڑا ہوا ہے۔اب تک میدان جنگ کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی ہے تو ہمارا لشکر اس کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھے گا اور......''

''غزنی میں جا کر دشمن کا سر اس طرح کچل دیا جائے گا جس طرح سانپ کا سر کچلا جاتا ہے۔'' کھانڈے راؤ نے بات پوری کر دی۔

''بے شک، بے شک......'' پرتھوی راج نے کہا: اور ہاں کھانڈے راؤ راجگانِ ہند کے اعزاز میں ہم جو جشن ترتیب دینا چاہتے ہیں اس میں زبیر کے انعام کا بھی اعلان کر دیا جائے گا۔''

زبیر کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔کھانڈے راؤ نے پرزور تائید کی۔

''بے شک مہاراج بے شک!''

(4)

میدانِ تراوری کی طرف

رائے پتھورا کا راج بھون آج دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ سارے محل میں رونق اور چہل پہل کی عجیب کیفیت طاری تھی۔ کل مہاراجہ اپنا لشکر لے کر تراوری کے میدان کا رخ کرنے والا تھا۔ اور آج جملہ راجگان ہند کے اعزاز میں اس نے نہایت عظیم الشان پیمانہ پر جشنِ استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا۔ تمام راجگان ہند اپنے اپنے مخصوص لباس میں ملبوس رنگا رنگ کی سحر طرازیوں کے ساتھ محل کے بڑے ایوان میں رونق افروز تھے۔

سب سے پہلے حسین وجمیل رقاصاؤں کے کئی طائفے باری باری آئے اور انہوں نے رقص بے حجاب کے ایسے کمالات پیش لیے کہ ہر شخص ششدر رہ گیا۔ یہ ناچنے والیاں ہندوستان کے مختلف شہروں سے لائی گئی تھیں۔ ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام اسی محل میں ہوا تھا۔ ان طوائفوں نے ان کمالات رقص کا مظاہرہ کیا تھا جو اُن کے وطن سے مخصوص تھے۔ ہر طائفے کے رقص میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسروں سے ممتاز اور نمایاں کرتی تھیں۔

رقص کے بعد نغمے کا دور چلا۔ بڑی بڑی فن کار گانے والیاں آئیں اور انہوں نے اپنے فن کی داد جی بھر کے وصول کی، حاضرین میں ہر شخص رقص ونغمہ کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

آخر بڑی دیر کے بعد پرتھوی راج نے تالی بجائی۔ تالی کی آواز جیسے ہی فضا میں بلند ہوئی ناچنے والیوں اور گانے والیوں کے سارے طائفے اس طرح رخصت ہو گئے جیسے اب تک خواب تھا جو کچھ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

طائفوں کے جانے کے بعد حاضرین پر سنجیدگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ خود پرتھوی راج بھی اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے حاضر الوقت راجگانِ ہند وکو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دوستو!''

ہم اپنے دیس میں امن وعافیت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمیں اپنے کلچر پر، اپنے

طرزِ زندگی پر، اپنے اقدارِ حیات پر ناز تھا۔ لیکن اب ہمارے سر پر ایک بہت بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ ہمارے فخر و ناز کو ہم سے چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے ہم آزاد تھے ہمیں غلامی کی دعوت دی جا رہی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا ہم میں سے کوئی بھی غلامی کی زندگی پر رضامند ہو سکتا ہے۔''

راجگانِ ہند نے بیک آواز پورے جوش و خروش کے ساتھ کہا:

''ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔''

پرتھوی راج نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''بہادر دوستو! تمہیں یہی جواب دینا چاہیے تھا۔ بہادروں کا جواب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔''

حاضرین میں سے ایک راجہ تلوار ٹیکتا ہوا اٹھا، اس نے کہا۔

''میں اپنی طرف سے اور جملہ راجگانِ ہند کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس غیر ملکی حملہ کو ناکام بنانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بھی نثار کر دیں گے۔ ہم یہ فیصلہ کر کے گھر سے روانہ ہوئے ہیں کہ ''یا تن رسد بہ جاناں یا جاں نہ تن برآید'' یا ہم سُرخرو ہوں گے یا پھر ہماری لاشیں یہاں سے جائیں گی۔ محمود غزنوی کی فتح مندیوں نے غزنی کے رہنے والوں کے حوصلے بلند کر دیے ہیں۔ وہ دوسرا زمانہ تھا یہ دوسرا زمانہ ہے۔ اس وقت ہم کمزور تھے اب مضبوط ہیں۔ اس وقت ہم بکھرے ہوئے تھے اب متحد ہیں اور متفق ہیں۔ اس وقت ہم میں اختلاف تھا، اب ہمارے سارے اختلاف اتحاد میں بدل کے ہیں۔ ہم میں اس وقت تک اب کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا جب تک دشمن کا قلع قمع نہ ہو جائے جب تک خیبر کے راستے آنے والے دشمنوں کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔ ہم آپس میں دوست ہیں۔ بھائی ہیں۔ ہمارا خون، ہماری نسل، ہماری قوم، ہمارا مذہب ایک ہے۔ ایک تھا، ایک رہے گا۔ ہمارے باہمی اختلافات سے دشمن فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہم سب نے بالاتفاق رائے پتھورا کو اپنا سردار مان لیا ہے اور اس کی ماتحتی میں ہم میں سے ہر ایک جان کی بازی لگا دے گا۔[1]

اس اعلان نے پرتھوی راج کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس نے کہا:

''تو کل ہم کوچ کریں گے۔''

سب نے پرزور تائید کی:

---

[1] راجہ ہائے راجپوت کہ یک صد و پنجاہ نفری شدند، قشقہ، شجاعت بر جبین کشیدہ، بقاعدۂ درویش سوگند ہائے غلیظ و شدید یانمودند کہ رقم ہزیمت از صفحۂ خاطر محو لی سازند تا رفع خصم نہ نمایند درست از کارزار برندارند! (تاریخ فرشتہ)

''ہم اس وقت کوچ کے لیے تیار ہیں۔''

اب مجمع برخاست ہو چلا تھا کہ پرتھوی راج کا اشارہ پا کر کھانڈے راؤ اٹھا اور اس نے کہا:

''مہاراجہ ایک نہایت مسرت بخش اعلان کرنے والے ہیں، وہ بھی آپ حضرات سماعت فرمالیں۔''

سب لوگ جاتے جاتے رک گئے۔ کھانڈے راؤ نے زبیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے جا کر پرتھوی راج کے سامنے کھڑا کر دیا۔

''آپ سب لوگ اس نوجوان سے، اس کے جوشِ بے پایاں سے، اس کے قومی اور ملکی جذبے سے واقف ہیں۔''

سب نے ایک آواز ہو کر کہا:

''زبیر گو نوجوان ہے لیکن اس میں بوڑھوں کا تدبر، کہن سالوں کی فراست، دانش وروں کی اصابت رائے موجود ہے، یہی وہ شخص ہے جس نے ہمیں سوتے سے جگایا، ہمیں خواب غفلت جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔''

پرتھوی راج نے محبت بھری نظروں سے زبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''واقعی یہ نوجوان خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ ہم نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہے۔ تراوری کے میدان میں فتح حاصل کرنے کے بعد ہم سب پھر ایک مرتبہ اجمیر میں جمع ہوں گے۔ اور آپ سب کے سامنے میں اپنی نورِ نظر اور لختِ جگر نرملا کا ہاتھ اس بہادر اور ساونت کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔''

مجمع سے صدا بلند ہوئی۔

''بے شک زبیر اس انعام کا مستحق ہے اور ہم سب بڑی خوشی سے اس تقریب میں شریک ہوں گے۔''

زبیر کی کچھ نہ پوچھیے۔

تصور عرش پر تھا اور سر تھا پائے ساقی پر!

(5)

بختیار آ گیا

سلطان شہاب الدین اپنا لشکر گراں لے کر غزنی سے پشاور پہنچا۔ پشاور سے روانہ ہوا تو ملتان میں آ کر دم لیا م۔ ملتان کے گورنر نے سلطان کی عدم موجودی میں نہایت دلیری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ اور ہر یورش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ سلطان نے گورنر کے اعزاز اور منصب میں اضافہ کیا۔ فوج کو انعامات تقسیم کیے۔ کیونکہ یہی فوج تھی جس نے ان ہندو راجاؤں کی یلغار کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا تھا۔ جو سلطان کی شکست کے بعد ٹڈی دل کی طرح ملتان پر حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ کر لینے کی فکر کر رہے تھے۔

ملتان میں سلطان نے چند روز قیام کیا۔ وہاں کے استحکامات کا معائنہ کیا۔ مزید احتیاطی پیش بندیوں کا مشورہ دیا۔ دشمن کی یلغار اور یورش کی صورت میں ضروری ہدایات دیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر سلطان نے ملتان سے کوچ کیا اور سیدھا لاہور پہنچ گیا۔

سلطان کے لاہور پہنچنے سے پہلے ضیاء الدین تولکی سرہند سے آ چکا تھا۔ اس نے سلطان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ یہاں لشکر نے کمر کھول دی اور اجمیر کی طرف کوچ کا پروگرام بنانے لگا۔ اس اثناء میں چند جاسوس آئے کہ پرتھوی راج اپنا لشکر گراں اور ڈیڑھ سو راجگانِ ہند کا ٹڈی دل لے کر ترائن کے میدان میں پہنچ چکا ہے۔ اس خبر سے سلطان خوش ہو گیا۔ اس نے کہا:

''یہ فال نیک ہے، جس میدان میں دشمن نے ہم پر غلبہ پایا تھا اسی میدان میں اُسے شکست فاش دے کر ہم اپنے دل کے حوصلے پورے کریں گے، ہمیں اجمیر تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خود اجمیر چل کر ہمارے پاس آ گیا۔''

اس کے بعد سلطان نے اپنا لشکر لے کر ترائن کے میدان کی طرف پیش قدمی کی اور بہت جلد وہاں پہنچ گیا۔ سرستی ندی ان دونوں لشکروں کے مابین حد فاصل بنی ہوئی تھی۔

سلطان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ [1] جس میں اسی ہزار پیادے اور چالیس ہزار سوار تھے۔ [2] پرتھوی راج کا لشکر تین لاکھ سواروں پر مشتمل تھا۔ [3] نیز تین ہزار سے زیادہ جنگی ہاتھی بھی تھے۔ پیادوں کی تعداد حدِ شمار سے خارج تھی۔

1۔ طبقاتِ ناصری 2۔ تاریخ فرشتہ 3۔ لاتعداد

دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے تھے۔ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ہر آن آغاز جنگ کا احتمال ضرور تھا۔ ایک روز صدر الملک نے جو سلطان کے مقربین بارگاہ میں شامل تھا، عرض کیا۔

''بیکار پڑے پڑے طبیعت اکتا گئی ہے، اب تو جنگ شروع ہی ہو جانی چاہیے۔''

سلطان نے فرمایا: ''تم ٹھیک کہتے ہو صدر الملک، ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ پیش قدمی حریف کی طرف سے ہو۔ ہمارا لشکر تو صرف سوا لاکھ کے قریب ہے دشمن کے لشکر کی تعداد حد شمار سے خارج ہے، وہ ہم سے زیادہ جنگ کا شائق ہے۔ اور یقیناً جلد ہی پہل کرے گا۔ پھر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جلد ہی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔''

''پھر کچھ سوچتے ہوئے سلطان نے فرمایا:

''البتہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اسے باطل کے راستے سے ہٹنے اور راہِ صواب پر گامزن ہونے کی دعوت دیں۔''

صدر الملک نے عرض کیا: ''سلطان عالم پناہ کئی مرتبہ اپنا ایلچی اس مغرور اور گستاخ شخص (رائے پتھورا) کے پاس بھیج چکے ہیں۔ ہر مرتبہ اس نے انتہائی نخوت وتکبر کا اظہار کیا، اب پھر اس کے پاس سفارت بھیجنا خود اپنے وقار کو مجروح کرنا ہے۔''

صدر الملک کی ان باتوں پر سلطان ہنسنے لگا، اس نے کہا۔

''میرے عزیز! حق کے معاملے میں وقار کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ ذرا سوچو تو سہی اگر پرتھوی راج راہِ راست پر آجائے تو کتنے بندگانِ خدا کی جان بچ جائے گی، کتنی سہاگنیں بیوگی کے داغ سے محفوظ رہیں گی۔ کتنے بچے یتیمی کا دکھ سہنے سے نجات پائیں گے...... مجھے مال وزر کی ہوس نہیں ہے۔ توسیعِ مملکت کا جذبہ بھی مجھے یہاں نہیں لایا ہے۔ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ حق کو کامیابی ہو اور باطل سرنگوں ہو جائے۔ یہ کام اگر بغیر جنگ کے انجام پا جائے تو کیا کہنا۔ اس کام کے انجام دینے میں اگر تھوڑی سی ذلت بھی سہنی پڑے تو برداشت کر لینا چاہیے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رائے پتھورا کے پاس بھیجا کسے جائے؟''

صدر الملک نے عرض کیا: ''جسے سلطان حکم دیں وہ سر آنکھوں پر تعمیلِ ارشاد کرے گا۔''

سلطان نے فرمایا:

''ہاں یہ بات تو ہے مگر بختیار کی بات ہی کچھ اور تھی۔ کاش وہ ہوتا اور ہمارا ایلچی بن کر جاتا لیکن وہ غریب تو ایسے غم میں گرفتار ہے کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔''

یکا یک سامنے سرگرد اُڑتی نظر آئی۔ سلطان خاموش ہوگیا اور اسی طرف دیکھنے لگا۔ ذرا دیر میں گرد کا پردہ پھٹا اور ایک دستۂ سپاہ ادھر آتا نظر آیا۔ آگے آگے جو سوار تھا اُسے دیکھ کر سلطان بے ساختہ اُٹھ کھڑا ہوا اور جوشِ مسرت سے بے تاب ہو کر بولا۔

''بختیار آ گیا!''

(6)

آخری سفارت

پرتھوی راج پیکرِ غرور بنا تختِ فرمانروائی پر متمکن ہے۔ کھانڈے راؤ اس کے داہنے ہاتھ پر مؤدب کھڑا ہے۔ سامنے راجگانِ ہند میں سے کئی مہاراجا تشریف فرما ہیں۔ اور ہونے والی جنگ کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ پرتھوی راج سے ایک راجہ نے مخاطب ہو کر کہا:

''مہاراج! غوری کا حوصلہ جواب دے چکا ہے وہ ہرگز پیش قدمی نہیں کرے گا۔ آخر ہم کب تک یہ انتظار کرتے رہیں گے کہ وہ میدان میں اترے اور ہم اپنی فوجوں کو یلغار کا حکم دیں۔ جو کام بہر حال کرنا ہے وہ کل کی بجائے آج ہی کیوں نہ کیا جائے۔''

اصل میں پرتھوی راج کی یہی خواہش تھی کہ راجہ اپنا لاؤ لشکر لے کر آئے میں وہ جنگ شروع کرنے کی تحریک کریں۔ آج اس کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ اس نے کہا:

''اگر آپ کی یہی صلاح ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے!''

اتنے میں دربان حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''سلطان شہاب الدین کا ایلچی درِ دولت پر حاضر ہے اور باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔''

کھانڈے راؤ نے پوچھا: ''کیا وہ سر کے بل آیا ہے؟''

کئی راجے ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا:

''رومال سے ہاتھ باندھ کر آیا ہوگا؟''

ایک دوسرا راجہ گویا ہوا:

''معلوم ہوتا ہے شہاب الدین عقلمند آدمی ہے۔ اس نے اندازہ کر لیا ہے کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔''

ایک تیسرے راجہ نے گوہر افشانی کی۔

''لیکن ہم کچی گولیاں نہیں کھیلے ہیں۔ ہم اتنا بڑا لشکر اس لیے نہیں لائے ہیں کہ اُسے معافی دے کر رخصت ہو جائیں؟''

اتنے میں پرتھوی راج کی آواز گونجی:

''سلطان کا ایلچی حاضر کیا جائے۔''

ذرا دیر میں بختیار مسکراتا اور شوخ نگاہوں سے حاضرین پر ایک نظر ڈالتا رائے پتھورا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بختیار کو دیکھ کر کھانڈے راؤ اور پرتھوی راج کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پرتھوی راج نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا:

''ایلچی! تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اچھے تو ہو؟''

بختیار نے جواب میں عرض کیا:

''بے انتہا سخت جان ہوں۔ اور میری سخت جانی کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے سامنے موجود ہوں؟''

اس طنز کو پرتھوی راج نے محسوس کر لیا، اس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تمہارے سلطان نے کوئی خط دیا ہے۔ اگر لائے ہو تو ہمارے سامنے پیش کرو۔''

بختیار نے جواب دیا۔

''نہیں مہاراج سلطان نے کوئی خط نہیں دیا زبانی پیغام دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے، اب بھی موقع ہے کہ اسلام قبول کر کے اپنی، راجگانِ ہند کی اور اپنے لشکر بے حساب کی جان بچا لیجئے ورنہ پھر کفِ افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔''

یہ خلافِ توقع پیام سُن کر پرتھوی راج، کھانڈے راؤ اور راجگان ہند تلملا گئے پرتھوی راج نے بادل کی طرح گرج کر کہا۔

''جاؤ، اور اپنے سلطان کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ جس طرح اس کا ایک خدا ہمارے ان گنت دیوتاؤں پر غالب نہیں آ سکتا اسی طرح اس کا مٹھی بھر لشکر ہمارے لشکر گراں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر وہ بھاگنا چاہے تو ہم اس کا تعاقب نہیں کریں گے اور اگر وہ لڑنا چاہے تو پھر تلوار کا فیصلہ ہمارے اور اس کے دونوں کے لیے آخری اور قطعی ہو گا۔''

(7)

شکار

رائے پتھورا اپنے ساتھ حرم سرا بھی لایا تھا۔ رانیاں، باندیاں، نرملا، آشا سب ہی۔ زرکار اور زرنگار خیموں میں مقیم تھیں۔ اور داد عیش دے رہی تھیں۔ پرتھوی راج اور اس کے ساتھیوں کو اپنی فتح کا اتنا کامل یقین تھا کہ بھولے سے بھی ناکامی یا شکست کا خیال نہیں آتا تھا۔

جس روز بختیار سلطان کا ایلچی بن کر آخری مرتبہ رائے پتھورا کی خدمت میں حاضر ہوا اسی دن کا واقعہ ہے کہ آشا نے نرملا سے جو زبیر کے ساتھ نسبت کے بعد بہت ملول و غمگین رہنے لگی تھی۔ کہا، چلو ذرا سیر کر آئیں۔ مگر نرملا راضی نہ ہوئی۔ دراصل وہ یہاں آنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ رائے پتھورا اُسے اس لیے لایا تھا کہ زبیر کے کارنامے دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو جائے اور آشا اس لیے زبردستی کر لے لائی تھی کہ شاید جنگ کی ہماہمی میں کہیں بختیار نظر آ جائے۔ اس سے ملاقات ہو جائے، اس سے کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم نرملا کے دلِ محزون کو عارضی طور پر سکون مل جائے گا۔ بہرحال آشا کے اصرار سے مجبور ہو کر تیر کمان، ڈھال اور تلوار لے کر اس کے ساتھ وہ بھی گھوڑے پر سوار ہوئی اور سیر کرنے نکل گئی۔ سامنے ایک گھنا جنگل تھا، نرملا نے کہا چلو چلتے ہیں شاید کوئی ہرن مل جائے۔ آشا نے جل کر کہا، توبہ ہے اتنی شکار پسند طبیعت کا ہے کو ہوگئی کسی کی، ہر وقت کسی نئے شکار کی تلاش میں رہتی ہو، اچھا بھئی نہیں مانتیں تو چلو۔

نرملا اور آشا ساتھ ساتھ جنگل کے اندر گھسیں اور بہت دُور تک چلی گئیں لیکن کوئی شکار نہ ملا، آخر آشا نے کہا:

''آج کا دن بڑا منحوس ہے، کوئی شکار نہیں ملنے کا، چلو چلیں۔''

نرملا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سامنے سے ایک ہرن چوکڑی بھرتا اسی طرف آتا نظر آیا۔ نرملا خوش ہوگئی، اس نے کہا:

لو بھئی شکار خود چل کر آ گیا۔ ہمارے پاس...... پھر اس نے اور آشام نے چلّے میں تیر رکھ کر چلایا۔ ہرن تو چوکڑی بھرتا نظر سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اسی وقت ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا

ذرا فاصلے سے گزرتا نظر آیا۔ نرملا کا تیر ٹھیک اس کے شانے پر لگا۔ آشا کے تیر نے گھوڑے کو زخمی کر دیا۔ ادھر گھوڑا لڑکھڑایا۔ ادھر سوار لگام پر اپنی گرفت نہ قائم رکھ سکا۔ وہ بھی دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ پاؤں رکاب میں نہیں پھنسے ورنہ شاید گھوڑا اُسے کھینچتا ہوا نکل بھاگتا۔ سوار گر پڑا اور گھوڑا زخمی ہو کر وحشت کے عالم میں ناک کی سیدھ بھاگتا چلا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر نرملا اور آشا دونوں کے چہرے دہشت سے سفید پڑ گئے۔

''آشا نے کہا، نہ جانے کون بدقسمت ہوگا لیکن اب یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے، چلو نکل چلیں، یہی مناسب ہے۔''

لیکن نرملا اڑ گئی۔ ''بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ ایک بے گناہ شخص ہمارے تیروں سے زخمی ہو کر گر پڑے اور ہم اس کی خبر لیے بغیر چلے جائیں۔ چلو دیکھیں تو سہی کون ہے۔''

آشا نے تیوری چڑھا کر کہا:

''کچھ شامت آئی ہے نہ جانے کون ہو! کہیں ایسا نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں نا بابا میں نہیں جاتی۔'' نرملا نے مزید گفتگو بے کار سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی اور سیدھی زخمی سوار کی طرف بڑھی۔ اُسے جاتا دیکھ کر آشا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہو گئی۔ پاس پہنچ کر دونوں نے جو منظر دیکھا اس نے سکتہ طاری کر دیا۔ یہ بختیار تھا!

بختیار کے شانے سے خون بہہ رہا تھا، نرملا نے اس کے پاس پہنچ کر بیتابی سے گھوڑے سے اتری۔ اس نے کہا۔

''ارے! یہ آپ تھے؟''

بختیار نے بازو پکڑے پکڑے کہا۔''

''اگر وہ تیر آپ کا تھا تو مجھے اپنے زخمی ہونے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔''

نرملا نے کوئی جواب نہیں دیا، آشا سے سامنے والے تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''جاؤ ڈھال میں پانی لے کر آؤ جلدی سے۔''

آشا دوڑی دوڑی گئی اور پانی لے کر آئی۔ اتنی دیر میں آشا نے اپنی ساڑھی سے ایک دھجی پھاڑی اسے پانی میں تر کیا۔ زخم دھویا اور پٹی باندھ دی۔ پھر وہ معذرت کناں لہجے میں بولی:

''میں نے تو ہرن پر تیر چلایا تھا۔''

بختیار نے اُٹھتے ہوئے کہا: ''اور وہ بدقسمت تھا کہ اپنی جان سلامت لے گیا۔''

نرملا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شرما کر نظر جھکالی، پھر پوچھا:

''زخم زیادہ گہرا تو نہیں ہے۔''

بختیار نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا:

''مجھے تو نہیں یاد، آپ ہی نے لگایا ہے۔ آپ ہی کو صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔''

نرملا اور زیادہ جھینپ گئی، اس سے کچھ نہ بولا گیا۔

بختیار نے کہا: ''اچھا اب اجازت دیجئے، قسمت میں آپ سے ملاقات لکھی تھی وہ ہو گئی۔''

نرملا نے پوچھا: ''لیکن آپ اپنے لشکر تک جائیں گے کس طرح؟''

بختیار نے جواب دیا: ''تو کیا ہوا پاؤں تو زخمی نہیں ہیں!''

وہ بولی: ''لیکن یہ نہ بھولیے کہ آپ کس کے علاقہ میں ہیں۔ یوں پا پیادہ جانا خطرے سے خالی نہیں...... میرا گھوڑا حاضر ہے۔''

بختیار نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ آپ کو پیدل جانے کے لیے چھوڑ دوں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چل دوں۔''

آشا اب تک خاموش کھڑی تھی، اس نے کہا۔

آج تو آپ خوب بلبل کی طرح چہک رہے ہیں۔ خیر، باتیں نہ بنایئے، گھوڑے پر بیٹھیے اور تشریف لے جایئے۔ نرملا اور میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلے جائیں گے۔''

بختیار راضی ہو گیا۔

''ہاں یہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ گھوڑا آپ تک پہنچے گا کس طرح۔ واپس بھیج تو سکتا ہوں۔ لیکن کیا اس طرح آپ کی بدنامی نہ ہوگی کہ دشمن بادشاہ کے ایک سپاہی کی آپ نے جان بچائی اور اسے بھاگ جانے کے لیے ایک گھوڑا تک دے دیا۔ آپ کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔ آپ ہی کی بروقت اطلاع نے میری اس وقت جان بچائی جب میں اجمیر سے غزنی واپس جا رہا تھا۔ اور راستے میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ لیکن اس وقت کی بات اور تھی۔ اس وقت اعلان جنگ نہ ہوا تھا۔ اب دونوں لشکر آمنے سامنے کھڑے ہیں، اس حالت میں میری مدد کر کے آپ مشکل میں پھنس جائیں گی۔''

نرملا نے تیکھے لہجے میں کہا: ''آپ کی اس عنایت کا شکریہ، لیکن یہ گھوڑا آپ کو لینا پڑے گا۔ اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے فرضی احسانات کی فہرست تو آپ نے فر فر سنا دی۔

لیکن اپنے واقعی احسانات کو بھول گئے۔ میں اتنی تو احسان فراموش نہیں ہوں کہ انہیں بھول جاؤں۔''

آشا بول پڑی: ''صاحب ہم لوگ حساب کتاب برابر کرلیں گے، آپ کا گھوڑا کوئی ہوا کا گھوڑا تو ہے نہیں کہ اُڑ جائے گا، یہیں کہیں ہوگا، ہم اس پر قبضہ کرلیں گے اگر کسی نے پوچھا یہ مسلمان گھوڑا کہاں سے آیا تو کہہ دیں گے......سوار بزدل تھا، زخمی ہو کر بھاگ گیا، ہم نے اس گھوڑے سے قبضہ کرلیا۔''

بختیار نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوا۔

''بہت اچھا جناب یہ سودا منظور ہے۔''

پھر رکاب میں پاؤں رکھ کر ایک دفعہ اچکا اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا۔ ایڑ لگانے سے پہلے اس نے نرملا سے کہا:

''اس عنایت کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

اور پھر ہوا سے باتیں کرتا بہت جلد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو آشا نے چھیڑا۔

''لو بھئی، اب تو زندگی بھر کے پیمان وفا بندھنے لگے۔ جاتے جاتے بشارت دے گئے ہیں زندگی بھر تمہیں یاد رکھوں گا۔''

نرملا ہنس پڑی اُس نے کہا۔

''منہ پر جھوٹ بولتی ہے؟ انہوں نے یہ کب کہا زندگی بھر تمہیں یاد رکھوں گا۔''

آشا نے بڑے بھول پن سے سوال کیا۔

''میں تو جھوٹی ہوں، تم ہی بتا دو کیا کہہ گئے ہیں وہ حضرت؟''

نرملا نے سادگی سے کہا:

''انہوں نے تو صرف اتنا کہا تھا آپ کے احسانات زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ تم نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔''

آشا ہنسنے لگی۔

''واقعی میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، دنیا کا دستور یہی تو ہے کہ احسانات یاد رکھے جاتے ہیں محسن فراموش کر دیا جاتا ہے۔''

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی......اور نرملا بھی۔

(8)

نرملا اور زبیر

بختیار کے جانے کے بعد آشا نے نرملا سے کہا۔

''لو بھئی مبارک، گونگا بولنے لگا، اندھا دیکھنے لگا۔ آخر یہ حضرت راہِ راست پر آ گئے۔ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔''

نرملا نے آشا کے ایک زور کی چٹکی لی اور کہنے لگی:

''بہت زیادہ چلنے لگی ہے۔ ہوائی قلعہ تیار کرنا کہاں سے سیکھ لیا تم نے:

'' آشا بولی:''یہی ہوائی قلعہ دیکھ لینا ایک دن محبت کا محل بن جائے گا۔ مجھے یقین ہے مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے۔ اب لاکھ تڑپے بچ نہیں سکتی۔''

اس تشبیہہ پر نرملا کو ہنسی آ گئی۔ ابھی وہ کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ سامنے سے زبیر آتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے اسپ تازی پر سوار تھا۔ اور زخمی گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ جو لنگڑاتا ہوا ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ اُسے اس طرف آتا دیکھ کر آشا سہم گئی۔ اس نے چپکے سے کہا۔

''غضب ہو گیا نرملا۔ اب سارا بھید کھل جائے گا۔''

نرملا نے استقلال کے ساتھ جواب دیا:

''تو ڈرتی کیوں ہو؟ اگر بھید کھل بھی جائے گا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔''

اتنے میں زبیر سامنے آ گیا۔ اس کا چہرہ فرطِ غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت برہم لہجے میں آشا کو مخاطب کیا۔

''میں پہچانتا ہوں یہ گھوڑا بختیار کا ہے جو آج مہاراج کے پاس سلطان کا ایلچی بن کر آیا ہے۔ اس گھوڑے کے ہاتھ آنے سے پہلے میں نے بختیار کو دیکھا کہ وہ ایک اسپ خوش خرام پر سیلِ رواں کی طرح بھاگا چلا جا رہا ہے۔ وہ گھوڑا اُس کا نہ تھا۔ جی چاہا ٹوکوں، روکوں، پوچھوں، لیکن وہ بجلی کی طرح کوندا اور غائب ہو گیا۔ بہرحال میں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا وہ گھوڑا نرملا دیوی کا تھا۔ آخر یہ کیا معمہ ہے؟''

''آشا سٹ پٹا گئی۔ کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا، کہنے لگی...... یہ گھوڑا وہ گھوڑا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دونوں گھوڑے۔''

زبیر کو غصہ آ گیا۔ اس نے خشمناک لہجے میں کہا:

''آشا دیوی صاف صاف بتایئے کیا ماجرا ہے۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ اگر آپ نے مجھے نہ بتایا تو مہاراجہ کو بتانا پڑے گا۔ اور یہ آخری صورت شاید آپ کے اور راجکماری نرملا دیوی کے لیے زیادہ خوشگوار نہ ہو۔''

اب نرملا خاموش نہ رہ سکی۔ اُس نے آشا کو جھڑکتے ہوئے کہا:

''تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ جو بات ہے، صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں؟ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ بختیار ہمارے تیر سے زخمی ہوا تھا۔ کیا تمہیں یہ کہتے ڈر لگتا ہے کہ وہ ہمارا محسن ہے۔ اس نے ہماری جان اور آبرو ڈاکوؤں کے ہاتھ سے بچائی تھی۔ کیا تمہیں یہ کہتے شرم آتی ہے کہ ہم نے اپنے محسن کی مرہم پٹی کی، اس کا زخم دھویا، اس سے معافی مانگی۔ اور اس کے انکار کے باوجود میں نے اصرار کر کے اپنا گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔ کیا ان باتوں میں کوئی ایسی بھی ہے جو مہاراج سے جرم کی طرح چھپائی جائے۔ کیا یہ ساری تفصیل مہاراج کے سامنے بے جھجک نہیں بیان کی جا سکتی؟ ممکن ہے تم میں اتنا حوصلہ نہ ہو، لیکن میں تو اتنی ہمت رکھتی ہوں۔''

نرملا کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح زبیر کے دماغ پر لگ رہے تھے اس نے غصہ سے دانت پیستے ہوئے کہا:

''میں راجکماری سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیا انہوں نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے مہاراج کے بدترین دشمن کی مدد کر کے پاپ نہیں کیا؟''

نرملا نے بیتابی سے جواب دیا۔

''وہ سارے زمانہ کا دشمن ہو، لیکن میرا محسن ہے اور میری انسانیت کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنے محسن کی خدمت کروں۔ آشا تم زبیر جی سے کہہ دو کہ وہ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ اب ان کے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے، ورنہ گستاخوں کی زبان ہی نہیں سر بھی میری تلوار کاٹ سکتی ہے۔''

ان الفاظ میں جو وقار تھا، جو دبدبہ تھا، جو شان تھی زبیر اس کی تاب نہ لا سکا اس کا غصہ شرمندگی سے بدل گیا۔ پہلے کچھ دیر وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''راجکماری کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

نرملا نے ڈپٹ کر کہا:

''خاموش میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ آشا اس شخص سے کہہ دو یہ فوراً یہاں سے دفع ہو جائے۔ ورنہ میری تلوار میان سے نکلنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔''

زبیر نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ پیکر غضب بنا ہوا اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا، چلتے چلتے اس نے آشا سے کہا:

''آشا دیوی آپ کو مہاراج کے سامنے ضرور جواب دہی کرنی پڑے گی۔''

زبیر چلا گیا، لیکن آشا بید لرزاں کی طرح کانپ رہی تھی، نرملا آگے بڑھی اس نے آشا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دل دہی کے لہجے میں لیکن غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''تم کیوں مری جارہی ہو؟ ملزم اگر ہوں تو میں؟''

''آشا کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہوگئی۔ لیکن نرملا یہ بہت برا ہوا۔ یہ کمبخت زبیر ایک کی دس لگائے گا جا کر۔ اور مہاراج کا غصہ خدا کی پناہ! بھلا وہ برداشت کر سکتے ہیں کہ جس شخص کو دھوکے تک سے انہوں نے ہلاک کرنے کی کوشش کی اس کے ساتھ تم ایسا برتاؤ کرو؟''

نرملا نے بے پروائی سے کہا:

''انہیں برداشت کرنا پڑے گا؟''

(9)

پرتھوی راج کی ہلاکت میدانِ جنگ میں

آخر وہ دن آ گیا جس کا انتظار تھا...... جنگ شروع ہو گئی۔

شہاب الدین غوری کے پاس غزنی یا پشاور، ملتان اور لاہور سے کمک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری پونجی سمیٹ لایا تھا۔ اب نہ فوج میں اضافہ ہوسکتا تھا نہ سپاہ میں، نہ ساز و سامانِ جنگ میں۔ جتنے آدمی ہلاک یا مجروح ہوتے اتنی ہی تعداد لشکر کی کم ہو جاتی۔ ان مقتول اور مجروح سپاہیوں کا بدل کسی طرح نہیں مل سکتا تھا، اس کے برعکس پرتھوی راج کی فوج غوری کی فوج سے تین گنا سے بھی زیادہ تھی۔ ڈیڑھ سو راجگانِ ہند اس کے پسینے پر خون بہانے کو تیار تھے۔ غوری کے پاس ایک ہاتھی بھی نہ تھا۔ رائے پتھورا کے ہاتھیوں کی تعداد تین ہزار سے متجاوز تھی۔ اور یہ ہاتھی سرد و گرم چشیدہ تھے۔ ان کی عمریں میدانِ جنگ میں گزری تھیں۔ یہ جنگی ہاتھی کہلاتے تھے، ان کا ریلا بڑی سے بڑی فوج کا خاتمہ کر سکتا تھا۔

شہاب الدین غوری کو صرف خدا پر اور اس کے فضل سے اپنے دست و بازو اور اپنے سپاہیوں اور سواروں کی شجاعت و فداکاری پر بھروسہ تھا۔ پرتھوی راج اپنے مور و ملخ کے سے لشکر کو دیکھ کر جامہ میں نہ سماتا تھا۔ اسے یقین تھا جس طرح چیونٹی ہاتھی کے پاؤں تلے آ کر روندی جاتی ہے اور اُف بھی نہیں کر سکتی اسی طرح غوری کے لشکر کو اس کے پیلان دماں اور یلانِ پیل تن مسل دیں گے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد نہ شہاب الدین کا پتہ ہو گا نہ اس کی فوج و سپاہ کا!

دونوں طرف کی فوجیں تراوری کے میدان میں آمنے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ پرتھوی راج نے کھانڈے راؤ کو اپنی افواج کا سپہدار اعظم مقرر کیا۔ اور خود ڈیڑھ سو راجاؤں اور منتخب بہادروں کے ساتھ قلبِ لشکر میں قائم ہوا۔

سلطان نے اپنی قابلیت اور سپہداری کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ راتوں رات فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کی کمان ایک تجربہ کار اور بہادر شخص کو سونپ دی۔ اور حکم دیا کہ پہلے ایک سردار حملہ کرے، باقی اپنی اپنی جگہ خاموش کھڑے رہیں۔ جنبش تک نہ کریں، جب جنگ

نقطہ عروج پر پہنچ جائے تو مصروفِ جنگ سردار اپنی فوج کے ساتھ اس طرح پسپا ہونا شروع کر دے کہ دشمن کو اپنی فتح کا یقین ہو جائے اور وہ دلیر ہو کر تعاقب شروع کر دے۔ پھر فوراً دوسرا سردار اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ حملہ آور ہو کر ان کا تعاقب کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اور پہلے سردار کی طرح تھوڑی دیر جم کر مقابلہ کرنے کے بعد وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے سردار بھی موقع دیکھ کر حملہ کر دیں اور پھر پسپا ہونا شروع کر دیں۔ پھر پہلا سردار جو پیچھے ہٹ کر دم لے چکا ہوگا اپنی جمعیت درست کر کے اور تازہ دم ہو کر اور ازسرِ نو حملہ کر دے۔ اسی طرح دوسرے، تیسرے اور چوتھے سردار بھی کریں۔

سلطان نے بارہ ہزار سوار لشکر سے جدا کر کے اپنے ساتھ کر لیے۔ ان میں سے ایک حصہ کا سردار بختیار تھا، دوسرے کا قاسم۔

طلوعِ آفتاب سے پہلے اسلامی لشکر نے سرستی ندی کو عبور کر لیا۔ اور ہر حصہ فوج نے اپنی اپنی جگہ متعین کر لی، سلطان اپنے بارہ ہزار منتخب سواروں کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہو کر نظارۂ جنگ کرنے اور حسبِ موقع ضروری احکام صادر کرنے لگا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ایک حصہ فوج نے حملہ کیا۔ اس کے پسپا ہونے کے بعد دوسرے نے، پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے نے۔ ہر مرتبہ ہندو لشکر نے مسلمانوں کو مفرور مغلوب سمجھ کر تیزی سے تعاقب شروع کیا۔ اور اس طرح ہندو لشکر جو ایک ٹھوس اور مضبوط پہاڑ کی طرح قائم تھا مختلف سمتوں میں پھیل کر بکھرنے لگا۔

طلوعِ سحر سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ سہ پہر تک میدانِ جنگ کی بساط پر سلطان کے مہرے حسبِ منشا حرکت کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالب ترین کثرتِ تعداد کے باوجود قلیل التعداد اسلامی لشکر پر ہندو غالب نہ آسکے۔ سلطان نہایت ہوشیاری اور چوکسی کے ساتھ میدانِ جنگ کے نظاروں کی تبدیلیوں کا معائنہ کر رہا تھا

عصر کے قریب سلطان نے بختیار اور قاسم سے جو پاس ہی کھڑے تھے فرمایا:

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حملہ کریں۔''

دونوں نے بیک آواز جواب دیا:

''بسر و چشم!''

پھر سلطان اپنے بارہ ہزار منتخب اور کار آزمودہ اور فدا کار سواروں کو لیکر تیزی سے آگے

بڑھا۔ اور دشمن کے قلبِ لشکر میں جہاں پرتھوی راج اپنے ڈیڑھ سو راجگانِ ہند اور مانے ہوئے بہادروں اور ساونتوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تیر کی طرح گھستا چلا گیا۔ سلطان کے سارے سوار زرہ پوش تھے۔ اپنے نیزوں کو گھوڑوں کی کنوتیوں پر رکھ کر یہ اس طرح حملہ آور ہوئے کہ ہر سدِ راہ کو پامال کرتے اور ہٹاتے عین قلبِ لشکر میں پہنچ گئے۔ اور اپنے کمالاتِ حریف افگنی کا انتہائی تیزی اور چابکدستی کے ساتھ مظاہرہ شروع کر دیا۔

یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید ہوا کہ پرتھوی راج، کھانڈے راؤ۔ ڈیڑھ سو راجگان ہند اور ان کے منتخب اور جیالے سردار ہکا بکا رہ گئے۔ تلواریں چلنے لگیں، سر کٹنے لگے، بزدل بھاگنے لگے، بہادر مرنے لگے، تھوڑی ہی دیر میں جنگ کا نظارہ ایسا بدلا کہ پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ اپنے ڈیڑھ سو راجگانِ ہند سمیت راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں بھاگتا دیکھ کر باقی ماندہ سردارانِ فوج کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے، ان کے پیچھے سوار اور پیادے بھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ایک زوردار آندھی ہندو لشکر کو درختوں کے پتوں اور ریت کے ذروں کی طرح اپنے زور میں اڑا کر لے گئی۔

اتنی بڑی جنگ، جس کے بارے میں سلطان کا بھی یہ خیال تھا کہ مہینوں نہیں تو ہفتوں جاری رہے گی، چند گھنٹوں میں ختم ہو گئی۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا تھا کہ تراوری کے میدان میں دو ہی چیزیں نظر آ رہی تھی، مقتولین کی لاشیں یا مسلمان سپاہیوں اور سواروں کے فتحمند دستے۔

سلطان کا حکم پا کر بختیار اور قاسم نے اپنے جاں بازوں کے ساتھ پرتھوی راج، کھانڈے راؤ اور دوسرے بھاگتے ہوئے راجگانِ ہند کا تعاقب کیا، ان میں سے بہتوں کی جان گئی، زریں ہار، زرنگار تاج، قیمتی ملبوسات، طلائی زیورات جو راجہ شان دکھانے کے لیے پہننے کے عادی تھے ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ ایک طرف یہ قیمتی چیزیں دوسری طرف مقتول تاجدار شہر یار!

قاسم کو بختیار نے ان راجگانِ ہند کی سرکوبی پر چھوڑا، خود اپنے فداکاروں کے ساتھ پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ قلعۂ سرستی کے قریب با حالِ تباہ پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کو جا لیا۔ بختیار نے اس کا راستہ روک لیا۔

''سلطان شہاب الدین کے نام پر میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔''

جھلا کر پرتھوی راج نے بختیار پر نیزے سے وار کیا۔ بختیار نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بختیار کی کوشش تھی کہ رائے پتھورا کو قتل نہ کرے زندہ گرفتار کر لے اسی لیے کئی چرکے کھانے کے بعد بھی وہ اس کی جان بچاتا رہا، لیکن تابکے آخر ایک مرتبہ تلوار کا ایک ایسا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ پرتھوی راج کی گردن کٹ کر دُور جا گری۔[1] کھانڈے[2] راؤ کو موقع مل گیا وہ جان بچا کر بھاگ گیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تاریخ

[2] مورج بجن رائے نے کھانڈے راؤ کے متعلق لکھا ہے:

کھانڈے راؤ برادر رائے پتھورا کہ سپہ سالار بود ہزیمت راغنیمت دانستہ بعد سعی و تلاش جانِ خورد از آں مہلکہ سلامت برد۔

چناں بیم ناک و ہراساں گریخت
کہ زنار را از گرانی گسیخت!

بادل چھنٹ گئے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہرو مہ تماشائی

(1)

غوری آستانہ خواجہ پر

پرتھوی راج اور راجگان ہند کو شکستِ فاش دے کر سلطان شہاب الدین غوری کی فوج ظفر موج اجمیر روانہ ہوئی۔

اجمیر کے باشندوں نے سلطان شایانِ شان استقبال کیا۔ اور بختیار کے لیے تو دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے۔ یہ لوگ بختیار کی شجاعت، دلیری، شرافت اور عالی حوصلگی کے قائل تھے۔ آج وہ ایک فاتح کی حیثیت سے اجمیر میں داخل ہوا تھا۔ لیکن اس کے سبھاؤ، طور طریق اور برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آج بھی وہ ان میں آزادانہ گھومتا تھا۔ اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔ ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا، سلطان نے شہر میں داخل ہوتے ہی حکم صادر کر دیا تھا کہ اہل شہر ہرگز ہرگز افرادِ فوج کی دراز دستیوں کا شکار نہ ہونے پائیں۔ اور بختیار قاسم کی معیت میں اس ارشادِ ہمایونی کی تعمیل بڑی سختی سے کر رہا تھا۔ اس چیز نے اس کی وقعت اور ہر دل عزیزی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

سلطان جب اس شہر میں داخل ہوا تھا تو باشندگانِ شہر سہمے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے جب فاتح فوجیں کسی شہر میں داخل ہوتی ہیں تو وہاں کے شریفوں کو ذلیل کرتی ہیں۔ عورتوں کی آبرو سلامت نہیں رہتی۔ مالداروں سے دولت چھین لی جاتی ہے اور وہ کنگلے بنا دیے جاتے ہیں۔ عبادت گاہیں مسمار کر دی جاتی ہیں۔ لوگوں کی شخصی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔

لیکن پہلے حیرت سے پھر مسرت سے انہوں نے دیکھا کہ مہنت اور پجاری ویسے ہی

آزاد ہیں۔ ہندوؤں میں اسی طرح بت پوجے جاتے ہیں۔ دولت مندوں کی دولت پر کسی نے نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ دوکانداروں سے، سبزی فروشوں سے، اناج کا بیوپار کرنے والوں سے جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، ان کے پورے پورے دام ادا کئے جاتے ہیں۔ کسی کی شخصی آزادی سلب نہیں کی گئی۔ کسی کی املاک و جائداد اور جاگیر پر قبضہ نہیں کیا گیا۔ پشکر کا مقدس تیرتھ ویسے ہی قائم ہے، انا ساگر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لوگ آزادانہ طور پر کاروبار میں مصروف ہیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور وہ آپس میں سوال کرنے لگے۔

یہ سلطان آدمی ہے یا فرشتہ! یہ سلوک تو مہاراج پرتھوی راج کا بھی اپنی رعایا کے ساتھ نہیں تھا۔ ساری کدورت آن کی آن میں دور ہو گئی اور اس کی جگہ عقیدت اور عظمت نے لی۔

شہر کا نظم و انتظام درست کرنے کے بعد سلطان حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے آستانے پر سر کے بل حاضر حاضر ہوا۔ حضرت نے شفقت کے ساتھ اس کی پذیرائی کی۔ سلطان نے دست بستہ عرض کیا:

''غلام اس کفرستان میں اسلام کا پرچم بلند کرنے آیا ہے؟''

حضرت نے مسکرا کر فرمایا:

''تم خود نہیں آئے ہو، ہم نے تمہیں بلایا ہے۔''

سلطان نے سر عقیدت خم کر دیا، حضرت نے سلطان سے فرمایا۔

نیک نیتی اپنا پھل ضرور دیتی ہے۔ تم نے یہ جنگ خدا کے لیے کی تھی۔ خدا کی نصرت نے تمہیں کامیاب بنا دیا۔ اور ایک مسلمان کی طرح تمہیں عالی ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے۔ اہالیانِ شہر بے گناہ ہیں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

سلطان نے ادب سے سر جھکا کر عرض کیا:

''یا حضرت ایسا ہی ہوگا۔''

حضرت کے انداز سے سلطان نے اندازہ لگایا کہ وہ چاہتے ہیں ہندوستان کے سب سے بڑے شاہی خاندان کو شکست دینے کے بعد اس سے مزید انتقام نہ لیا جائے۔ اس پر احسان کیا جائے تا کہ اسلام کی رواداری کا لوگوں پر اچھا اثر پڑے اور لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ سلطان نے حضرت کے سامنے عہد کیا کہ ایسا ہی کرے گا۔

حضرت نے ایک نظر کیمیا اثر بختیار پر ڈالی اور مسکرانے لگے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: انتم الاعنون ان کنتم مومنین اگر تم مسلمان ہو تو سر بلندی تمہارا ہی حصہ ہے۔ بختیار کو وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو حضرت نے دوسری مرتبہ اس کے اجمیر روانہ ہوتے وقت فرمائی تھیں۔

(2)

بختیار اور نرملا

رات کا وقت ہے، بختیار قاسم کے ساتھ ابھی ابھی سلطان کی بارگاہ سے واپس آیا تھا۔ ہتھیار اٹھا رہا تھا کہ خیمہ کے دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ قاسم چونک کر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا، بختیار نے آواز دی۔

''کون...... اندر آجاؤ۔''

سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دو عورتیں داخل ہوئیں۔ بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا راجکماری نرملا اور آشا دیوی نے میری عزت افزائی کی ہے۔ وہ دونوں نے اپنے منہ سے چادر ہٹائی، واقعی یہ نرملا اور آشا تھیں۔ بختیار نے ان دونوں کو اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور کہا۔

''آپ کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی، یاد کیا ہوتا میں سر کے بل حاضر ہوتا۔''

پھر بختیار کی نظر نرملا کے چہرے پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس مختصر سی مدت میں اس کا حال کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ نہ چہرے پر وہ آب و تاب تھی، نہ رعنائی اور شادابی، وہ غم کی مورت نظر آ رہی تھی۔ بختیار نے پریشان ہوتے ہوئے کہا:

''راجکماری آپ کو کس حال میں دیکھ رہا ہوں آپ کا مزاج تو ناساز نہیں؟'

نرملا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جس کا گھر اجڑ گیا ہو، جس کا خاندان تباہ ہو گیا ہو، جس کا بادشاہ قتل ہو گیا ہو، جو حکومت اور شان و شوکت سے محروم ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ہی بہہ سکتے ہیں وہ مسکرا نہیں سکتا، ہنس نہیں سکتا، خوش نہیں ہو سکتا، میں اپنی جان دے کر بھی آپ کی جان بچانا چاہتی تھی۔ لیکن مہاراج قتل ہو جائیں یہ میں کس طرح چاہ سکتی تھی۔ آپ کو بلند اور سرفراز دیکھنا میرے دل کی پہلی اور آخری آرزو تھی۔ لیکن مہاراج کا خاندان مٹ جائے یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جو آپ کی جان کے دشمن تھے میں ان کے خون کی پیاسی تھی، اپنی حدود سے تجاوز کر کے بھی میں نے

اندر کمار اور شاہو جی کو آپ کے ہاتھ سے قتل کرا دیا اور مجھے اس پر خوشی ہے لیکن مہاراج ادھیراج پرتھوی راج کے اہل خانہ بھیک مانگنے لگیں یا غلام بنائے جائیں یہ دیکھنے کے لیے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں آپ کے لیے اپنے نام نہاد منگیتر زبیر سے جب وہ آپ کا گھوڑا پکڑ لایا تھا لڑی۔ اس جنگ میں وہ کام آ گیا ہے مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں اس سے نفرت کرتی تھی۔ اور نفرت اس لیے کرتی تھی کہ وہ میرے اس تعلق خاطر کی راہ میں حائل تھا جو مجھے آپ سے تھا۔ لیکن وہ زندگی میرے لیے باعث ننگ ہے جو اپنی حکومت، اپنی قوم اور اپنے ملک کی تباہی دیکھ کر بھی قائم ہے۔ آپ کے مجھ پر احسانات ہیں وہ زندگی بھر میرے دل سے چمٹے رہیں گے۔ اس وقت تو صرف آخری بار آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی، بس اب میں جاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے چادر اوڑھی اور چلی گئی، بختیار اس کا راستہ روک سکا، نہ آشا، دونوں گم صم بیٹھے رہ گئے، بختیار نے کہا۔

آشا دیوی آپ راجکماری کو سمجھایئے، مجھے ذلیل نہ سمجھیں، مجھے خطاوار نہ قرار دیں۔ میں کتنی مرتبہ صلح کا سفیر بن کر راجہ کے پاس آیا، اُنہوں نے میری ایک نہ سنی۔ اپنے غلط کار مشیروں کے کہنے پر چلتے رہے۔ میں نے صرف یہ چاہا تھا کہ انہیں گرفتار کرلوں۔ یقیناً سلطان ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے، لیکن وہ مجھ سے لڑنے لگے۔ میں خود زخم کھاتا رہا اور انہیں بچاتا رہا۔ لیکن تلوار تلوار ہی ہوتی ہے۔ پھول کی چھڑی نہیں ہوتی۔ آخر وہ اپنا کام کرگئی، رہا مہاراج کے خاندان کا بے نام ونشان ہونا، تو راجکماری کو کیا معلوم صرف ان کی خاطر سے محض ان کی دل جوئی کے لیے میں کیا کر چکا ہوں۔ میں اگر خود کہوں گا آپ اسے سخن سازی سمجھیں گی۔ اس شخص سے جو میرے پاس بیٹھا ہے آپ کے سامنے کوئی بات نہیں کی۔ نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ آ رہی ہیں۔ جو پہلے سے سکھا پڑھا دیتا۔ اس سے پوچھ لیجئے۔ بتاؤ قاسم میں نے کیا کیا ہے؟''

قاسم جواَب تک آشا کو بے خودی کے عالم میں دیکھ رہا تھا، یکا یک سنبھلا۔ اس نے کہا۔

''بختیار نے یہاں آنے سے پہلے سلطان کی خدمت میں راجکماری کی دلیری، ہمت، بہادری، شرافت، عالی ظرفی کے اتنے گن گائے کہ مجھے یقین ہو گیا دال میں کچھ کالا ہے۔''

آشا مسکرانے لگی، قاسم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''بختیار نے سلطان کو یاد دلایا کہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے رائے پتھورا کے خاندان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کی تلقین کی ہے۔ اور راجکماری نرملا کے احسانات کا بھی یہی تقاضا ہے۔

لہٰذا پرتھوی راج کے بیٹے کو اجمیر کا راجہ تسلیم کرلیا جائے اور اس سے اقرار اطاعت لے کر ہم واپس چلے جائیں۔ سلطان بختیار کی کوئی بات رد نہیں کرتے، انہوں نے یہ تجویز مان لی، کل آپ یہ اعلان سن لیں گی کہ کویا جی اجمیر کے بادشاہ ہوں گے۔ پھر اس خاندان کی تباہی و بربادی کا کیا سوال؟''

یہ باتیں سن کر آشا کے چہرے پر رونق آ گئی، بختیار نے پوچھا۔

''کہیے اب بھی یقین آیا کہ نہیں؟''

وہ مسکراتی ہوئی بولی:

''آ گیا۔''

بختیار نے کہا: ''کیا آپ سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ راجکماری کا دل م[illegible] سے صاف کرادیں۔ آشا دیوی میں بہت مظلوم ہوں۔ میرا دل بہت زخمی ہے، میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ وہ راجکماری کی نوازشیں اور عنایتیں تھیں جنہوں نے مجھے ان کا بندۂ بے دام بنادیا۔ ان کا کردار اور سبھاؤ دیکھ کر میں ان سے نامعلوم طور پر یہ [illegible] ہوئے بھی کہ ہم دونوں کے درمیان نہ پٹ سکنے والی خلیج حائل ہے محبت کرنے لگا۔ پھر کسی جواب کی توقع کیے بغیر، کسی امید اور آرزو کے بغیر آشا دیوی راجکماری کی ذات اتنی اونچی ہے کہ ان سے زمین کے ذرے اور آسمان کے تارے بھی محبت کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تو بہرحال ایک معمولی آدمی ہوں۔ اگر آپ ان کا دل میری طرف سے صاف کردیں تو زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔''

بختیار کا ایک ایک لفظ آشا پر نشاط و سرور کی عجیب کیفیت طاری کر رہا تھا۔ اس نے بختیار کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''بڑے بھولے معلوم ہوتے ہیں آپ، اتنی ساری کہانی سنا گئے، لیکن یہ نہ سوچ سکے کہ نرملا بھی آپ سے محبت کرتی ہے۔''

بختیار کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

''مجھے بیوقوف نہ بنایئے، انہونی بات میں کسی طرح نہیں سوچ سکتا۔''

آشا نے مسکراتے ہوئے کہا:

''میری سرکار، جب آپ نے نرملا کو شیر کے پنجے سے چھڑایا تھا اسی دن وہ ہزار جان سے آپ پر فریفتہ ہوگئی۔ جب آپ نے اسے ڈاکوؤں سے بچایا تھا۔ اُس روز اس کی محبت عشق میں تبدیل ہوگئی۔ جب آپ اجمیر کے قریب پہنچ کر اپنے کارنامے ہمارے بزدل سپاہیوں کے

سرتھوپ کر رخصت ہو گئے تھے اسی دن یہ عشق دیوانگی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جب تراوری کے جنگل میں آپ اس کے تیر سے زخمی ہوئے تھے۔ اس نے آپ کی مرہم پٹی کی تھی۔ اپنا اسپ سبک خرام آپ کو عطا کیا تھا۔ اور آپؐ نے اپنے آپ کو راجکماری کا شکار ظاہر کیا تھا۔ تو یہ سرپھری راجکماری اسی دن سے اپنے من مندر میں آپ کی مورت بنا کر اس کی پوجا کرنے لگی تھی۔ آپ کے سامنے وہ حرفِ محبت کبھی اپنی زبان پر نہیں لائی، لیکن میں تو اس کی بہن ہوں، سکھی ہوں، مجھے کیا نہیں معلوم!

ہم سے وہ کیا چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں!

قاسم نے بختیار کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''آج تو بڑے عجیب انکشافات ہو رہے ہیں۔''

بختیار نے جواب دیا:

''تم یقیناً جل رہے ہو گے کہ تمہیں اس طرح کا فخر نہیں حاصل ہوا؟''

بے ساختہ قاسم کے منہ سے نکلا۔

''قسمت اگر یاور ہو تو کیا ہو نہیں سکتا؟''

نہ جانے کیوں آشا کچھ جھینپ سی گئی۔ وہ اُٹھتی بولی۔

''اب میں جاتی ہوں اپنی روٹھی رانی کے پاس۔''

بختیار نے کہا۔

''ضرور جائیے کہ کم از کم راجکماری ایک دفعہ میرے منہ پر یہ کہہ دیں کہ۔''

''جا ہم نے تجھے آزاد کیا۔'' قاسم نے بات پوری کر دی۔

بختیار ہنسنے لگا۔

آشا مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

(3)

قاسم بھی....!

آشا کے جانے کے بعد بختیار نے قاسم سے سوال کیا۔ جناب قاسم صاحب آپ اپنے ہوش میں بھی ہیں۔ آشا کے سامنے یہ آپ نے کیا بکواس فرمائی تھی!

قاسم نے بے پروائی سے جواب دیا:

''بکواس کیسی، کیا تم ہی کو محبت کرنا آتی ہے، دوسرے بدھو ہیں۔''

بختیار ہنسنے لگا! ''تو گویا جناب بھی عشق فرما رہے ہیں آشا سے۔''

قاسم نے بے ساختہ جواب دیا: '' کچھ آج سے؟ تراوری کے میدان میں جب پہلی مرتبہ جھلک دیکھی تھی اسی دن سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آگ سلگتے سلگتے چنگاری بن جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چنگاری بھڑکتے بھڑکتے آگ کا شعلہ بن جاتی ہے۔

بختیار نے عارفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کی چنگاری ایک شعلہ بن چکی ہے۔''

قاسم نے کہا: ''اور کیا نہیں بھی!''

بختیار نے پوچھا: ''تو یہ بیل منڈھے کس طرح چڑھے گی''

قاسم نے ترکیب بتائی۔

''جس طرح اپنی بیل منڈھے چڑھاؤ گے، اسی طرح ہماری بھی چڑھا دینا۔''

بختیار بے اختیار ہنس پڑا، واہ بھئی اچھی زبردستی ہے۔ اگر نہ مانے تو کیا ہو گا؟''

قاسم کے پاس جواب تیار تھا: ''تو پھر تم بھی انکار کر دینا۔''

بختیار نے حیرت سے قاسم کو دیکھا اور پوچھا۔

''میں بھی انکار کر دوں، کس چیز سے، کس بات سے۔''

قاسم نے اسی استغنا سے کہا: ''اپنی بیل منڈھے چڑھانے سے!''

بختیار نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا:

''بھئی بڑے دلچسپ آدمی ہو، اچھی ترکیب بتائی۔''

''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!''

قاسم نے بڑے یقین کے لہجے میں کہا: ''یہ نہ ہو تو پھر دوستی کا ہے کی!''

''تو گویا دوست کا یہ فرض بھی ہوتا ہے کہ وہ دوستوں کی شادیاں کراتا پھرے، دوستی کی یہ قسم تو آج ہی معلوم ہوئی؟''

''چند دن اور ساتھ رہو مرشد کے پاس بہت کچھ معلوم ہو جائے گا، عزیزِ من!''

''لیکن تمہارے انتخابِ لاجواب کی داد دیتا ہوں۔

''شکریہ اس قدر افزائی کا، لیکن ضرورت قول کی نہیں عمل کی ہے۔ یہ سوچ لیجئے اچھی طرح کہ میری کامیابی پر تمہاری کامیابی موقوف ہے۔''

''ایسے زبردست دوست نہ دیکھنے میں آئے نہ سننے میں کہ خود تو زبان سے کچھ نہ کہیں مگر عشق شروع کر دیں اور دوستوں سے فرمائش شروع کر دیں کہ وہ ان کے عشق کو کامیاب بنائیں۔ دوستی کی یہ شرط پہلے سے معلوم ہوتی تو بندہ معافی مانگ لیتا دعویٰ دوستی سے!''

''بہر حال اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا، سوا صبر جمیل کے کیا چارہ ہے؟''

''اچھا بھئی تمہاری خاطر یہ پاپڑ بھی بیلیں گے۔ تم سے بس کس کا چل سکتا ہے وہی ہوگا جو چاہو گے۔''

(4)

آمنے سامنے

سلطان کے اس اعلان کا سارے شہر میں چرچا ہے کہ پرتھوی راج کا بیٹا کو یا جی اجمیر کی حکومت کا مالک ہوگا۔[1]

''ہر شخص سلطان کی عالی حوصلگی، رواداری اور شرافت کے گن گا رہا ہے۔ جدھر جایئے یہی چرچا، جہاں پہنچے یہی ذکر!''

رات کا وقت ہے، بختیار اپنے خیمہ میں بیٹھا ہے کہ دستک کی آواز آئی۔ دروازے پر پہنچا تو سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دو عورتیں کھڑی تھیں۔ یہ راجکماری نرملا اور آشا تھیں۔

بختیار تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ دونوں کو اندر لایا۔ اس وقت اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نرملا کو دیکھ کر عجیب از خود رفتگی کا عالم طاری ہوگیا تھا اس پر، بڑی مشکل سے اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پایا پھر آشا سے پوچھا۔

''کیا آپ نے میری سفارش کر دی راجکماری سے؟ میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے بیتاب ہوں۔''

آشا بولی: ''میں نے سفارش تو کی تھی لیکن قبول نہیں کی گئی۔ راجکماری کا خیال ہے کہ میں افسانہ خواں اور پرلے درجے کی جھوٹی ہوں۔''

بختیار نے نرملا سے کہا:

''راجکماری آپ کا خیال آشا دیوی کے بارے میں یقیناً صحیح ہوگا، لیکن میرے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی میں تصدیق کرتا ہوں۔ اس کا ایک ایک حرف سچ ہے۔''

نرملا کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا، آشا نے کہا۔

''یہ بھی اچھی طرح، مطلب کی بات سچی باقی سب جھوٹ نہیں راجکماری میں نے اس بارے میں جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ ہے؟''

1۔ تمام متداول تاریخیں اس پر متفق ہیں۔

راجکماری بولی:

''جانتی ہوں اس وقت تو میں اس اعلان کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں جو کویا جی کی بحالی سلطنت کے لیے کیا گیا ہے۔''

بختیار نے بے تابانہ جوش کے ساتھ کہا:

''شکریہ کے مستحق سلطان ہیں، میں تو صرف ان کا مشیر اور خادم ہوں۔ لیکن راجکماری میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ایک التجا کرنا چاہتا ہوں!''

نرملا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے بختیار کی طرف دیکھنے لگی۔

بختیار نے کہا: ''آشا دیوی نے آپ کے بارے میں مجھ سے جو کچھ کہا ہے کیا وہ بھی غلط ہے! وہ بھی افسانہ خوانی ہے! راجکماری آپ کے جواب پر میری قسمت کا فیصلہ ہے۔ میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ آپ راجکماری ہیں اور میں ایک معمولی آدمی، مجھے خود بھی آشا دیوی کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ باتیں میرے وہم و تصور سے بالا تھیں۔ آپ یہی سمجھ لیجئے، وہ غلط تھیں۔''

بختیار پر امید اور حسرت بھری نظروں سے راجکماری کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرانے لگی، پھر کچھ شرماتے ہوئے اس نے کہا:

''زندگی میں آشا نے اگر کبھی سچ بولا ہے تو آپ سے۔''

یہ کہہ کر راجکماری بختیار سے آنکھیں نہ ملا سکی، بختیار خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے کہا:

''راجکماری!'' اور پھر وفورِ جذبات سے کچھ نہ کہہ سکا۔

''آشا نے کہا! کیا مزے کا تماشا ہے۔ میں پرلے درجے کی جھوٹی۔ دونوں (بختیار اور نرملا) یہ بات مانتے ہیں، لیکن میں نے آپ سے نرملا کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بھی صحیح ہے نرملا دیوی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ میں نے آپ کے بارے میں نرملا دیوی سے جو کچھ کہا وہ بھی سچ ہے۔ آپ اس کی تصدیق فرماتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ میں نے کس کے بارے میں کیا کہا ہے۔

نرملا مسکرانے لگی۔

بختیار ہنس پڑا، پھر اُس نے نرملا سے پوچھا۔

''کیا اب مجھے حق ہے کہ سلطان کو بھی اپنا راز دار بنا لوں!''

آشا نے کہا۔

''آپ کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ جس سے جو چاہیں کہیں، میں بھانڈا پھوڑ کر رہوں گی۔''

بختیار نے کہا: ''بھانڈا تو میں پھوڑنے والا ہوں...... راجکماری آپ کی یہ آشا دیوی میرے دوست اور ساتھی قاسم کو بڑی ہوشیاری سے اپنا شکار بنا چکی ہیں۔ کیا قاسم بھی میری طرح سلطان سے عرض حال کر سکتا ہے؟''

نرملا نے کہا:

''کیوں نہیں، شوق سے؟''

آشا کا چہرہ مسرت سے گلنار ہو گیا۔ لیکن بناوٹی غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی:

''کتنے اندھیر کی بات ہے میرے سامنے میرے ہی متعلق فیصلے ہو رہے ہیں اور مجھ سے کوئی جھوٹوں بھی نہیں پوچھتا۔ نہ سلطان کے سامنے کچا چٹھا بیان کر دوں تو آشا میرا نام نہیں؟''

(5)

ہم آ گئے ہم پا گئے ہم لے گئے اُن کو

رخصت ہوتے وقت دونوں کے دل خوشی اور مسرت سے معمور تھے...... دونوں کو وہ چیز مل گئی تھی جس کے وہ جویا تھے۔ اور جہاں تک راجکمار کا تعلق تھا وہ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنے دنوں سے ایک مورت کو پوجا کر رہی تھی، لیکن زبان خاموش تھی۔ جسے چاہتی تھی اس سے اظہار محبت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو اپنانے کا اور اس کی بن جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب وہ ناممکن ممکن ہو گیا تھا۔ اب وہ بختیار کی تھی اور بختیار اُس کا!

آشا بھی کچھ کم خوش نہ تھی، اپنے ہونے والے شوہر میں جو خصوصیات وہ چاہتی تھی وہ سب قاسم میں موجود تھی۔ خوبصورت بانکا، جیالا، بہادر، سخن طراز، محفل آرا، زندہ دل، شگفتہ مزاج، اس غیر متوقع کامرانی نے اُسے بھی پیکر نشاط بنا دیا تھا۔

بختیار کا وعدہ پورا ہوا۔ کویا جی کی گدی نشینی کی رسم، تین چار روز بعد دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ انجام پائی۔ سلطان نے اس سے اقرار اطاعت لیا۔ اور اس نے صدق دل سے پیمان وفا استوار کیا۔ اور زندگی بھر، ہر طرح کی ترغیب و تحریص کے باوجود اپنے عہد وفا پر قائم رہا۔[1]

جس روز کویا جی کی گدی نشینی کی تقریب عمل میں آئی اسی دن ایک اور جشنِ مسرت سلطان نے ترتیب دیا۔ نرملا کی شادی بختیار سے اور آشا کی شادی قاسم سے کر دی۔ اس نے نرملا اور آشا کو شاہی خیمہ سے اس طرح دولہا کے ہاں رخصت کیا جیسے کوئی اپنی لڑکی کو نکاح کے بعد رخصت کرتا ہے۔ نرملا کی خدمات اور آشا کی وفاداریوں کی داستان سن کر وہ اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے دونوں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو ایک باپ اپنی عزیز اور چہیتی لڑکی سے روا کر سکتا ہے۔

کویا جی کی تخت نشینی اور شادی کے مراسم انجام دینے کے بعد بھی تقریباً، ایک مہینے تک سلطان اجمیر میں مقیم رہا۔ جب تک مقیم رہا ہر روز حضرت خواجہ کے آستانے پر حاضری دیتا رہا، یہی کیفیت بختیار اور قاسم کی تھی۔

---

[1] تمام تاریخیں اس پر متفق ہیں کہ دوسرے راجگانِ ہند کے اکسانے کے باوجود کویا جی کی سلطان سے وفاداری میں فرق نہیں آیا۔

ایک روز قاسم اور بختیار، نرملا اور آشا، آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ آشا نے نرملا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بختیار سے کہا۔

''آپ اس کے ہاتھ میں انگشتری دیکھ رہے ہیں۔''

بختیار نے جواب دیا:

''ہاں دیکھ رہا ہوں......کوئی خاص تاریخ اس سے وابستہ ہے۔''

آشا بولی! ''جی ہاں......اب تک یہ انگشتری ان کے لیے مشکل کشا ثابت ہو رہی ہے لیکن اب اس کا ان کے پاس رہنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اتار لیجئے۔''

نرملا نے چڑ کر کہا: ''دیکھو آشا تمہاری شامت آجائے گی۔''

قاسم دل چسپی لیتا ہوا بولا:

''بھئی اب تو ہم یہ کہانی سن کر رہیں گے۔ بتاؤ آشا کیا بات ہے؟''

آشا کہنے لگی: ''صاحب! یہ انگوٹھی بڑی کیمیا اثر ہے۔ اس میں جو ہیرا جڑا ہوا ہے وہ نرملا کو بہت عزیز ہے۔ یہ تو (بختیار کی طرف اشارہ کر کے) ان کے فراق میں جان دے رہی تھیں۔ محل میں جب کبھی ان کی شادی کی بات چیت ہوتی، یا کسی کا پیام قبول کرنے پر مہاراجا آمادہ ہوتے، یہ فوراً ہیرے کی کنی کھا کر جان دینے پر تیار ہو جاتیں کتنی ضدی ہے یہ لڑکی بھی۔ ایک مرتبہ جو طے کر لیا ہر طرح کے ناموافق حالات کے باوجود اس پر اڑی رہی۔''

بختیار نے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا:

''کیوں نرملا؟''

وہ شرماتی ہوئی بولی: ''کہہ تو چکی ہوں یہ پرلے درجے کی جھوٹی ہے۔''

بختیار ہنسنے لگا، آشا چڑ کر بولی۔

''ہاں اسی جھوٹی نے بگڑی بنائی، یہ بھی تو کہو۔ ورنہ آج تم کہاں ہوتیں۔''

بڑی دیر تک اسی طرح کی چہلیں ہوتی رہیں۔

پھر ایک روز سلطان اور سلطان کے ساتھ بختیار اور نرملا، قاسم اور آشا نے بھی غزنی کی راہ لی۔

بختیار نے پھر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ حضرت خواجہؒ کی توجہ نے اسے وقت کا فرماں روائے اعظم بنا دیا۔ یہی بختیار تھا جو بہار، بنگال، آسام اور تبت کا فاتح بنا۔ جس کے کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں!